زبانِ خلق

مولانا عبدالماجد دریابادی

نگار ہندوستان پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ یہ فروری نمبر آپ کا بھیجا ہوا ہے۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ نگار پاکستان کا مثنیٰ ہوگا۔ مگر یہ تو بالکل

لیکن تو چیزے دیگری

نکلا۔ اس سے قبل کا کوئی نمبر میری نظر سے نہیں گزرا اس میں ذکر جابجا غالبیہ کا ہے۔ مجھے تو غالبیہ بدخواہی نظر آیا۔ کیا غالبیہ اس کے سوا کچھ اور ہے۔

غالب میرے محبوب شاعروں میں ہے بلکہ غزلگوئی کی حد تک کہنا چاہیے کہ محبوب ترین۔ لبشری کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں ان کمزوریوں کو زیادہ اچھالنے اور انھیں مزے لے لے بیان کرنے کی ذہنیت میری سمجھ سے باہر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین (جامعہ ملیہ دہلی)

میں نے نگار کو بڑی دل چسپی سے پڑھا اس کے مضامین عام طور پر اور آپ کی تحریر خاص طور پر جو غالبیہ کے نام سے مسلسل شایع ہو رہی ہے بہت پسند آئی۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نوخیز نگار بوڑھے نگار سے زیادہ معقول اور مقبول ثابت ہو۔

پروفیسر سید احتشام حسین (الہ آباد یونیورسٹی)

نگار (جنوری) نظر نواز ہوا۔ آپ نے جس حد تک اس کی روایتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نئے دور میں نگار اس سے زیادہ علمی اور ادبی خدمات انجام دیگا جو پہلے دے چکا ہے کیوں کہ اس وقت علم و ادب دونوں نئی منزلوں اور نئے افق کی جستجو میں ہیں۔

اس نمبر میں یوں تو سبھی مضامین قابل مطالعہ ہیں لیکن غالبیہ کے سلسلے میں آپ نے دو جز شامل کیے ہیں وہ خاصہ کی چیز ہیں۔ میں بھی اس کی جو خدمت کر سکوں گا کر دوں گا۔

مالک رام (برسلز، بیلجیم)

نگار کا جنوری کا شمارہ ملا تھا شکر ہے ماشاء اللہ خوب نکلا ہے خدا کرے یہ خوب سے خوب تر ہوتا جائے۔

آپ نے غالبیہ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے بہت خوب ہے اگرچہ بہتر ہوتا اگر آپ اسے مکمل غالب نمبر میں ایک ہی مرتبہ شایع کر دیتے۔ اس سے ایک تو کتاب ایک اشاعت میں پوری ہو جاتی دوسرے لوگوں کو انتظار کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑتی۔

عبدالمجید حیرت (پرانا سکھر)

غالب پر نقادان وقت لٹتے دیکھے ہیں کہ خدا کی پناہ مگر اب تو کرم فرمائیں ایک ہی مضمون سنتے سنتے کان پک گئے عزیزو۔

پروفیسر حمید احمد خاں (لاہور)

میں نے نگار کے غالب نواز اوراق کو دل چسپی سے پڑھا اور آپ کے حسن ترتیب اند ذوق سلیم کی داد دی۔ ہندوستان میں تحقیق غالب کے لیے ابھی بے حساب مواد موجود ہے امید ہے آپ کی توجہ سے بتدریج اس سرمایہ کا انکشاف ہوتا رہے گا۔

اعجاز عسکری (علی گڑھ)

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سرورق کی پشت پر تعریفی رائیں چھاپنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ ایڈیٹر اپنی شان میں تو تعریفی خط چھاپتے ہی رہتے ہیں اور اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بہرحال افسوس ہوتا ہے جب کوئی تم سا شخص اس قسم کے TEMPTATIONS کا شکار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی (گورکھپور یونیورسٹی صدر شعبۂ اردو)

نگار ملا۔ اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

آپ نے یقیناً معیار بلند کیا ہے .... میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا ....

آئندہ شمارے میں اقبال سے متعلق اہم مضامین شائع ہو رہے ہیں

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

ضروری اعلان

پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ
اس پتہ پر بھیجدیں رسالہ جاری کردیا جائیگا
نمائندہ نگار ۶۱۷ ایبی سمن آباد لاہور

جلد ۴۲ | فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ ۳

زبان خلق		۱	مصطفی زیدی	ڈاکٹر محمد باقر	۱۴
ملاحظات		۲	باغ و بہار کا ماخذ۔ نوطرز مرصع	سید ابوالخیر کشفی	۲۳
کچھ پیروڈی کے بارے میں	(مختلف حضرات)	۴	واجد علی شاہ کے زمانہ قیام کلکتہ کے بعض اہم واقعات	امیر حسن نورانی	۲۸
دیوان افسر	قاضی عبدالودود	۱۱	غالبیہ ـــــ دوسرا باب	اکبر علی خاں	۳۵

ملاحظات

ہندوستان میں اردو کے مستقبل کی طرف سے ہر اُردو دوست پریشان اور متفکر نظر آتا ہے۔ مایوسی اور دلگرفتگی کی یہ فضا سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر رہی ہے اور سب کے سب اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں۔ اس انداز فکر سے ہم اپنے راستے خود ہی مسدود کرتے چلے جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ سہل پسندی کے ساتھ طبیعت بہانہ جو بھی ہوتی جا رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نالہ و فریاد کے سوا اب کوئی نسخہ استعمال کرنے کے لیے باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اردو کی موجودہ کس مپرسی بیان کرتے وقت عموماً الزام تراشی سے کام لیا جاتا ہے اور یہ الزام ایک ہی فتنہ پرور کے سر جاتا ہے جسے حکومت کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

ہم سب کی سمجھ میں اردو کی ترویج و ترقی کا اور کوئی ذریعہ نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس کو سرکاری مدارس میں منظور کرایا جائے اس بات سے شاید ہی کوئی ذی حواس انکار کرے کہ مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام ہماری بہت سی مشکلوں کو آسان کر دے گا۔ مگر اس سے زیادہ جو جذبہ اس مطالبے کی پشت پناہی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں خود کچھ کرنا نہیں پڑے گا سوائے چند نعروں اور وقتی ہنگاموں کے۔

اردو ہندوستان میں اپنے نام نہاد دعوے داروں کے ہاتھوں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی اب اُن لوگوں کے ذریعے ممکن ہے جو اس کی مقبولیت سے واقف ہیں اور جنھیں یہ احساس ہے کہ نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں اردو کا کیا رول ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے فراموش کر دینے سے ملک کے کتنے بڑے حصے سے بے تعلقی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

اردو کے چاہنے والے خالص تجارتی ذہن کے لوگوں میں بھی ملیں گے۔ چنانچہ پاکٹ بکس کی روز افزوں کثیر اشاعت اس کا ایک زندہ ثبوت ہے کہ یہ زبان ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ اردو میں نشر و اشاعت کا کام اب وہ ادارے اپنا رہے ہیں جنھوں نے کبھی اردو کو اپنی مادری زبان نہیں بتایا۔ لیکن وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ زبان آزاد ہندوستان کی زبانوں میں بلند ترین مقام رکھتی ہے اور اس کے حلقۂ اثر کو اپنانے کے معنی اپنی تجارت کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ ہندی کے مشہور ماہنامے سریتا نے بڑی آب و تاب کے ساتھ اپنا اردو ایڈیشن نکالا جو یقیناً اردو صحافت کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے اور ان کا یہ تجربہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا ہے۔

حال ہی میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے انگریزی ہفت روزہ اخبار بلٹز نے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بہت جلد اپنا اردو ایڈیشن شایع کرنے والے ہیں۔ ادارۂ نگار اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے اس لیے نہیں کہ ہمیں اُن کی پالیسی اور طریق کار سے اتفاق ہے بلکہ اس لیے کہ جہاں اس ایڈیشن سے بلٹز اپنے سیاسی مقاصد کی ترویج و اشاعت کا کام لے گا وہیں اردو کو بھی مدتوں بعد ایک ایسا ہفت روزہ ملے گا جو بہر حال ہندوستان کی موجودہ صحافت کا نمایندہ ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ تجربہ سریتا سے بھی زیادہ کامیاب رہے گا۔

عراق میں ایک بار پھر انقلاب آگیا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عراقیوں کو قتل و غارت کا ڈرامہ کھیلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ موجودہ انقلاب کے رہنما عبدالسلام عارف نے سزائے موت دینے سے پہلے عبدالکریم قاسم سے جو سوالات کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ پچھلا انقلاب لانے کا ذمہ دار کون تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک انقلاب اتنی اہم بات نہیں تھی جتنی یہ بات کہ انقلاب لانے والا کون ہے۔ اس ایک جملے نے خود پسندی کے کتنے تہ در تہ جذبات کو عریاں کر دیا۔ بات کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ قاسم نے جو رحم دلانہ سلوک عارف کے ساتھ کیا تھا وہ سیاسی انقلاب کی دنیا میں دانشمندانہ نہیں تھا اور اسی کا خمیازہ انھیں اپنی زندگی سے بھگتنا پڑا ـــ ہماری تمنا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے پڑوسی ہندوستان کی امن پسند طبیعت سے کچھ سیکھیں اور اپنے مزاج میں استقلال و ثبات پیدا کر سکیں کیوں کہ

بر سنگ گرداں نروید نبات

کچھ پیروڈی کے بارے میں

رشید احمد صدیقی

فن کی حیثیت سے پیروڈی مغرب کی دین ہے۔ لیکن شغل کے اعتبار سے ہمارے شعر و ادب میں اجنبی نہیں ہے اردو میں اس کی ابتدائی مثال غالباً شاہنامے کی جہاں تہاں سے پیروڈی میں ملتی ہے۔ جو رکیک و سخیف زیادہ ہے۔ پیروڈی کم ہے، عربی، فارسی، کلاسیکی اور مذہبی کتابوں کے تحت اللفظ اردو ترجمے کی بھی پیروڈی کی گئی ہے۔ جس کے نمونے ملا رموزی کی "گلابی اردو" میں ملتے ہیں۔ غالب۔ حالی۔ انیس اور اقبال کے کلام پر بھی یہ عمل کیا گیا ہے۔ کسی شاعر یا مصنف کی پیروڈی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے کلام کا غیر معمولی طور پر چرچا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کلام یا اس کا مصنف کس پائے کا ہے۔

کچھ دنوں ترقی پسند شاعری بالخصوص بے قافیہ نظموں کی کثرت سے پیروڈی کی گئی ہے۔ یہ دراصل کسی مشہور مصنف یا شاعر کے سنجیدہ اور معروف کلام یا نظم و نثر کو مضحک رنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ مضحک مبتذل نہ ہونے پائے بالفاظ دیگر پیروڈی ادبی رنگ کی حامل ہو۔ متانت آبی یا حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو مزاح تفنن سے معتدل کرنے اور رکھنے کا کام پیروڈی سے لیا جاتا ہے۔ علی گڑھ میں بور اور بوریت کچھ دنوں سے بڑی مقبول اصطلاحیں ہیں جن کو خود بور بڑی معصومیت سے کام میں لاتے ہیں پیروڈی ان معصوموں کے حضور میں ان کے ستم زدوں کی طرف سے نذر عقیدت ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ بور کو بور ہی کے حربے سے کیفر کردار کو پہنچانے کی مستحسن کوشش پیروڈی ہے۔

پیروڈی میں جدت اور جودت کا ہونا ضروری ہے اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اسمیں ظرافت کا پیوند لگانا کہ تھوڑی دیر کے لیے نقاب یا پیوند کی تفریحی حیثیت اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے پیروڈی کا ہنر ہے۔ پیروڈی ظریفانہ پیوندکاری یا مزاحیہ تصرف ہی کو تو کہتے ہیں۔ اعلیٰ پایے کی پیروڈی اتنی ہی قابل قدر ہوتی ہے جتنی کہ وہ عبارت یا شعر جس کی پیروڈی کی گئی ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیروڈی کا فن کس ذہانت اور ذکاوت کا طلب گار ہوتا ہے۔

پیروڈی نگاروں میں میرے نزدیک اکبر کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ایک زمانے میں سید محمد داؤد عباسی (علیگ) کی پیروڈی نگاری کی علیگڑھ میں بڑی شہرت تھی۔ جو خوشی محمد خاں ناظر اور علامہ شبلی کے کلام پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ موجودہ دور میں سید محمد جعفری (پاکستان) کو بڑی شہرت ہے۔

آپ نے سرکس میں مسخرے[1] کو دیکھا ہوگا جو اپنے ساتھی بازیگر نمبرا کی نقل کرتا ہے۔ وہ اپنے طور پر وہی سب کو دکھاتا ہے جو بازیگر دکھاتا ہے دونوں کے دکھانے میں صرف ٹیکنیک کا فرق ہے۔ ایک کے کرتب پر آپ محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ دوسرے کی نقل پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ مسخرا فن کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بازیگر کا ہمسر ہوتا ہے بلکہ بازیگر پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ کرتب جو بازیگر جان کو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرا محض چند قلابازیوں میں دکھا دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم بازیگر کے کرتب کا تحسین شوق سے مشاہدہ کرتے ہیں

---

[1] رشید صاحب نے جسے مسخرا کہا ہے اس کو رام پور کی زبان میں بیلا (Beela) بروزن ٹیلہ کہتے ہیں۔ یہ خاص رامپوری زبان کا لفظ ہے اور کہیں دوسری جگہ سننے میں نہیں آتا جوکر کے مفہوم کو اپنے تمام لوازمات اور فنکارانہ نزاکتوں کے ساتھ ادا کرنے والا کوئی اور لفظ نہیں ہے جوکر کو ہم مسخرہ نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ جوکر میں فن کاری کا جتنا شدید احساس ہوتا ہے وہ مسخرے میں نہیں ہوتا جوکر اپنے مزاحیہ افعال کو ہنر بنا کر اور ہنر سمجھ کر پیش کرتا ہے جبکہ مسخرے کو بعض اوقات احساس کبھی نہیں ہوتا۔ اس لیے میری رائے میں سرکس والے مسخرے کو خصوصاً بیلا کہنا چاہیے کیونکہ یہ پوری طرح جوکر کا چربہ ہے (نگار)

اس سے کسی طرح کم شوق سے مسخرے کی قلابازیوں کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ یہاں غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس کرتب کو بازی گر اپنی جان خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے اسی کو مسخرہ اپنی آبرو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرے کی آبرو کسی غیر مسخرے کی آبرو سے کم نہیں ہوتی۔

قلابازی تو ہم آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ لیکن تماشائیوں کے ڈر سے شاید ایسا نہ کریں۔ دراصل قلابازی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا۔ سب کچھ مسخرے (فنکار) میں ہوتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ مسخرا بننے سے پہلے قلابازی لگانے میں احتیاط برتیں اور مسخرا بننے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیں۔

پیروڈی اور کارٹون میں مماثلت ہے۔ کارٹون بھی کسی شخص یا شے یا واقعے کی سب سے نمایاں شناخت یا پہلو کو مضحکہ خیز حد تک نمایاں کر دیتا ہے۔ چسٹرٹن کے نزدیک طنز یا تضحیک کا تصور یہ ہے کہ سور کا نقشہ اس طرح کھینچا جائے کہ وہ سور سے بھی زیادہ سور نظر آنے لگے۔ یہ تعریف کارٹون پر بھی چسپاں ہوتی ہے اس طور پر پیروڈی کارٹون طنز و ظرافت بقول غالب ؎

"وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے"!

نثر کی پیروڈی نظم کی پیروڈی سے مشکل ہے۔ اس سے غالباً سب کو اتفاق ہو گا اس لیے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

آل احمد سرور

پیروڈی ظرافت کی ایک خاص صنف ہے۔ پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس کی پیروڈی کی جائے اس میں کچھ فکری یا فنی محور موجود ہوں۔ رشید صاحب کی اصطلاح میں انھیں کو بڑ کہہ لیجیے۔ مثلاً ایک صاف ستھرے صحیح اور ہموار شعر کی پیروڈی نہیں کی جا سکتی۔ جب تاؤ نہ ہو گا تو اسے تیز کیسے کیا جائے گا۔ اگر شاعر کے یہاں کچھ مضامین اصطلاحات تشبیہات تراکیب اور علامات کی تکرار ہے اور یہ سب چیزیں ہی اس کی امتیازی صفت ہیں تو ان کی پیروڈی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر نثر نگار کے یہاں کچھ مخصوص خیالات کا اعادہ ہوتا ہے چند خاص خاص فقرے یا ترکیبیں بار بار ملتی ہیں واقعہ کچھ ہو تاثرات ایک ہی سے رکھتا ہے تو وہ پیروڈی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ پیروڈی انفرادیت کو آسیب بنا کر پیش کرتی ہے۔ اس ستم ظریفی میں محض یہ دیوتا کے مٹی کے پاؤں دیکھنے کا جذبہ ہی نہیں ذہنی صحت کے معیار قائم کرنے کا بھی احساس شامل ہے۔ ہر نشیب و فراز کو ہموار کرنے کا عزم ہی نئے نشیب و فراز کی داغ بیل ڈالنے کا بھی۔ یہ وہ آئینہ ہے جو محبوب کی جھریاں ہی دکھاتا ہے مگر جھریوں کے باوجود ادائے محبوبی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جس طرح ظرافت میں طنز کو گوارا اور اسلوب کو ادبی ہونا چاہیے اسی طرح پیروڈی میں بدنیتی کی گنجائش نہیں۔ اگر کسی کے نقطۂ نظر یا اسلوب بیان کی اس طرح پیروڈی کی گئی کہ پیروڈی کرنے والے کا ذاتی عناد نمایاں ہو گیا تو پیروڈی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ پیروڈی تو صرف آئینہ دکھاتی ہے قدروں کا پرچار نہیں کرتی۔ یہ چراغ رہ گزر ہے۔ پولس کی سرچ لائٹ نہیں۔

پیروڈی ایک شعوری کوشش ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر شعوری طور پر کوئی تصویر کارٹون اور کوئی تخلیق ایک ایسی بھدّی نقل بن جائے جس پر پیروڈی کا گمان ہو۔ اردو میں پیروڈی کی شعوری کوشش سب سے پہلے پطرس نے کی اور مولوی اسمٰعیل کی ریڈروں کے مانے ہوئے حسن کو اپنے آئینے سے اور محبوب بنا دیا۔ ان کے مضمون کتے میں بھی مشاعروں کی ایک پیروڈی ملتی ہے۔ مگر مضمون نگار نے وہاں پیروڈی ضمناً کی ہے۔ اپنے بنیادی مقصد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جہاں کسی رومان یا نصاب، عورت یا انقلاب کی لے بہت تیز ہو گئی ہے۔ پیروڈی کے ذریعے سے صحت و اعتدال کی علمبرداری کی گئی ہے۔ جہاں فنکار نے پن کے نشے میں اپنے نغمے کی باگ کل آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ پیروڈی کرنے والوں کو اس کی بے لگامی واضح کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پیروڈی جہاد نہیں ہے ایک سنجیدہ تفریح ہے اور اس کا تہذیبی مقام مسلّم ہے۔

سیّد احتشام حسین

انسان آلام حیات اور جاں لیوا سنجیدہ مصروفیات سے لڑنے کے لیے تفریح کے سیکڑوں ذرائع اور خوش باشی کے لاتعداد پہلو پیدا کر لیتا ہے

وہ ہنسنے کی بات پر تو خیر ہنستا ہی ہے (بشرطیکہ بعض لوگوں کی طرح ہنسنے سے اس کی صحت نہ خراب ہوتی ہو) سنجیدہ باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر ان میں مضحک پہلو نکال لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پیروڈی بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہے۔ میں خود کو اس بات کے ماننے پر آمادہ نہیں کر سکا ہوں کہ پیروڈی کو ادبی محفلوں میں بھی جگہ دی جائے۔ ـــــ ہو سکتا ہے کہ کوئی پیروڈی نگار میری اس بدذوقی پر مجھ سے بھی سمجھ لے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے وقتی تفریح تک محدود رکھنا چاہیے اور ایک ادبی صنف قرار دے کر اعلیٰ ظرافت اور مفکرانہ طنز کا مدمقابل نہیں بنانا چاہیے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

اردو ادب میں پیروڈی کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ لیکن یا تو ہم لوگ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہیں اور یا انگریزی کے اس غیر مانوس سے لفظ کو کوئی نئی تحریک سمجھتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں پیروڈی کی وہ آؤبھگت نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔

پیروڈی بڑی پرانی چیز ہے۔ زمانہ قبل از مسیح میں بھی لوگ پیروڈی کیا کرتے تھے۔ یونان میں کسی ٹھوس نظم یا سنجیدہ ڈرامے کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا جاتا تو اس عمل کو پیروڈیا دیا پیروڈو) کہتے تھے۔ ارسطو نے لکھا ہے کہ جب ایتھنز کی فوجیں سسلی میں تباہ ہو گئیں تو ایک یونانی نے اس جنگ پر اتنی اچھی پیروڈیا دیا پیروڈو) لکھی کہ اسے پڑھ کر ایتھنز والے اپنی شکست کو بھول گئے۔

اس زمانے سے اب تک دنیا کی ہر زبان میں ہر موضوع پر پیروڈیاں لکھی گئیں Donquxote شایع ہوئی تو ساری دنیا یورپ کے بانکے سپاہیوں اور شولری پر ہنسی اور یہ کردار دنیا کے ادب میں ہمیشہ کے لیے شامل ہو گیا۔ جان فلپس نے ملٹن کی فردوس گمشدہ کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا تو لوگوں نے اسے ملٹن ثانی کا خطاب دیا جو آج تک اس کے کتبے پر لکھا ہوا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ پیروڈی نہ تو محض طنز ہوتی ہے اور نہ نری تضحیک، یہ ایسی خوشگوار سی تنقید ہوتی ہے جو بُری معلوم نہیں ہوتی۔ (خصوصاً اُسے جس پر پیروڈی کی گئی ہو) پچھلی صدی میں لندن کے تھیٹروں میں نامور شعراء کے کلام پر پیروڈی کی جاتی تھی۔ کئی مرتبہ متعلقہ شعراء بطور تماشائی وہیں تھے لیکن انھوں نے برا نہیں مانا۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ سنجیدہ اور سبق آموز چیزیں پڑھتے وقت قاری چوکنا سا رہتا ہے اور بار بار سوچتا ہے کہ یہ باتیں تو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اسے شک رہتا ہے کہ مصنف کہیں پروپیگنڈہ تو نہیں کر رہا ہے لیکن ـــــ

ایک کامیاب پیروڈی پڑھتے وقت اسے شبہ تک نہیں ہوتا کہ مصنف کسی اور کی آڑ لے کر طرز معاشرت، رسوم، اخلاقی قدروں اور دیگر اہم مسائل پر تنقید کر رہا ہے۔ چند چست سے فقرے عبارت کے کچھ دلچسپ حصے اس کے ذہن میں رہ جاتے ہیں اور ساتھ ہی چند کار آمد نصیحتیں بھی یاد رہ جاتی ہیں۔ صحیح پیروڈی ادب کی نہایت دلکش صنف ہے جہاں تک لفظ پیروڈی کا تعلق ہے۔ سو جیسے تھیٹر کو تیاتر اور کلاسیکل کو کلاسیکی بنا کر اپنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر پیروڈی کو پیرادی یا پیرڑی بنا دیا جائے تو شاید ہم اس سے فوراً مانوس ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

پیروڈی سنجیدہ فن پاروں میں مضحک پہلوؤں کی تلاش ہے۔ یہ غلط پندار، گمراہ خودی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت میں تناسب اور توازن پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے بہتیرے گروہوں قوموں یا ادبی نسلوں کی مسیحائی طنز و مزاح کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اور پیروڈی بھی اسی کی ایک شکل ہے۔ علی گڑھ نے اس میدان کے بڑے صاحب طرز شہسوار پیدا کیے ہیں۔ اور آج جب خود ستائی اپنی بات پر اڑنا اور دوسروں کی بات نہ سننا ہماری قومی کمزوری بنتا جا رہا ہے۔ طنز و مزاح کی شدید ضرورت ہے جو ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھا سکے۔

خوش مزاقی کا یہ معیار نہیں ہے کہ دوسروں پر ہنسا جائے۔ صحیح معیار یہ ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی اس آئینے میں دیکھا جائے اور ماتھے پہ شکن نہ آنے پائے۔

شوکت تھانوی

ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں وہ حالات ہی دراصل ان حالات کی پیروڈی ہیں جن سے کبھی ہم گذر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی جتنی بسر کرنا تھی وہ تو بسر کر چکے اب زندگی کی پیروڈی کر رہے ہیں۔ ان حالات میں جب انسان خود اپنا کارٹون بن گیا ہو اور جب اس کا اسلوب زندگی بجائے خود پیروڈی ہو اس کے پیچھے اسلوب زندگی اس سے کسی پیروڈی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ پیروڈی کرنا وہ فن ہے جس کا فنکار اگر جیل اور موت دونوں سے بچ گیا۔ تو خود اپنے ہی فن کا شاہکار بن کر رہ جاتا ہے اور اس کی کسی کاوش پر نہیں بلکہ خود اسی پر دنیا ہنسنے لگتی ہے۔

کنھیا لال کپور

میری دانست میں اردو ادب میں پیروڈی کی بہتات ہے قریب قریب ہر غزل، ہر مضمون، اچھی غزل، نظم، مضمون پر لکھی ہوئی پیروڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ پیروڈی مزاحیہ تنقید کی سب سے مشکل صنعت ہے۔ اچھی پیروڈی لکھنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے، نثر میں ڈاکٹر شفیق الرحمن شوکت تھانوی، کرشن چندر، منٹو اور فرقت نے چند اچھی پیروڈیاں لکھی ہیں نظم میں جعفری، مجید لاہوری نے پیروڈی کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب ہمارے ادبا پیروڈی کی اہمیت محسوس کریں گے اور سلیقے سے پیروڈی لکھا کریں گے۔

فکر تونسوی

میری تھیوری یہ ہے کہ اچھا طنز نگار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی شکل وصورت (بہ صورت پیروڈی) ۵ فیصدی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز ہو۔ جیسے برناڈ شا، چارلی چیپلن، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی اور .... اور بالکل یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات سوسائٹی کی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز چیزوں پر کراری طنز کر لیتے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خدا نے کسی طنز نگار کو یوسف ثانی نہیں بنایا ورنہ یہ سوائے اپنی زلیخا کے اور کسی کام کے نہ رہتے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟[1]

ڈاکٹر قمر رئیس

ظرافت اور طنز کی ہیئت، ان کے محرکات اور تخلیقی عمل میں اتنے اوصاف مشترک ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حد فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک چیز ہے جو دونوں کے مابین ہمیشہ وجہ امتیاز رہتی ہے۔ اور وہ ان کا مقصد۔ ایک کا مقصد تضحیک ہے اور دوسرے کا تنقید۔ ظرافت ہمیں ہنسی یا لطف اندوزی کی ایک عارضی کیفیت دے کر اپنی تخلیق کا مقصد کھو بیٹھتی ہے۔ طنز اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں میں اتار کر ہمیں زندگی کے کچھ حقائق کا ادراک بخشتا ہے پیروڈی کا سلسلۂ نسب طنز سے ملتا ہے۔ دونوں میں اگر کوئی بنیادی فرق ہے تو یہ کہ طنز اپنا موضوع اور مواد براہ راست (اور بالعموم) زندگی سے لیتا ہے۔ پیروڈی ادب اور فنون لطیفہ سے۔ ایک اہم وصف جو ظرافت، طنز اور پیروڈی تینوں میں بروئے کار رہتا ہے۔ مزاح کا مقصد۔ یعنی ایک ایسا فنی اظہار جو قاری کے دل میں ہنسی کی کیفیت پیدا کر دے۔ میں یہاں مزاح کی فلسفیانہ تاویلوں میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ارسطو نے اسے جس طرح دریافت کیا ہے وہ اپنی تصوریت کے باوجود آج بھی ناقابل تردید ہے۔ اس کا یہ قول کہ "وہی چیز ہنسی کی محرک ہو سکتی ہے۔ جو بدہیئتی کا ایک ایسا جزو ہو جس کی کجی یا ناہمواری کسی طرح کی اذیت یا جراحت کا شائبہ نہ رکھتی ہو" دراصل مزاح کی دو بنیادی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔

---

[1] شاید اس موقع پر ڈاکٹر شفیق الرحمن فکر تونسوی کی نظر میں نہیں رہے۔

۱۔ مزاح کا محرک کوئی ایسا بے تکا پن ہوتا ہے جس سے ہماری متانت اور جمالیات کو صدمہ پہنچتا ہے۔

۲۔ لیکن وہ بے تکا پن جس سے مزاح کی تخلیق اور ہنسی کی انبساطی کیفیت حرکت اور عمل میں آتی ہے ایسا ہرگز نہ ہو جو کسی انسان یا جاندار کے لیے جسمانی یا قلبی اذیت کا باعث ہو رہا ہے۔

اس طرح ارسطو نے مزاح کو بظاہر اپنے اخلاقی آدرش کا لیکن فی الاصل ایک وسیع ترمعنی میں اس کو انسان دوستی یا انسانی ہمدردی کے تابع کردیا۔ پیروڈی کا فن بھی اپنی مزاحیہ کیفیت میں اسی انسانی ہمدردی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور چونکہ طنز کی طرح اس کا مقصد بھی تنقید ہے اس لیے انسانی ہمدردی کا یہ عنصر اس کے تنقیدی عمل میں پوری آب و تاب لیکن ضبط و توازن کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ موضوع کے اعتبار سے پیروڈی کا میدان طنز سے محدود اور مختصر ہے صحیح نہ ہوگا۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے مزاح جو دونوں میں بنیادی اور مشترک حیثیت رکھتا ہے، ہماری متانت کے احساس اور جمالیات کے تصور کی شکست و برہمی سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ شعر و ادب جمالیاتی قدروں کا بہترین مظہر ہیں اس لیے اس محدود دائرے میں بھی قدم قدم پر سیکڑوں موضوعات پیروڈی لکھنے والے کی نگاہ کرم کے منتظر رہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کا تنقیدی عمل طنز کی بہ نسبت کچھ پیچیدہ اور دشوار ہوتا ہے۔

طنز نگار زندگی کے نو بہ نو مظاہر میں سے کچھ ایسی بے تکی صورتیں اخذ کرکے جو اس کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں، اپنے مزاحیہ اسلوب میں ڈھالتا ہے اور اس طرح ان میں استرے کی سی تیزی پیدا کردیتا ہے۔ پیروڈی کا موضوع شعر و ادب کا کوئی خاص اسلوب خاص میلان (فکری یا فنی) یا کوئی اہم ادبی شہپارہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تنقید کا ہدف اس خاص اسلوب، میلان یا تخلیق کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے پیروڈی لکھنے والے کو طنز نگار کی ژرف نگاہی اور دیدہ وری کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا گہرا شعور اور فنی اسالیب کی واضح بصیرت بھی درکار ہوتی ہے وہ پیروڈی کی فنی تکمیل میں جن دشواریوں سے گزرتا ہے اور جس طرح کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے اس کا اجمالی تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے:

۱۔ سب سے پہلے ان نمایاں کمزوریوں کی دریافت —— یا ان کمزوریوں کا واضح ادراک جو نمایاں نہیں ہیں۔ لیکن جن کو وہ نمایاں کرکے پیش کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ اپنے تخیل کو اس خاص اسلوب کے دائرہ میں اسیر کرکے اس طرح مہمیز کرنا کہ اس کی تمام کمزوریاں اک مضحک ہیئت میں سامنے آجائیں۔

۳۔ اور اس طرز عمل میں اس کا زاویہ نظر ہمدردانہ ہو۔ وہ تنقید کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہو۔ بالفاظ دیگر اس کا مقصد اس مروجہ اسلوب کی اصلاح ہو اور اس کے نقائص کو ادب کے قارئین سے روشناس کرانا تاکہ وہ اسلوب اسی مرتبہ کا مستحق سمجھا جائے جس کا وہ اہل ہے۔

اس تجزیے سے پیروڈی کے کئی اوصاف واضح ہوجاتے ہیں۔ اول یہ کہ پیروڈی لکھنے والا کسی خاص اسلوب یا فن پارہ کی خارجی ہیئت (Form) کی تقلید کرتے ہوئے اس کے مواد کو حسب ضرورت ایسی مبالغہ آرائی اور ایسے ظریفانہ پینترے سے پیش کرے کہ اس کا اصل جوہر مسخ ہوکر بھی پہچانا جاسکے۔ ایک مغربی ناقد نے بہت پتے کی بات کہی ہے اس کا قول ہے: "بہترین پیروڈی وہی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بہترین پیروڈی شاذ و نادر ہی لکھی جاتی ہے، جو ہیئت کے ساتھ وفاداری لیکن مواد کے ساتھ عیاری کا مسلک اختیار کرتی ہے۔" مواد کے ساتھ یہی عیاری پیروڈی لکھنے والے کے تخیل کے ساتھ ساتھ اس کے فکر و شعور کو بھی کچھ آزادی دیتی ہے۔ اور اس بہانے اگر وہ چاہے تو اپنے عہد کی بدلتی ہوئی قدروں اور معاشرتی حالات کو بھی تنقید و طنز کا موضوع بنا سکتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے اس خاص اسلوب یا فن پارہ کی ہیئت (Form) اور اس کے موڈ کے ساتھ پوری پوری وفاداری برتنا ہوگی، جسے اس نے سامنے رکھا ہے اس لیے کامیاب پیروڈی کا معیار قرار دیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری خود پتہ لگائے کہ اس کے آئینہ میں کس اسلوب یا کس فنکار کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ دوسرا فنی پہلو یہ ہے کہ پیروڈی کا تنقیدی عمل ہر اعتبار سے ایک تخلیقی عمل ہوتا ہے ایک ناقد نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے وہ لکھتا ہے:

"پیروڈی لکھنے والے کی تنقید کو تخلیق کا ہم مرتبہ ہونا چاہیئے اس کا تخلیقی عمل ایک طرح کی تخیلی بازآفرینی ہو۔"

گویا پیروڈی بھی دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح فن، فکر اور جذبہ کی متوازن ہم آہنگی کا لطیفہ پیکر ہو۔

یہاں مناسب ہوگا کہ پیروڈی کی فنی ساخت پر غور کرتے ہوئے محل ورود پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ لفظ پیروڈی دراصل ایک یونانی لفظ "پیرودیا" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں **Counter Song** یا نغمۂ معکوس۔ پیرودیا قدیم یونان میں ایک ایسا گیت ہوتا تھا جو کسی گائے ہوئے سنجیدہ نغمے کی مقدس فضا اور اس کے سحر و اثر کے طلسم کو توڑنے کے لیے گایا جاتا ہے۔ گویا یہ اس نغمہ کی اہمیت اور متانت کا خاکہ اڑاتا ہے۔ اس کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن قیاس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا مقصد ان ہنگامی جذبات کی شوریدگی اور جوش میں ایک توازن پیدا کرنا تھا جو کسی نغمے کی الاپوں سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں یا یہ کہیے کہ اس جذباتی شدت اور ہیجان میں ضبط و نظم پیدا کرنے کے لیے گایا جاتا تھا۔ اس کی یہ اصلاحی روح آج بھی برقرار ہے۔ اگرچہ موسیقی سے رزمیہ، پھر ڈرامہ اور پھر ادب کی دوسری اصناف تک آتے آتے اس کی نوعیت میں تغیر ہو گیا ہے۔ کیسیلس کی ادبی قاموس میں پیروڈی کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

"پیروڈی انتہا پسندی اور جارحانہ روش کے خلاف ایک طرح کا اقدام تحفظ ہے اور سب سے بڑا تحفظ، یہ ہماری حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کے سنگین جرم کے خلاف ہے۔"

شاید اس مطمع نظر کو سامنے رکھ کر بائرن اور سوئنبرن جیسے ممتاز اور صاحب طرز شاعروں نے خود اپنے فن کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ جو اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئیں۔

یونان میں فنی حیثیت سے اس صنف کا موجد ارسطو نے **Hegemon of Thasos** کو مانا ہے اگرچہ (**Marton**) بھی اس کی اولیت کا دعویدار کہا جاتا ہے جس نے ہزاروں اشعار میں ہومر کی رزمیہ شاعری کی پیروڈی لکھی تھی۔ اس کے بعد (**Hipponax** نے الیڈ کو ایک کامیاب پیروڈی کے آئینے میں پیش کیا۔ اس ابتدائی دور کی پیروڈی میں طرزِ نگارش کے ساتھ ساتھ تصانیف کی فکری نوعیت اور ان کے داخلی موڈ کو بھی تنقید و تضحیک کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اردو میں اس صنف کا تعارف براہِ راست انگریزی کے اثر سے ہوا اور اگرچہ انگریزی میں اس کی روایت اور اس کے فن کا نشو و نما وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا۔ لیکن وہاں بعض ذہین شاعروں اور ادیبوں نے اپنے بلند تر مقاصد کے حصول کے لیے ایسی اصناف کو بھی رواج دیا ہے جو اگرچہ پیروڈی کے معیار پر پوری نہیں اترتیں لیکن کچھ اوصاف میں اس صنف سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر **Mock Epic** یا ظریفانہ رزمیہ۔ اس میں شاعر کلاسیکی رزمیہ شاعری کی فنی نزاکتوں اس کی مخصوص بحر پر شکوہ اندازِ بیان معنوی صناعی اور اشخاص کے کارناموں کا مبالغہ آمیز بیان تمام اوصاف کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن اس کا مواد وہ روزمرہ کی عام زندگی سے لیتا ہے۔ اس طرح عام انسانوں اور ادنیٰ واقعات کو رزمیہ انداز کے اہتمام شان و شکوہ اور عظمت کے آئینے میں دکھا کر وہ قدم قدم پر ایک پر مزاح تضاد اور ظریفانہ صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اس نوع کے ظریفانہ رزمیوں کے نقوش ہمیں پوپ کی "زلفوں کی عصمت دری" سے لے کر ایلیٹ کی "ویرانہ" تک میں ملتے ہیں۔ (یہ تسلیم کہ "ویرانہ" مزاح سے عاری ہے) دراصل ان نظموں کا مقصد رزمیہ کی تنقید نہیں بلکہ طنز کے پیرائے میں اپنے عہد کی زندگی کی تنقید ہے۔ اس لیے ان کا فن پیروڈی کے فن سے مشابہت کے باوجود بہت مختلف ہے۔

انگریزی ادب میں **Issac Howkins Brown** کو پیروڈی کا موجد کہا جاتا ہے جس نے پوپ اور تھامسن وغیرہ کے طرزِ نگارش کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ انیسویں صدی میں اس صنف کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور سے نظم کی پیروڈی کو اس عہد کا شاید ہی کوئی صاحب طرز شاعر ہو جس کے اسلوب کا خاکہ نہ اڑایا گیا ہو یا جس نے اپنے ہم عصر شعراء کے بارے میں پیروڈی کے انداز کی نظمیں لکھی ہوں۔ شیلی نے ورڈس ورتھ کی مشہور نظم **Petes Bell** کی پیروڈی لکھ کر فطرت کے اس پجاری کے فن اور دلکشی کو ہلا کر رکھ دیا۔ سوئنبرن نے ٹینی سن کی شاہکار نظم **In Memorium** کی جو پیروڈی لکھی تھی اسے اپنے زمانے میں ٹینی سن کی نظم سے کم شہرت حاصل نہ تھی۔ اگر آپ کے ذہن میں ٹینی سن کے طرز خاص اور اس؟

نظم کا دھندلا سا خاکہ بھی ہے تو آپ سوئنبرن کی پیروڈی کے ان مصرعوں سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

God whom we see not. is.
And God who is not we see.
Fiddle, we know is diddle,
And diddle we take it, is dee

یہاں پیروڈی لکھنے والے نے الفاظ اور خیالات میں ایک خاص لوچ اور نکھار پیدا کر کے بائرن کی معنوی نزاکت اور بلندی کو جس طرح پستی دکھائی ہے اور ایک متوازن تخیلی مبالغہ آرائی سے جس طرح بائرن کے شاہکار کا خاکہ اڑایا ہے وہ اس فن کا کمال ہے۔

انگریزی کے نثری ادب میں بھی پیروڈی کے بہت کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ اس صدی میں جیمس جوائس نے اگر مبتذل انداز کے اخباری قصوں کو (جو اس زمانے میں بہت مقبول تھے) پیروڈی کا موضوع بنایا تو اسٹیفن لیکاک نے جاسوسی قصوں کی ہیجان خیزی تجسس آفرینی اور مجرمانہ خوف و ہراس کی فضا کو اپنی پیروڈیوں کا ہدف بنایا۔ جیمس جوائس نے انگریزی نثر کے نمائندہ اسالیب کو بھی بڑی کامیابی سے پیروڈی کے قالب میں پیش کیا ہے اور اگر قریب سے دیکھا جائے تو ایک بڑے کینوس پر اس کا عظیم ناول "یولیسس" بھی پیروڈی ہی ہے جس میں ایک طرف اس نے حقیقت نگاری کی روایت اور دوسری طرف رزمیہ قصوں کے کرداروں کی رفعت و عظمت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس ناول کے پیروڈی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اس کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے اسے اس صدی کا سب سے بڑا پیروڈی تو بیں مانا ہے۔

بہر حال یہاں میرا مقصد انگریزی یا اردو پیروڈی کی تاریخ کا جائزہ لینا نہیں بلکہ اس صنف کے چند فنی پہلوؤں اس کی وسعت اور امکانات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ انگریزی میں اس ادبی روایت کی تعمیر و ترقی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے مشاہیر اور چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس طرح ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری سے اس روایت کا نشو و نما ہوا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ معیاری پیروڈی کی تخلیق صرف اس فنکار کے بس کی بات ہے جو اپنی صلاحیتوں اور ذہن و فکر کے اعتبار سے اس ادیب سے کمتر نہ ہو جس کے فن یا اسلوب کو وہ پیروڈی کا موضوع بنا رہا ہو۔

اردو میں اس روایت کی پس ماندگی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہمارے مشاہیر نے اسے ہاتھ لگانا کسر شان سمجھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیبوں نے اگر کبھی تفنن کے طور پر طبع آزمائی کی ہے تو اس کا فنی معیار ان کی ذہنی سطح سے بلند نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب کا دامن اس روایت کے "گلہائے گراں مایہ" سے خالی نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اس کی کوئی روایت نہ رہی ہو۔ غالب کی طرز بیدل والی غزلوں کی عصری پیروڈیوں سے لیکر تہذیب الاخلاق کے اسالیب کی نقالی، اودھ پنچ کے عہد کی ناک بازی، داستانوں کے قالب میں نئی زندگی کی مسنوں طرازی ــــــ پھر سفرناموں اور ترقی پسند شعر و ادب کی پیروڈیوں تک اگر تلاش و تحقیق سے کام لیا جائے تو اس صنف کا قابل قدر خزانہ ہاتھ آ سکتا ہے۔ لیکن بقول غالب ؏

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے؟

(اسکالر)

ماہنامہ رکت دان دہلی
قومی رکت دان تحریک کا ترجمان

بیماروں کے لیے خون جمع کرنے کی تحریک ایک عالمی تحریک ہے۔ کچھ عرصے سے یہ ہندوستان میں بھی باقاعدہ اور منظم طور پر شروع کی گئی ہے تاکہ بروقت امداد کے ذریعے ان بیماروں کو بچایا جا سکے جنھیں فوری طور پر خون کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ اس رسالے کا مقصد اسی تحریک کی ترویج و ترقی اور صحیح معلومات فراہم کرنا ہے۔ بہترین آفسٹ کی طباعت کے ساتھ۔

قیمت ۵۰ نئے پیسے ــ مقام اشاعت: دفتر رکت دان ۱۶۳ "بی" بلاک سکریٹریٹ نئی دہلی

دیوان افسر

قاضی عبدالودود

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں ہے: "افسر، غلام اشرف ولد غلام رسول کہ در مرثیہ و سلام اشرف تخلص میکند و در شعر افسر قرار دادہ۔ قوم شیخ، بزرگانش چودھری گاؤخانۂ بادشاہی بودہ اند۔ مشارٌ الیہ۔۔ زیک دو سال فکر مرثیہ و سلام۔۔ کردہ و میکند۔ درایامیکہ مولف طرح مشاعرہ انگندہ، درآن روزہا بتر غیب فقیر مجموع پنج غزل طرحی مشاعرہ گفتہ از نظر فقیر گذرانیدہ۔ طبعش مناسبت تمام بدرستی کلام دارد۔" تذکرۂ مذکور کا زمانۂ آغاز او اخر ماہ دوازدہم ہے اور یہ ۱۲۰۹ھ میں انجام کو پہنچا، یہ فیصلہ کہ افسر کا ترجمہ کس سال حوالۂ قلم ہوا، مشکل ہے۔ افسر نے اپنے دیوان میں دو جگہ مصحفی کو یاد کیا ہے۔

جہاں میں مجمع بائیس جلدیں کر کے رحلت کی   اے افسر مصحفی شاعر بڑا استاد کامل تھا

روبرو کس کے غزل اپنی پڑھوں اے افسر   مصحفی سا کوئی محفل میں جو استاد نہ ہو

دیوان افسر میں مصحفی کی ایک غزل (مصرع ا "برق گلشن میں جو چمکی ترے رخساروں سے") کا مخمس ہے، اور ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ (مادہ "مصحفی نے سجا مقام بہشت" ۱۲۴۰)۔ افسر کا سال رحلت معلوم نہیں، لیکن روشن الدولہ کی وزارت کے زمانے میں ان کا زندہ ہونا ثابت ہے۔ کتب خانۂ خدا بخش کا نسخۂ دیوان فی الحال ۱۰۹ اوراق (سطر ۱۵ سطری، بعض صفحات سادہ) پر مشتمل ہے، ورق ا کے بعد کے بعض اوراق غائب ہیں۔ کاتب کا نام اور زمانۂ کتابت اس نسخہ میں درج نہیں، لیکن قرینہ ہے کہ افسر کے دوران حیات میں لکھا گیا تھا۔ دیوان کے کل مصرعوں کی مجموعی تعداد ۳۷۴۵ ہے (اس کا امکان ہے کہ اس میں دس پانچ کی غلطی ہو)، مثنوی ۶۴۶، قصیدہ ۶۷۸، غزل ۳۵۹۲، ترکیب بند ۱۸۲، مخمس ۳۲۵، قطعہ ۲۴، رباعی دوبیتی قطعات جو دیوان میں زیر عنوان رباعی درج ہیں ۲۶۔ مثنویاں ۸ ہیں، پہلی میں ایک غم انجام واقعہ نظم ہوا ہے، اس کی تاریخ تصنیف افسر نے "گشتۂ معشوق" (۱۲۴۱ھ) سے نکالی ہے جو بیت ۳۹ میں ہے۔ ورق اب میں جو اس کے ۶ ابیات ہیں ان میں سے ۳ اور مثنوی کی بیت آخر درج ذیل کی:

عطا کر لطف سے اپنے الٰہی   مجھے ملک سخن کی بادشاہی

سکندر کا علم میرا علم کر   قلمرو سب مرے زیر قلم کر

وہ دے علم و ہنر کا تاج مجھ کو   کہ کیکاؤس بھیجے باج مجھ کو

بفیض روح مولانائے جامی   لے اس مثنوی کو خوش کلامی

اس کے موجودہ ابیات کی تعداد ۴۰ ہے، اور اس کے ساتھ ایک رنگین تصویر بھی ہے، مثنوی دوم مناجات ہے (ابیات ۴۵)، بیت اول و آخر:

الٰہی ترا جز ہے ہر اک بسیط   تری ذات ہے کل شیٔ محیط

بس افسر سمند مناجات تھام   اجابت کا مالک ہے رب انام

اس مثنوی کا شعر ذیل ان کے شیعہ ہونے پر مشعر ہے:

بحق وہ و چار معصوم پاک   مرا جسم کر گوہر تابناک

مثنوی سوم (ابیات ۱۴۴) کا عنوان "ڈھیلہ و پتہ" (کذا) ہے، اس میں ڈھیلے اور پتے کا مکالمہ ہے، بیت اول و آخر:

نہ ہے صنعت خاک آباد خلق   کیا جس نے ڈھیلے پر ایجاد خلق

ولا ختم بس اب یہ تقریر کر   نہ اہل سماعت کو دلگیر کر

مثنوی چہارم (ابیات ۱۴۴) "عرضی در فرمایش شخصے سکندر نامی برائے شاہ زمن" (غازی الدین حیدر) بیت اول:

پیر و مرشد قبلۂ اہل جہاں — مہر اوج حشمت و گردوں مکاں

مثنوی پنجم (ابیات ۳۲) بھی اسی نوع کی ہے، کسی مجہول الاسم شخص کی فرمایش پر کہی گئی تھی بیت اول:

رائے صاحب فیض بخش انس و جاں — نسخۂ اکرام فیاض زماں

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں مثنویاں بطور مکتوب ہیں: ۶۔ بنام احمد علی خاں (ابیات ۱۴) انھیں افسر نے مصحفی کا دیوان دوم بھیجا تھا، اس کا ذکر ہے۔ ۷۔ نام مکتوب الیہ مرقوم نہیں (ابیات ۱۵) بیت اول و ابیات آخر:

اے نہال سبز باغ دوستی — تازہ ہے تم سے دماغ دوستی

خط کیا ہندی میں اس باعث رقم — ربط ہیگا فارسی سے تم کو کم

لیکن اے مشفق کرم فرما شتاب — وقت فرصت بھیجنا اس کا جواب

۸۔ یہ بھی مثل ۷ (ابیات ۱۹) ابیات اول و آخر:

گل خندان گلستان محبت (کذا) — نہال سبز بستان محبت

بس آگے کیا کریں احوال تحریر — نرے مضمون الفت کی ہے تقریر

قصیدے ۶ ہیں: ۱۔ مدح حضرت علی (۷۵ ابیات) بیت اول:

چرخ پیمبر میں سمجھو نہ چمکتے اختر — بہر سوز جگر خلق بھرے ہیں اخگر

۲۔ مدح روشن الدولہ (۶۴ ابیات) بیت اول:

اٹھا جو آج عذار سحر سے شب کا حجاب — سروش باد صبا نے کیا یہ مجھ سے خطاب

۳۔ مدح غازی الدین حیدر (ابیات ۹۸) بیت اول:

صبح پراں جو ہوا طائر خورزریں بال — ہاتف دل نے کہا مجھ سے کہ اے نیک خصال

۴۔ ممدوح کا نام درج نہیں (ابیات ۲۴) بیت اول:

ہوا جو خواب سے میں آج صبحدم بیدار — سروش غیب نے آکر دہیں کیا اظہار

۵۔ مدح روشن الدولہ (ابیات ۲۷) بیت اول:

صبحدم ذہن رسا بلبل باغ تقریر — پایۂ عرش کی لیتی ہے خبر جس کی صفیر

۶۔ تہنیت خلعت روشن الدولہ (ابیات ۲۹) بیت اول:

روشن الدولہ بہادر دیکھ تیری نالکی — اغنیا سوگند کھاتے ہیں ترے اقبال کی

غزل کے ابیات اول و آخر اور کچھ دوسرے اشعار جو مختلف نقطہ ہائے نظر سے منتخب ہوئے ہیں درج ذیل ہیں:

حسن جہاں ہے عکس تری آب و تاب کا — دریا سے اتصال نہیں کس حباب کا

دست سیاہ ناز سے افسر بتان ہند — تاراج اپنا کشور اسلام کر چلے

شب ساقی مہوش کے کس ناز کرشمہ سے — اک ہاتھ میں شیشہ تھا اک ہاتھ میں پیمانہ

کیا خار الم دل پر کھٹکا جو ہیں بلبل نے — آغاز کیا گل کی فرقت کا شب افسانہ

افسر جو گلستاں میں نرگس کا میں شیدا ہوں — بھاتا ہے مجھے دل سے کسی چشم کا شرمانا

خوباں فرنگ آتے ہیں خوش دل کو اے افسر — ہے جی میں ذرا کیجے لندن کا نظارا

پلٹن کی طرح آنسو ہر چشم سے رواں ہیں
گوروں نے ملک دل کا غارت کیا جزیرہ

دار فانی میں اگر شاہ زمن ہوں تو کیا
ایک دن چھوڑ کے میں رنگ محل جاؤں گا

خفتگان خواب مضطر ہی نظر آئے بخواب
مر مٹے پر بھی گیا ہرگز نہ دل کا اضطراب[1]

خالی نہیں فساد سے یہ ساتوں آسماں
اک اک کی ہے بغل میں بھری فطرتیں ہزار

شاید صبا تری بولائی چمن کے اندر
پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر

باتیں کرے ہے غیر سے ایہام میں تو کیا
آگاہ ہیں ہم بھی تری زرگری سے ہم

شام جدائی صبح کریں ہم آہ تڑپ کر اور کہیں
بزم طرب میں جلوہ کناں وہ شوخ ستمگر اور کہیں

طرفہ چلن اے ساقی مہوش تو نے ہم سے نکالا ہے
شیشہ ہمیں خالی دکھلانا بھر کر ساغر اور کہیں

وعدہ وصل تو کرتے ہو ہم سے جان ادا اور ہے کہیں
زلفیں یاں سلجھاتے ہو بیٹھے دل الجھا ہے اور کہیں

خاکساروں سے مہر کیونکر اس ہمہ انوار کو ربط
سخت مشکل ہے زمیں سے آسماں ملتا نہیں

رخصت چمن کی جب نہ ملے نو بہار میں
کیا دل لگے پھر اپنا بھلا اس دیار میں

فصل خزاں میں دیکھا نقشہ عجب چمن کا
نہ گل پہ بلبلوں کی شیریں مقالیاں ہیں

شور جنوں جہاں سے گم ہے برنگ عنقا
ویراں ہیں قید خانے زنجیر خالیاں ہیں

سوگند ہے صبا مجھے بلبل سے بات کی
کب میں نے اس چمن میں کسی گل سے بات کی

لکھنؤ سے اٹھ گیا وہ آصف دوراں کہ لوگ
نام پر آتے تھے جس کی ہفت کشور سے چلے

جن کی خدمت میں بسر کرتے تھے اوقات کبھی
ان سے ہوتی نہیں اب اپنی ملاقات کبھی

کہتے تھے ہم کہ دل نہ لگا ایسے شخص سے
رکھتا ہے کوئی چشم وفا ایسے شخص سے

داغ رہتا نہ دو کوئی دم کے مجھے چراغ سے
کلبۂ غم میں روشنی ہے مرے دل کے داغ سے

سبزۂ گلشن کیوں آنکھوں میں نشتر خار کی صورت ہے
ہجر میں کس گلرو کے اپنی بلبل زار کی صورت ہے

کوٹھیاں دل کی لٹتیں دیکھیے اب کس کس کی
آج نیلام میں اک ماہ فرنگ آتا ہے

لوٹ لیتا ہے ملک استنبول
پان جب وہ صنم چباتا ہے

تڑپ کر شام سے بیمار تیرا صبح کرتا ہے
نہ پوچھا تو نے کیا صدمہ ترے دل پر گزرتا ہے

ترکیب بند بعنوان "ہفت بند" مدح حضرت علی میں ہے، بیت اول جو افسر کے شیعۂ غالی ہونے پر دال ہے:

السلام اے از ازل ہمنام رب العالمیں
دے امام اول و ہمتائے ختم المرسلیں

مخمس ۸ ہیں، قوسین میں بندوں کی تعداد اور مخمس کا مصرع سوم درج ہے۔ ۱۔ غزل افسر (۹، "بلاغ آفاق میں کوئی ایسا سخی") ۲۔ ایضاً (۱۵، "کچھ ہمارے درد سے آگاہ بطلیموس ہے") ۳۔ غزل مصحفی اس کا ذکر ہو چکا ہے ۷ بند۔ ۴۔ غزل سودا (۸، "ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے") ۵۔ ایضاً (۶ "بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا" ۶۔ ایضاً ("بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور" ۵) ۷۔ غزل میر (۷، "تا بمقدور انتظار کیا") ۸۔ ("خانۂ حسرت دعم ہو وطن غیبت گو" ۸)

بدگماں اس لئے نہ آتا ہی کیے تو کرے
باپ سے بیٹے لڑیں بیٹی لڑے مادر سے

تفرقے اس نے کیے لاکھ زن و شوہر سے
رام نے جس گھڑی سیتا کو نکالا گھر سے

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

[1] دیوان میں مرقوم ہے کہ یہ مصرع سعادت علیخاں کا ہے۔

مصطفیٰ زیدی

(اُردو کا ایک بیباک، نڈر اور طنّاز شاعر)

ڈاکٹر محمد باقر

آپ بھی ناراض ہوں گے اور شاید مصطفیٰ زیدی بھی کیوں کہ ان سطور (جنھیں لکھتے لکھتے میں ایک مضمون بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں) میں آپ کو ایک بھی تو ملکی اور غیر ملکی بڑا نام نظر نہیں آئے گا جس کی شاعری کا مقابلہ میں نے زیدی کے اشعار سے کیا ہو۔ حالانکہ زیدی کو پڑھتے ہوئے میرے صفحہ ذہن پر معابد اشعار کے ایسے درجنوں بت ابھرے جو زیدی کے اشعار سے ٹکر لینا چاہتے تھے۔ لیکن میرے قلب و نظر کا تقاضا تھا کہ لذت کے اس احساس فراواں کو محفوظ رکھا جائے جو زیدی کے شعر پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جب زیدی کے اشعار کی لذیذ حکایت بیان ہو تو بات اس کے اشعار تک ہی محدود رہے لہٰذا آپ کو اس قسم کی تنقید و تحسین سے اگر پہلے سابقہ نہیں پڑا تو اب ملاحظہ فرما لیں۔ آپ کی تنقید میرے علم میں اضافہ کرے گی۔

بات یوں ہوئی کہ مری کی ایک سہانی شام کو (غالباً ۱۹۵۹ء میں) مری لٹریری یونین نے میونسپل لائبریری ہال میں حسب معمول ایک مشاعرہ کیا۔ میں بھی سامعین کی حیثیت سے مدعو تھا۔ ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جدید وضع کا خوش پوش نوجوان چشمہ لگائے صدارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مقامی سب ڈویژنل مجسٹریٹ ہیں اور نام مصطفیٰ زیدی ہے۔ ابھی چند شاعروں نے اپنا کلام سنایا ہی تھا کہ صدر کسی اور مصروفیت کی وجہ سے جلسہ سے رخصت ہونے کے لیے اٹھے۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ اپنا کلام سنائیے۔ مصطفیٰ زیدی صاحب نے اپنی ایک نظم کا حصہ پڑھ دیا۔ میں حیران ہو کر سن رہا تھا کہ اردو میں اس قسم کی نظم بھی لکھی جا رہی ہے! اسے میری ناواقفیت پر محمول کر لیجیے لیکن یہ حقیقت تھی کہ فارسی سے مستعار لے کر گل و بلبل کے قصے سننے سنانے والی زبان میں پہلی دفعہ میں نے ایسے شعر سنے جن کی مثال مجھے پہلے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ لوگوں نے ہل من مزید کے نعرے تو بہت لگائے لیکن صدر یہ جا وہ جا کرسی صدارت خالی چھوڑ کر چل دیے۔ اور میں ابھی اپنے تاثرات کو مجتمع بھی نہ کر پایا تھا کہ ہجوم (مشاعروں میں اکثر ہجوم ہی ہوتا ہے) نے خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ مشاعرہ ہوتا رہا اور شاعر داد و بیداد کے شکار ہوتے رہے۔ لیکن میں سارا وقت یہ سوچتا رہا کہ کاش مصطفیٰ زیدی صاحب کچھ دیر اور پڑھتے بلکہ صرف وہی پڑھتے رہتے تو یہ محفل کتنی پرلطف ہوتی۔ اور پھر یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی کہ کبھی موقع ملا تو صرف مصطفیٰ زیدی کو سنیں گے۔ اس طرح کاہش خلش ایک آرزو بن کر دل میں بیٹھ گئی۔

زیدی صاحب کو سننے کی آرزو تو کئی سال تک پوری نہ ہوئی لیکن اب وقتاً فوقتاً ان کے اشعار مختلف جرائد میں نظر آتے تو میں خاص انہماک سے ان کا مطالعہ کرتا۔ بلکہ بعض چیزوں کو بار بار پڑھتا کہ اس سے تفہیم و تحصیل لطف میں ہر بار کے مطالعہ سے اضافہ ہوتا۔ اور پھر ایک دن مجھے "روشنی" "شہر آذر" اور "موج مری صدف صدف" یعنی زیدی صاحب کی تینوں کتابیں مل گئیں۔ یہ زیدی صاحب کا عطیہ تھا۔ جو ایک خط کے جواب میں مجھے ملا۔ پھر میری درخواست پر آپ نے زیر چھاپ مجموعہ "اشعار گریباں" بھی مجھے بھجوایا۔ کہاں تو زیدی صاحب سے چند شعر سننے کی آرزو تھی اور کہاں کامل زیدی اب میرے سامنے تھا۔

معلوم ہوا کہ مصطفیٰ زیدی ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے خود اسی سال بی اے پاس کیا تھا۔ زیدی صاحب نے الہ آباد سے انگریزی کا ایم اے کیا۔ اور پھر ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے آئے۔ پہلے اسلامیہ کالج کراچی اور پھر کچھ مدت پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس میں منتخب ہوئے اور اس وقت سے اب تک مختلف ادبی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے یورپ اور مشرق اوسط کا طویل سفر کیا۔ یہ بتانا اس لیے ضروری ہے کیونکہ آپ کے اشعار کے سلسلہ میں اس واقعہ کا حوالہ پیش خدمت ہوگا۔ مجھے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

زیدی کا پہلا مجموعہ شعر "روشنی" کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے جو غالباً ۱۹۶۰ء میں چھپا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں الہ آباد سے شایع ہوا

تھا۔ تازہ اشاعت میں کچھ ترمیم اور اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اب اس میں ۴۵ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ لیکن یہ سب کی سب ۴۵ء اور ۵۰ء کے درمیان کی تخلیق ہیں۔ زیدی کا اپنا خیال ہے کہ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا جب محض تجربے کے لیے آدمی بڑی بڑی تحریکوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب متوقع باتیں غیر متوقع طور پر ہوتی رہتی ہیں اور جب نئے جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسناتا رہتا ہے:

اک سرکش امنگ سینے میں — اس طرح اپنا سر اٹھاتی تھی
اس کے نم عارضوں کے سائے میں — اس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی

(روشنی ص - ۳۸)

یا یہ کہ:

دلِ ناداں نے جھلکتی ہوئی تاریکی کو — اپنے معیار کی عظمت کا اجالا سمجھا
ہائے وہ تشنگیٔ ذہن و تمنا جس نے — جب بھی صحرا پہ نظر کی اسے دریا سمجھا

(روشنی ص: ۵۷)۔

لیکن اس تشنگیٔ ذہن کے باوجود زیدی نے کبھی کبھی قلب و نظر میں وہ ہم آہنگی محسوس کی ہے کہ اسے اپنے محبوب شہکار کی بات کہتے ہی بنی ہے۔ اور اس کی تجسیم اس نے یوں کی ہے:

تیری نظروں میں روایات کی سلمائیں ہیں — جیسے بچوں کی بتائی ہوئی بازار کی بات
جیسے پربت کی بلندی سے زمیں کے مینار — جیسے اک حلقۂ الحاد میں اوتار کی بات
تیرے لہجے کی کھنک تیری ندامی آنکھیں — جیسے اک ناؤ پہ اس دیس کی اس پار کی بات
چونکتی صبح کی چہرے پہ خمارِ یک شب — چاندنی رات میں خیام کے اشعار کی بات
یوں بلکتی ہوئی چہرے پہ حیا کی تنویر — جیسے اقرار زدہ ہونٹوں پہ انکار کی بات
جیسے نکھرے ہوئے اشعار کی تخلیق کے وقت — ذہن شاعر میں خیالات کی رفتار کی بات
جس کو چھو بھی نہ سکے کوئی سمجھ بھی نہ سکے — اتنی نازک ہے ترے روپ ترے پیار کی بات
لکھ سکا کون سا ہومر ترے شہکار کی بات

(روشنی ص - ۳۰)

شیلے اور ہومر کو شہکار کی بات نہ لکھ سکنے کے قابل بتا کر بھی زیدی خود اس کی نہایت حسین و جمیل تفسیر پیش کر گیا ہے۔ اور یہی اس کی فنکاری کا کمال ہے۔ جس کی بنیاد "روشنی" سے لے کر "گریبان" تک صرف خلوص پر رکھی گئی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے نہایت دیانتداری سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ لہٰذا آپ اس کے جذبات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان جذبات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتے ہوئے دیکھ کر آپ اس پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ باور نہ ہو تو اس نظم کو سن لیجیے۔ بات معمولی سی ہے۔ ہر محب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ محبوب التفات فراواں کے بعد کبھی کبھی یہ انداز اختیار کرتا ہے جیسے وہ محب کو جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ قدیم شعرا کے ہاں دن کو "گریہ زاری" اور رات کو "اختر شماری" ہوا کرتا تھا۔ اور قاری اس حادثے کی غم انگیز تفاصیل سنتے سنتے اکتا جاتا تھا لیکن زیدی کے ہاں یہ سانحہ صرف اس قسم کی حیرت اور تعجب پیدا کرتا ہے جو بالکل طبعی ہے۔ ہاں ان میں کبھی کبھی بیتے ہوئے دنوں کے التفات فراواں کی یاد کی کسک ضرور شامل ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے:

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی — ورنہ اس راہ پہ ذرات ہیں پامال جہاں
اس کی آنکھوں میں تھی انجان ستاروں کی تلاش — کھیلتے گھومتے گنگارتے دھاروں کی تلاش
جھومتے ڈولتے خاموش اشاروں کی تلاش — آج آنکھوں میں تڑپ تھی نہ اشارا ساقی
اب تو یہ فکر بھی بیکار ہے یہ غم بھی فضول — کہ اسے مجھ سے بہر طور محبت بھی نہ تھی
کہ اس الجھن کا سبب کوئی رقابت بھی نہ تھی — آج تو اس کی نگاہوں میں حقارت بھی نہ تھی
آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی

(روشنی ص ۸۱، ۸۲)

لیکن یہ اندازِ تسکین تو صرف اپنا دل بہلانے کے لیے تھا۔ اور اس حیرت اور تعجب پر قابو پانے کے لیے جو اس سانحے نے پیدا کیا ہے۔ ورنہ رقیب نے جو دراندازی کی تھی زیدی نہ صرف اس سے غافل نہیں بلکہ اس کی پوری تفصیل رقیب کی زبان سے کہلواتا ہے۔

سنا تم نے زیدی کا کردار کیا ہے ثناخوانِ ابلیس و بدخواہ یزداں
وہ خانہ بدوشئے زخانہ بدوشاں وہ آوارہ گردے ز آوارہ گرداں
وہ مصروفِ طاعت گذاریِ نغمہ وہ محوِ سجودِ نگارانِ رقصاں
وہ جس کا تکلّم وہ جس کا ترنم حدی خوانیِ کاروانِ حسیناں
سسکتا ہوا خود فریبی کا بادل گرجتا ہوا جہل و وحشت کا طوفاں
نمازوں میں دیکھا نہ روزوں میں دیکھا نہ صبحوں کو خنداں نہ راتوں کو گریاں
کبھی انقلاب اور بغاوت کا شعلہ کبھی دودِ گرمِ دلِ نازنیناں
نہ اندازِ حکمت نہ آثارِ دانش فقط عکسِ مہ پاریِ مہ جبیناں
نہ لہجہ ہی ساکن نہ نغمہ ہی مدغم فقط برق و آتش فقط ابرِ باراں
اسے کیا ثواب و طہارت سے مطلب وہ شاہِ صبوحی شہنشاہِ رنداں
یہی ہے تمہارے پجاری کا جیٹھا؟ یہی ہے وہ سر کردۂ خوشہ چیناں
یہی ہے وہ شہ پارۂ آلِ سیدؑ یہی ہے وہ تفسیرِ خونِ شہیداں
یہی ہے وہ پروردۂ ابرِ باراں؟

زیدی کے دوسرے مجموعے "شہرِ آذر" میں ۹۴ نظمیں اور ۲۰ غزلیں ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا تھا۔ گو زیدی کے بقول اس مجموعے میں جتنی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ میری نہیں ہیں بلکہ تیغ الٰہ آبادی کی ہیں۔ تیغ الٰہ آبادی اور میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی تھے لیکن آخر انھیں علیحدہ ہونا ہی پڑا۔ اس تخلص کی قصابیت کو میں نے بچپن کی غلطیوں میں شامل کر رکھا تھا لیکن آخر تخلص کے بغیر بھی گذر ہو ہی سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی تخلص کے علاوہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی سے ابھی تک میں ہی مانوس نہیں ہوا ہوں۔ آپ کو تو شاید اور بھی مدت درکار ہو (شہرِ آذر ص ۱۹)۔ اس مجموعے کی نظموں پر شاعر نے خود یہ تبصرہ کیا ہے کہ ان نظموں میں دیکھنے سے زیادہ سوچنے اور چھونے سے زیادہ محسوس کرنے کا رحجان نظر آتا ہے۔" اور یہ تبصرہ نہایت درست ہے۔ سوچ اور حس کرنے کا کامیاب تجربہ "تہذیب" کی مختصر سی نظم میں کیا گیا ہے۔

تہذیب

شہر میں غل تھا کہ بنگال کا ساحر آیا
مصر و یونان کے اہرام کا سیّاحِ عظیم
چین و جاپان کے افکار کا ماہر آیا
ایک ٹیلے پہ مروت کا نمونہ دیکھا
میں نے بھی دل کے تقاضوں سے پریشاں ہو کر
آخر اس ساحرِ طنّاز کا چہرہ دیکھا
کتنا معتبر در تھا اس شخص کا مضبوط بدن
کتنا چالاک تبسم تھا جواں ہونٹوں پر
کیسے رہ رہ کے لپک جاتی تھی آنکھوں میں کرن

کتنا مرعوب تھا ہر فرد مری ملت کا
ڈرتے ڈرتے جو چھوا میں نے تو یہ راز کھلا
وہ فقط موم کا اک خوف زدہ پتلا تھا

نظم کے آخری تین مصرعوں میں وہ سب کچھ سما گیا ہے جو فکر شاعر نے تخلیق کیا ہے اور جسے چھونے کے بعد آپ اس تمثیل کی تمام تفاصیل کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور شاعر کے ہمنوا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سوچ تو ہم بھی یہی رہے تھے لیکن کہنے کی جرأت صرف تمہیں نصیب ہوئی ہے۔ مہذب آدمی تہذیب کی باتیں اسی انداز سے کیا کرتے ہیں جیسے زیدی نے اس نظم میں کی ہیں لیکن حوادث فکر کبھی کبھی شاعر کو اس ڈگر پر بھی لے آتی ہے جہاں وہ برملا کہنا شروع کر دیتا ہے:

آج کل رنگ و صباحت کی بہت قیمت ہے　　آج کل جشن و مسرت کی بہت قیمت ہے
مفلسی دھات کے سکون کو جنم دیتی ہے　　زندگی موت کے چھلکوں کو جنم دیتی ہے
روحیں تہذیب کے شعلوں سے پگھل جاتی ہیں　　کونپلیں ریل کے پہیوں میں کچل جاتی ہیں
قہقہے جلتے ہوئے گوشت کی بو دیتے ہیں　　اسپتالوں کو جراثیم نمو دیتے ہیں
خون بھی ملتا ہے ہوٹل میں رگِ تاک کے ساتھ　　عمداً زہر دیا جاتا ہے خوراک کے ساتھ
اسی منڈی میں جہاں صاف کفن بکتا ہے　　جسم بکتے ہیں ادب بکتا ہے فن بکتا ہے
عشق پیسوں کی ترازو میں تلا کرتا ہے　　حسن تیزاب کی بوتل سے ڈھلا کرتا ہے

(شہر آذر ص ۴۲)

زیدی کی یہ نظم ایک طویل آس انگیز شکوائیہ ہے لیکن انہی چند اشعار کو دیکھیے کہ ان میں کتنی تفاصیل آ گئی ہیں اور ان تفاصیل کا کینوس کس قدر وسیع ہے۔ پھر اس کینوس پر آپ کو ہر طرف طنز و تنقید کے تیر و نشتر بھی چلتے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن میں نے اس نظم کو آس انگیز شکوائیہ کہا ہے۔ حزنیہ نہیں کہا کیونکہ خون انگیزی کی بجائے بات اس امید افزا ترغیب پر ختم ہوتی ہے:

آؤ ہم لوگ بھی ایک عزم سے اک ہمت سے　　اپنے بیتے ہوئے حالات کو ٹھکرا کے چلیں
اپنی فرسودہ روایات کو ٹھکرا کے چلیں　　وقت کی ریت پہ وہ نقش قدم چھوڑ چلیں
جن کی آتی ہوئی نسلوں کو ضرورت ہوگی

(شہر آذر ص ۴۷)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے حقیقت پسندی اور برملا گوئی زیدی کا خاصہ ہے۔ امن پسندی اور ان کی ترغیب دلانے والے وعظ تو آپ نے کئی سنے ہوں گے، لیکن زیدی نے امن شکستگی کی جو بے مثال بھیانک تصویر کھینچی ہے اس کو سننے کے بعد آپ کے رونگٹے اگر کھڑے نہیں ہوتے تو جنگ سے نفرت ضرور پیدا ہوتی ہے۔

اگر کہیں پھر یہ آگ لپکی
تو اس کی زد سے ہماری تہذیب کی بہاریں نہ بچ سکیں گی
تمہیں تو یہ بات یاد ہوگی
کہ دوسری جنگ ہی میں پانی کے بدلے کیچڑ پیا گیا ہے
غذا کے بدلے سپاہیوں کو نجاستیں پھانکنی پڑی ہیں
ہزاروں مائیں جوان بچوں کے واسطے خون رو چکی ہیں
شکستگی بے بسی میں چمڑے کی پیٹیاں چاٹنی پڑی ہیں
ضعیف باپوں کے تھرتھراتے ہوئے قدم سرد پڑ چکے ہیں

سہاگنوں کی نگاہیں دولہا کی واپسی کو ترس چکی ہیں
سسکتی بہنوں سے بھائیوں کو کفن پہنا کے جدا کیا ہے۔ (شہر آذر ص ۹۵)

یہ پچھلی جنگ کی بات تھی۔ آئندہ کیا ہوگا۔ وہ بھی سن لیں:

اگر پھر اس بار جنگ ہوگی
تو آدمیت نکیلے بوٹوں کی ٹھوکروں سے لرز اٹھے گی
تمہارے گھر کے برآمدے میں جھلسی اینٹوں کے ڈھیر ہوں گے
تمہارے شوہر کا جسم سیسے کی گولیوں سے فگار ہوگا
تمہارے چہرے پہ داغ تھے کے نیل ہوں گے لب پر خراش ہوگی
تمہارے چولھے میں لکڑیوں کے عوض تمہارا بدن جلے گا
تمہاری اپنی زمیں جلے گی تمہارا اپنا وطن جلے گا (شہر آذر ص ۹۹)

اور پھر

یہ بات تم تک نہیں رہے گی
یہ زہر دھرتی کی ایک اک نس میں گھل کے ہر جڑ کو کاٹ دے گا
یہ زہر رگ رگ کو چاٹ لے گا
زمین گیہوں نہیں جنے گی
کہ اس کے ہونٹوں پہ آدمی کے لہو سے پیڑی جمی ہوئی ہے
ملوں میں کپڑا نہیں بنے گا
کہ تکلیوں کو گھمانے والوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں
ادب کا نام و نشاں نہ ہوگا
کہ درسگاہوں میں گدھ مدرس کی لاش سے خون پی رہے ہیں
کہیں تقدس نہیں رہے گا
کہ شاہراہوں پہ فوج کے روسیاہ کتے زنا کریں گے (شہر آذر ص ۹۹)

۱۹۵۷ء کا ذکر ہے میں حکومت پاکستان کی طرف سے دسمبر میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی نمائش کے لیے ایران اور ترکیہ سے نوادر مستعار لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میونک (جرمن) میں کانگرۂ مستشرقین میں شرکت کروں۔ اگست ۵۷ء کی ایک شام کو میں اور جمیل رضوی صاحب (جواب مسٹر جسٹس جمیل حسین رضوی ہیں) میجر جنرل رضا صاحب سفیر کبیر پاکستان در ایران کے مکان پر تہران میں کھانے پر مدعو تھے کہ خبر ملی کہ ایک پاکستانی مجتبیٰ زیدی خراساں میں مشہد کے قریب موٹر کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ یہ انگلستان سے اپنی کار میں وطن واپس آرہے تھے اور اس کار کی ٹکر ایک بس سے ہو گئی۔ اس خبر سے ہمیں اور ہمارے میزبان کو بہت رنج ہوا اور تہران کے پاکستانی حلقوں میں کئی دن تک اس پر غم کا اظہار ہوتا رہا لیکن مصطفیٰ زیدی نے جب مجھے اپنے اشعار کا مجموعہ "موج مری صدف صدف" بھیجا جس کا انتساب انھوں نے اسی حادثے میں ہلاک ہونے والے بڑے بھائی کے نام سے کیا ہے تو اسے پڑھ کر پھر ایک دفعہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ نامکمل نوحہ خلوص و صداقت کا ایک نادر نمونہ ہے:

تم کہاں رہتے ہو اے ہم سے بچھڑنے والو
ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے
بھائی آواز اگر دے تو سنو گے کہ نہیں

دشت غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے　　　کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے　　　تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا
ہم تو جس وقت بھی جس دن بھی پریشان ہوئے　　　تم نے آ کر ہمیں محفوظ کیا راہ دکھائی
اور جب تم پہ برا وقت پڑا تب ہم لوگ　　　جانے کس گھر میں کہاں سوئے ہوئے تھے بھائی

(۲)

ہم تری لاش کو کاندھا بھی نہ دینے آئے　　　ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا
ہم نے اس زیست میں بس ایک نگیں پایا تھا　　　کسی تربت میں وہی ایک نگیں چھوڑ دیا

رقت انگیزی صرف نالہ و شیون اور آہ و بکا سے سرانجام نہیں پاتی۔ اور انفرادی غم کو عالمگیر وسعت دینا ہر غمزدہ کے بس کی بات نہیں لیکن جب آپ ان سطور کو پڑھتے ہیں:

دشت غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے　　　کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے　　　تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا

تو بھائی کے تلملاتے ہوئے دل کی تمام کیفیات آپ کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

یہ ایک تعارفی جملہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ زیدی کا تیسرا مجموعہ کلام "موج مری صدف صدف" پہلی دفعہ فروری ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا تھا۔ اور اس مجموعے کی اکثر نظمیں قیام انگلستان یا سفر یورپ کے زمانے کی ہیں۔ بہر چند خاکے جن سے شاعر کے بقول ذہن کی ایک خاص فضا مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ فضا اس معصوم رند کی ہے جو ایک چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد کبھی اس پر تنقید کرتا ہے اور کبھی اس سے محظوظ ہوتا ہے لیکن اس میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا۔ یہ سب نظمیں وہ تاثرات ہیں جن کو ایک مخصوص جذبے کے ساتھ جذباتیت سے اوپر اٹھ کر نظم کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے کسی یورپی شہر کے ہماہمی کے مراکز کو دیکھا ہے اور انھیں دیکھتے رہنے کے بعد ایک خاص قسم کے ذہنی دنیا میں بسایا ہے کچھ وہی لوگ ہیچیدگی کر اس کے ایک منظریہ بند اور ایک جذباتی بند کے تاثرات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ تاثرات ان کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں جن کا اثر تو غائبانہ ہر چشم ناظر قبول کرتی ہے۔ لیکن صفحۂ قرطاس پر تاثر کی حقیقی شدت کے ساتھ منتقل نہیں کر سکتی۔ یہ کام صرف شاعر ادیب اور آرٹسٹ ہی بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور زیدی اس نظم میں بیک وقت ان تمام قرائن سے عہدہ برآ ہوا ہے:

کوئی تم سے پوچھے۔
ستاروں کی رونق، چراغوں کی قربت، شبستاں کے اسرار۔
کافی نہیں تھے
جو تم نے کسی طاق دل سے لرزتی ہوئی موم بتی کی لو
بھی چرالی؟

کوئی ہم کو دیکھے۔
سر رہگذر ایسے بیٹھے ہیں جیسے
کسی نے ذرا بھی جو پوچھا تو اس سے بگڑ کر کہیں گے
یہ دیر و حرم تو نہیں، کعبہ و پاپستاں تو نہیں ہے
خدا کی زمیں ہے، رہ عام ہے کوچۂ یار نامہرباں تو
نہیں ہے ـــــــ

یورپ کی پاپیادہ سیاحت (دراصل آپ موٹر میں سفر کر رہے تھے) میں زیدی نے بعض ملکوں اور شہروں کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ جیسا کہ ہر سیاح کرتا ہے۔ لیکن اس مشاہدہ سے زیدی کے جذبات میں جو ہلچل پیدا ہوئی ہے وہ فلسفہ، نغمہ اور آرزو کا ایک سیل رواں بن کر بہ نکلی ہے۔ جرمنی کی بات سنیے:

کتنے خوابوں کے طلسمات کی جنت ہے یہاں — کون سا خواب ابھی پردۂ تقدیر میں ہے
خواب اس وقت کا جو وقت نہیں آسکتا — خواب اس وقت کا جس وقت کو آنا ہوگا
گیت جس میں لب و رخسار کے افسانے ہیں — گیت جو خود بھی کبھی ایک فسانہ ہوگا
جس کو چھیڑیں گے مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب — جس کو بن وقت کے آہنگ پہ گانا ہوگا

آگ کے دشت پڑے خون کے صحرا آئے — اب بھی لیکن وہی رفتار جواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہر اک عہد کا روشن وارث — ہائیڈلبرگ وہ حکمت کی دکاں ہے کہ جو تھی

فرض کرتے ہیں تری مرگ ہی لوگ جنھیں — خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعور
تیرے ماتھے پہ نئے عہد نئے دن کی امنگ — تیری آنکھوں میں چمکتے ہوئے مہتاب کا نور
وگنر کا یہ سبک ساز یہ فولاد کے گیت — تیرے سینے کی امنگیں تیرے بازو کا غرور

ہم پیمبر تو نہیں ہیں ترے دیوانے ہیں — اک ذرا آگ ہمیں بھی ملے اے شعلۂ طور

جرمنی کا مقابلہ روضۂ شاہ شہیداں سے کیجیے۔ جس کے حضور میں شاعر کمال خشوع و خضوع کے ساتھ پہنچا ہے اور یہ دیکھ کر حیران ہے کہ ان تیروں کے مجاور اور یہاں کے منبر کے خطیب بیل ایرادر کر سلر کاروں میں آنے والے زائرین سے فلس و دینار کا بھیک مانگنے کے سوا کارزار حیات میں اور کوئی مہم سر نہ کر سکے۔ اس کی حیرت ایک نوحے کی شکل اختیار کرتی ہے:

غیر تو رمز غم کون و مکاں تک پہنچے — کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے
تیرے دیوانوں کو اے شاہد دریائے فرات — اپنے مانگے ذہن میں کیا ملتا ہے (موج مری صدف صدف ص ۹۰)

یورپ کی سیاحت کے بیان کے علاوہ اس مجموعے میں جو رومانی اور علامتی نظمیں شامل ہیں ان میں ایک وہ تصویر جلتی ہوئی دکھائی گئی ہے جسے چاہنے والے نے ایک عرصے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس تصویر کو دیا سلائی دکھانے سے لے کر راکھ ہوتے ہوئے دیکھ کر جھنجھلائے ہوئے دل میں جو تاثرات پیدا ہوئے ہیں ان کو بڑی چابکدستی سے رومانی انداز میں نظم کیا گیا ہے:

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی — جس سے بے نور خیالوں پہ چمک آتی تھی

اس جھنجھلاہٹ کی جو حسین توجیہہ کی گئی ہے وہ بھی سن لیجیے:

اور اب یاد کے اس آخری پیکر کا طلسم — قصۂ رفتہ بنا زلیست کی باتوں سے ہوا
دور اک کھیت پہ بادل کا ذرا سا ٹکڑا — دھوپ کا ڈھیر ہوا دھوپ کی باتوں سے ہوا
اس کا پیار، اس کا بدن، اس کا مہکتا ہوا رنگ — آگ کی نذر ہوا اور اپنی ہاتھوں سے ہوا (موج مری صدف صدف ص ۴۷)

اسی مجموعے میں دو پرتاثیر علامتی طنزیے "گواہی" اور "ایک سہرا" کے عنوانات سے شامل ہیں جن کا مطالعہ مفید ہوگا۔

زیدی کا چوتھا مجموعۂ کلام "گریباں" کے نام سے زیرِ چھاپ ہے۔ جس میں آپ کو تازہ ترین زیدی نظر آئے گا۔ اس کا خیال ہے "کہ ادبِ عالیہ اس طرح تو جنم لیتا نہیں کہ خواہ مخواہ رزمیہ لکھا جائے یا عشق و عاشقی کے ذکر سے ارادی گریز کے راستے اختیار کیے جائیں۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر موضوع نکالنا اور تلاشِ عظیم کے بعد علامتیں وضع کرنا کوئی ایسی صحیح الدماغی کی بات نہیں" اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں اس نے وارداتِ قلب کو سیدھے سادے رومانی انداز میں بیان کر دیا ہے۔

تو مری شمعِ دل و دیدہ

وہ کوئی رقص کا انداز ہو یا گیت کا بول
میرے دل میں تری آواز ابھر آتی ہے
تیرے ہی بال بکھر جاتے ہیں دیواروں پر
تیری ہی شکل کتابوں میں نظر آتی ہے

شہر ہے یا کسی عیّار کا پرہول طلسم
تو ہے یا شہرِ طلسمات کی ننھی سی پری
ہر طرف سیل رواں، بس کا دھواں، ریل کا شور
ہر طرف تیرا خنک گام تری جلوہ گری

ایک اک رگ تری آہٹ کے لیے چشم براہ
جیسے تو آئے گی بس کوئی گھڑی جاتی ہے
تیری پرچھائیں ہے یا تو ہے مرے کمرے میں
بلب کی تیز چمک ماند پڑی جاتی ہے

ٹینک سڑکوں پہ چلیں جیپ کے آگے پیچھے
دن گزرتا ہے ترا سایۂ ابر دے کر
فلسفے تند حقایق کی شعاعیں ڈالیں
شام آتی ہے تری آنکھ کا جادو لے کر

لنگر انداز ہوں ساحل پہ مشینوں کے جہاز
رات ڈھل جاتی ہے مہکے ہوئے گیسو لے کر
میں ای گیس کی دنیا میں تعفن کے قریب
شعر کہتا ہوں ترے جسم کی خوشبو لے کر

اور اس عشق و عاشقی کی بات کے ساتھ ساتھ شاعر خودنگری اور فلسفہ سنجی میں بھی مصروف ہے۔

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے
میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا

میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا
نہ خلاؤں کا طلبگار نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے
اپنا سایہ بھی گریزاں ترا داماں بھی خفا
رات کا کرب بھی بیزار چراغاں بھی خفا
صبحِ یاراں بھی خفا شامِ غریباں بھی خفا
وزد ایماں بھی خفا اور نگہباں بھی خفا
خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے

ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے
تار بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن مہر کے ادراک میں ہے
جاگ اے روح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے

(گریباں کا خطی نسخہ)

آخر میں ایک حسین منظر یہ ملاحظہ ہو جس میں رفتار و احساسات کی تمام تفاصیل خوشگوار رومانی انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

ایئر ہوسٹس

شہر کی روشنیاں کرمکِ آوارہ ہیں
نہ وہ ہوٹل کے دریچے نہ وہ بجلی کے ستون
نہ وہ اطراف نہ رفتار کا گم نام سکوں
ہر گھڑی ساعتِ پرواز بنی جاتی ہے

سیکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہوگی زمیں
کہیں پٹرول کے مرکز کہیں سڑکوں کا غبار
تار کے آہنی کھمبوں کی طرح راہ گزار
مختلف لوگوں کی آواز بنی جاتی ہے

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت
کرشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے
اے مرے دل کے دھڑکنے سے بظاہر غافل
تیری صورت تری غماز بنی جاتی ہے

ہم سفر انجنیں گرم کیے بیٹھے ہیں
تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

زیدی کا قلم ابھی جوان ہے۔ وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے لیکن اس کے اپنے بقول "گریبان" میں اس کی محبت کے پیچھے جو عورت ہے وہ نہ تو "شہر آذر" کی آسیا گردان بتول ہے اور نہ "موج مری صدف صدف" کی حریم تنہا نشین"۔ اس موقع پر زیدی کی شاعری کے متعلق قطعی حکم لگانا درست نہ ہوگا صرف ایک امید لگائی جا سکتی ہے کہ خلوص و سادہ نگاری استادی کے ساتھ اور بڑھے گی اور چمکتی ہوئی شاعری کی اس لہر کو مزید تابانی بخشے گی۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ یہ مضمون تحسین و تنقید جمال کے پیرتب نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اس لذت فراواں کو مجتمع کرنے کے لیے جو زیدی کے کلام کے مطالعہ سے حاصل ہوئی ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔

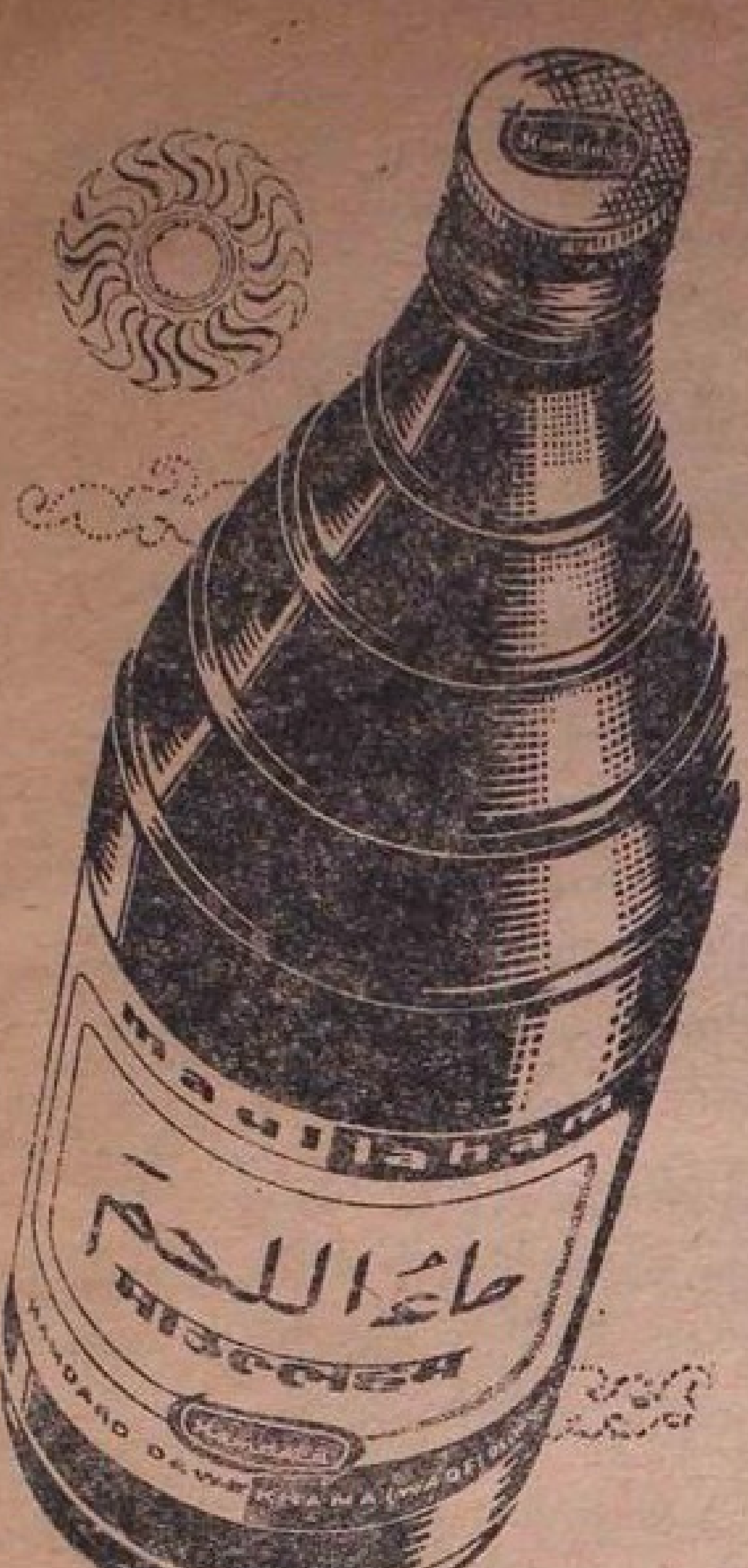

ہمدرد کا ماءُاللحم
بھوک کو بڑھاتا ہے اور دوران خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر ایک نئی طاقت، نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

ہمدرد
دہلی
کانپور
پٹنہ

mas. HMD. 1934 A

چھیڑ غالب سے چلی جائے

غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بڑی دلچسپ انداز سے پیش کرنے والی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے۔ قیمت ۵ روپے
نگار بک ایجنسی رامپور ۔ یو، پی

باغ و بہار کا ماخذ ـ نوطرزِ مرصّع

سید ابوالخیر کشفی

نوطرز مرصع باغ و بہار کا ماخذ ہے ۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہی ۔ باغ و بہار کا سرورق اس حقیقت کا ثبوت ہے :

"باغ و بہار ـــ تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرزِ مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے ۔ فارسی قصہ چہار درویش سے ۔"

ہندوستان میں باغ و بہار کے جو ایڈیشن شایع ہوے ان میں اس عبارت کی غیر موجودگی نے بڑا ستم ڈھایا اور غلط فہمیوں کو میر امن کے مقدمے نے زیادہ مضبوط بنایا ۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعے سے بجا طور پر اسی نتیجہ پر پہنچے :

"باغ و بہار جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فارسی قصہ کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے ۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی لکھدیئے ہیں ۔ جو نوطرزِ مرصع میں ہیں"

مولوی صاحب مرحوم نے ان دونوں کتابوں کے مشترک مقامات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ میر امن نے نوطرز مرصع کو اپنے سامنے رکھا نہ کہ اصل فارسی کو ۔ مولوی صاحب کا مقدمہ باغ و بہار کے مطالعہ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ میں اس بحث کو دہرانا نہیں چاہتا ۔

میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا کہ اصل فارسی کتاب کس کی تصنیف ہے ۔ میرا تعلق تو باغ و بہار اور نوطرز مرصع کے باہمی تعلق سے ہے اور مجھے بیچارے تحسین سے ممتاز حسین صاحب کا یہ جملہ پڑھ کر خاصی ہمدردی ہو گئی ہے کہ "میر امن اور نوطرز مرصع کو اپنا ماخذ ٹھہرائیں ۔ ارے معلوٰۃ اس کا ایک جملہ تو درست ہے ہی نہیں ۔"

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ نوطرزِ مرصع شمالی ہند کی پہلی اہم اور مکمل اردو تصنیف ہے ۔ نوطرزِ مرصع میں وہ اسلوب کلبلاتا ہوا نظر آتا ہے جس نے میر امن کی باغ و بہار کے صفحات پر آنکھیں کھولیں اور صفحہ بہ صفحہ اُن کے ذہن اور زبان کی فضا میں پرورش پاتا ہوا بالغ ہو گیا ۔ اور "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے جذبہ کے تحت ۔

دوستی میں ایک بات ممتاز صاحب سے بھی کہتا چلوں کہ حضرت! تحسین جیسے تھے ، سو تھے مگر ایسا بھی کیا کہ وہ مجھ سے اور آپ سے بھی بری نثر لکھتے ۔

حاشیہ میں ممتاز صاحب نے تحسین کا ایک جملہ نقل کیا ہے سوچتا ہوں کہ میں بھی ممتاز صاحب کے مقدمۂ باغ و بہار کا ایک آدھ جملہ یہ کہتے ہوئے پیش کر دوں کہ "ملاحظہ ہو" ۔

"...... اس لیے صوفیانہ شاعری اور آرٹ جس میں داستان گوئی بھی شامل ہے ، سمبالک ہوتا ہے ، یعنی ایک ہی معنی میں تخصیص و تعمیم کے دونوں پہلو رکھتا ہے نہ ایلیگاریکل جہاں تعمیم خصوص سے باہر ہوتی ہے ......"

اب ٹکڑے ملاحظہ ہوں ...... (۱) یہ قصہ محمد شاہی عہد میں موضوع یا مخترع نہیں ہوا " نیرنگیٔ روزگار مدرک صنایع و بدائع پروردگار " کہاں تک ہوتے پیش کروں ۔ ممتاز صاحب "علمیت" اور "علمی موضوع" کی بنا پر ایسی اردو لکھنے پر مجبور تھے اور تحسین بھی ایسے ہی دوسرے حالات کے اسیر تھے ۔

اس طویل جملۂ معترضہ کے لیے معافی چاہتا ہوں آپ سے بھی اور ممتاز صاحب سے بھی۔

فارسی قصہ کے بارے میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میرے خیال میں قصہ چہار درویش نہ تو امیر خسرو کی تصنیف ہے اور نہ عہد محمد شاہی کی تخلیق۔

چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے اس موضوع پر مرحوم پروفیسر شیرانی بڑی تفصیل سے داد تحقیق دے چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بھی درست نہیں۔ چہار درویش حکیم محمد علی (مخاطب بہ معصوم علی خاں) کی تصنیف بھی نہیں ہے۔ خسرو کی تصنیف تو اس لیے نہیں ہے کہ اس میں دوربین کا تذکرہ ہے جو خسرو کے عہد میں ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ علاوہ بریں فارسی قصہ میں نظیری و عرفی کے اشعار بھی ہیں اور یہ شاعر خسرو کے بعد ہوئے۔ فارسی قصہ میں جن منصب داروں کے عہدے اور خطاب موجود ہیں وہ خطاب بھی عہد مغلیہ میں وضع ہوئے اور حکیم محمد علی کا دعویٰ یوں درست نہیں ہے کہ ان کے مخطوطے سے پہلے کا ایک نسخہ سنہ ۱۷۲۵ء کا لکھا ہوا دستیاب ہو گیا ہے۔ حکیم محمد علی کا نسخہ ۱۷۳۲ء میں مکمل ہوا فارسی قصہ چہار درویش عہد محمد شاہی سے پہلے لکھا گیا یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔

ان چند باتوں کے بعد اب میں نوطرز مرصع کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے اس کا سال تصنیف ۱۷۹۸ء بتایا اور بعد والے مدتوں اسی سنہ کو دہراتے رہے۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نوطرز مرصع اس سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے "نوطرز مرصع" کے دیباچے میں ڈاکٹر گیان چند کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تحسین کی نوطرز مرصع کا ذکر سب سے پہلے مہر چند کھتری مہر کے "قصہ ملک محمد و گیتی افروز" میں ملتا ہے۔ یہ قصہ ۸۹-۱۷۸۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوطرز مرصع ۱۷۹۸ء سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ انھیں دنوں میں عطا حسین خاں نے چہار درویش کا قصہ فارسی سے ہندی میں تضمین کر کے "نوطرز مرصع" نام رکھا۔ مولف نوطرز مرصع ہے مگر جو ریختہ زبان میں الفاظ دقیق اور عبارت رنگین موزوں کیا ہے۔ اس سبب سے مطبوع انگریزوں کے نہیں ہوا۔"

یہ اقتباس اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے نوطرز مرصع کے سبب تالیف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نوطرز مرصع کے دیباچہ میں تحسین نے اپنے بارے میں اور اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جرنیل اسمتھ اس قصے کے محرک اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی پسندیدگی نے کتاب کو تکمیل تک پہونچانے میں مدد دی۔ تحسین کی زندگی کا بڑا حصہ انگریزوں کے ساتھ اور ان کی نوکری میں گزرا۔ اس فسانہ کی ابتدا الہ آباد سے کلکتہ تک "جرنیل" اسمتھ کی معیت میں کشتی کے سفر میں ہوئی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر اس سفر کا سنہ اور تاریخ معلوم ہو جائے تو اس فسانہ کی ابتدا کی تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" جلد ۴ (پنجاب یونیورسٹی) میں عمادالسعادت کے حوالے سے اس سفر کی تاریخ دی گئی ہے۔

"والد کے انتقال کے بعد تحسین نے ۱۷۶۶ء میں جنرل رچرڈ اسمتھ کی معیت میں الہ آباد سے کلکتہ تک دریائے گنگا کا سفر کیا۔...

...... ۱۷۷۲ء میں وہ فیض آباد کے ریذیڈنٹ کپتان ہارپر کی ملازمت میں تھے (عمادالسعادت)

ڈاکٹر سید سجاد مرحوم نے جنرل رچرڈ اسمتھ کے حالات کے متعلق بڑی تحقیقی کاوش کا ثبوت دیا ہے ان کی تحقیقات کے مطابق وہ نومبر ۱۷۶۶ء میں جنرل بنایا گیا تھا اور ۱۷۷۰ء سے پہلے انگلستان واپس چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر سجاد مرحوم کی تحقیقات کے مطابق یہ کتاب ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ مکمل ہو چکی تھی۔ دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۴ کے مطابق اس کا سال تکمیل ۱۷۸۰ء (۱۱۹۵ھ) کے لگ بھگ ہے (قاموس الاعلام میں تحسین کا سال وفات ۱۲۰۳ھ دیا گیا ہے)

جیسا کہ پہلے کہا گیا ڈاکٹر گل کرسٹ کے مقدمہ اور باغ و بہار کے سرورق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوطرز مرصع اس کا ماخذ و بنیاد ہے۔ Lewis F. Smith نے ۱۸۴۲ء میں باغ و بہار کا انگریزی ترجمہ شایع کیا۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

" The Baghe-Bahar compiled by Meer Umman of Dhailwi from

Nantars Morassa which was translated by Uta Hussain Khan

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ میر امن اور نو طرزِ مرصع کو اپنا ماخذ بنائیں۔ ایسے معاذ اللہ فنی طور پر کوئی ناقص یا ناتمام نقش ایک بڑے فن کار کے لیے چیلنج ہوتا ہے۔ وہ اس زمین کو آسمان بنا دیتا ہے۔ نو طرزِ مرصع غالباً انگریزوں کو زبانِ اردو سکھانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس مقصد کو پورا نہ کرتی تھی۔ میر امن نے اسے نئے قالب میں ڈھالا اور اس طرح کہ باغ و بہار جدید اردو نثر کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ یہ بات میں سادگی و سلاست کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ سادہ اسلوب کا آغاز میر امن سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سید سبط حسن نے "ہم قلم" ستمبر یا اکتوبر ۶۲ئہ میں جدید اردو نثر کی پہلی کتاب پر تفصیل سے لکھا ہے۔

میں اس ضمن میں یہ عرض کروں گا کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش خود نو طرزِ مرصع میں موجود ہیں (اس کی تفصیل آگے آئے گی) میر امن کا کمال تو ان کا آہنگ اور اسلوب ہیں نثر کے نئے امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔ نثر کی شہزادی مدتوں سے تصنع کے بلوری صندوق میں بند تھی اور زندگی سے محروم ــــ میر امن نے اس صندوق کے ڈھکنے کو اٹھایا نثر کی شہزادی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور وہ جاگ اٹھی۔ مدتوں کا طلسم بکھر گیا۔ یہی ہے باغ و بہار کی اہمیت۔

ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش نو طرزِ مرصع میں موجود ہیں۔ اور ان نقوش کی دھیمی روشنی نے میر امن کو ایک جہانِ نو کی تخلیق میں یقیناً مدد دی تھی۔ نورالحسن ہاشمی صاحب کی یہ رائے مجموعی طور پر درست نہیں ہے کہ "نو طرزِ مرصع میں یہی سطحی اور مصنوعی مرصع کاری ہر جگہ ملتی ہے۔ یہ سطحی اور مصنوعی مرصع کاری نو طرزِ مرصع کے ابتدائی صفحات میں جنسِ ارزاں کی طرح موجود ہے۔ مگر اس کتاب کے اختتامی حصوں کا انداز بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی حصے میں تحسین اور میر امن کے اسالیب کے درمیان دو دنیاؤں کا فرق ہے ملاحظہ ہو۔

"باغ و بہار"	"نو طرزِ مرصع"
ایک شیشمحل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال مونچھوں میں نظر آیا کہ مانند تارِ مقیش کے چمک رہا ہے۔ شاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے	اتفاقاً اس عرصہ میں نظرِ مبارک بادشاہ کی طرف ایک آئینہ کے مقابل مکان عشرت گاہ کے نصب کیا تھا جا پڑی۔ جو سن شریف اُس کا قریب پچاس سال کے پہنچا تھا وقت مشاہدہ جمال مہر تمثال اور معائنہ صورت حال اپنے کے دیکھا کیا ہے کہ ایک دو سرے سفید درمیان داڑھی سیاہ کے مانند سہیل ستارے کے بیچ آخر شبِ تاریک کے کہ واقعی اس نشان کے تئیں ختم عمر کا کہتے ہیں۔ نمودار ہوا۔

اس اقتباس سے تحسین کے روایتی اسلوب اور میر امن کی نثر تازہ کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کی افتادِ طبع بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

میر امن "قصہ زمین برسرِ زمین" کے قائل تھے۔ سفید بال ان کے یہاں تارِ مقیش کی طرح چمک رہا ہے اور تحسین کے ہاں سہیل ستارے کی طرح ــــ پھر اپنے اختصار کے باوجود میر امن نے "نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھتے" کے ٹکڑے سے آزاد بخت کے کردار کے ایک پہلو کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

تحسین کی اس سطحی اور مصنوعی مرصع کاری کے مزید نمونے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے اسلوب کے اس پہلو کو یارانِ طریقت مدتوں سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

"الفاظ دقیق ...... مہر چند کھتری مہر

"اس کی زبان فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی بہتات کی وجہ سے قابلِ اعتراض تھی۔ گل کرسٹ سے لیکر ممتاز حسین صاحب کے

"ارے معاذاللہ" تک کہہ لیجیے اب نوطرز مرصع میں اردو نثر کے نئے دور کی اولین کرنوں کا جلوہ دیکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ اس میں کوئی جملہ درست ہے کہ نہیں؟

(۱) "یہ سن کر زیر لب خندہ کیا اور کہا کہ اے دائی شاید تجھ کو نیند آتی ہے۔ اس نے ازراہ عقل دریافت کر کے کہا کہ واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہنا چاہیے۔ دعا و ثنا کہہ کر اٹھی اور محل خواب گاہ میں جا کر سو رہی۔ ملکہ نے بعد ایک لمحہ کے پیالہ مانگا۔ میں نے پر کر کے دیا۔ صبح وقت شراب پی کر پیالہ میرے تئیں دینے لگی میں نے بوسہ اوپر دست مبارک کے دیا اور پیروں پر پڑا۔ نازنین صنم نے ہاتھ جھاڑ کر کہا کہ اے جاہل! بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے"

(۲) "ایک مدت پیچھے سوداگروں نے ازراہ دریا ارادہ وطن کا کیا جس وقت کہ مجھ کو کہا کہ تو بھی تیاری اپنی کر۔ میں نے واسطے رفع تہمت کے کہا مگر کس سرمایہ پر ارادہ کروں۔ بقول آنکہ ادھی پونجی خصمی کھائے۔ تب انھوں نے کہا کہ اس کفر نشاں میں کب تلک رہے گا؟ میں نے کہا خوب اگر تم ایسا ہی کہتے ہو تو ایک میں، اور ایک لونڈی، اور ایک کتا اور ایک صندوقچہ ...... یہ کچھ بساط ہے۔ میرے لائق جہاز میں جگہ مقرر کیجیو۔ میں شہر میں جا کے اور اسباب لا کے تمہارے ساتھ ہوتا ہوں۔"

(۳) "کہا کہ میں دختر وکیل مطلق بادشاہ کی ہوں۔ شب زفاف میں شوہر میرے کو درد قولنج نے لیا کہ جاں بحق ہوا۔ تو اپنی حقیقت کہہ میں نے سرگزشت اپنی بیان کی اور اس ماہ روسیمن بر کے ساتھ ہم بستر ہوا اور خوش رہنے لگا۔ الغرض ہر ماہ میں ایک مردہ آتا اور میں آزردنہ پر متصرف ہوتا تھا۔ تا آنکہ وہ سرو جویبار خوبی کی حاملہ ہوئی اور ایک طفل تولد ہوا۔ کئی ماہ اور گزرے۔ طرح محبت و مودت کی ایسی پڑی کہ باہم بہ لہو لعب خوش رہتے تھے۔ ایک روز میں نے ہم خوابہ سے کہا کہ کوئی طرح گزاری کی اس قید فرنگ سے کیا چاہیے۔"

ان تینوں اقتباسات کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کو میرامن سے ہیٹا نہ پائیے گا ملکہ کے کہنے پر کہ "شاید تجھے نیند آتی ہے؟" نوطرز مرصع میں دائی کس سلیقے سے کہتی ہے کہ ـــ" واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہا جائے۔" اور باغ و بہار میں دائی کا جواب یہ ہے کہ: "ہاں مجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے۔" تحسین کا جملہ ہے۔ "اے جاہل بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے" ـــ میرامن اسی بات کو یوں کہتے ہیں "اے جاہل ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا۔"

دوسرے اقتباس کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کا اثر اسلوب اور بیان پر صاف صاف نظر آئے گا۔ "میرے پاس کیا ہے جو اپنے وطن کو جاؤں؟ یہی ایک لونڈی، ایک کتا، ایک صندوق بساط میں رکھتا ہوں۔ اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اس کا قول مقرر کرو تو میری خاطر جمع ہو۔ میں بھی سوار ہوں۔"

میرامن کے یہاں "ایک" میں" کا ٹکڑا نہیں ہے اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس ٹکڑے نے تحسین کے یہاں مخاطب کی بضاعتی کو کیسی دردمندی کی فضا دیدی ہے۔

تیسرے اقتباس میں ہم خوابہ کیسی خوبصورت اور برمحل و مناسب ترکیب ہے۔ مردہ گھر میں تحسین نے دونوں کے تعلقات کو فطری تقاضوں کے تحت پیش کیا ہے۔

ان معروضات کی بنا پر میں یہ عرض کروں گا کہ نوطرز مرصع یقینی طور پر باغ و بہار کا ماخذ ہے۔ صرف کہانی کی حد تک نہیں بلکہ تحسین کے اسلوب بیان نے بھی میرامن کو راستہ دکھایا ہے اور یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرامن نے اس زمین کو آسمان کر دیا۔ ویسے باغ و بہار، نوطرز مرصع، اور فارسی قصہ چہار درویش کے مطالعہ سے یہ بات بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ میرامن نے فارسی قصہ کو بھی اپنے سامنے رکھا تھا اور کہیں کہیں ان کی ترتیب نوطرز مرصع سے مختلف اور اصل کے مطابق ہے۔ باغ و بہار میں آزاد بخت اور خواجہ سگ پرست کی کہانی دوسرے درویش کے قصے کے بعد ہے اور تحسین کے یہاں تیسرے درویش کی سیر کے بعد۔

باغ و بہار کا ادبی مرتبہ نوطرز مرصع[1] سے کہیں بلند ہے باغ و بہار ایک زندہ کتاب ہے اور اسی کتاب کی زندگی و پایندگی نے ہمیں نوطرز مرصع کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اکثر ادبی کارناموں کے ماخذ کم مرتبہ ہوتے ہیں مگر ان کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ وہ ادبی شہ کاروں کی بنیاد بنتے ہیں۔ حسرت کی شاعری میں رنگ کا جو احساس ہے وہ شاید مصحفی کے گہرے مطالعے کے بغیر یوں نہ ابھرتا۔ حسرت نے رنگ مصحفی کی تکمیل کردی۔ شکسپیئر کے بیشتر ڈرامے طبع زاد نہیں ہیں مگر وہ پرانی کہانیوں کے اینٹ پتھر خاک و خون اور خام مواد سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ——————

رومیو جولیٹ ——————

کی کہانی پریمس اور تھیس کی کہانی کی ترقی یافتہ شکل ہے[1]۔ اس کے علاوہ رومیو جیولیٹ کی رگوں میں قرونِ وسطیٰ کے ناکامیِ محبت کے کتنے ہی افسانے خون بن کر دوڑ رہے ہیں۔

نوطرز مرصع اور باغ و بہار کے سلسلے میں کہیں کہیں میرے لہجے میں قدرے تیزی آگئی ہے۔ جسے میں زندگی کی علامت جانتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کہیں تو اس کے لیے میں معذرت بھی کر سکتا ہوں

---

[1] بحوالہ عزیز احمد ـ مقدمہ رومیو جیولیٹ

رام پور کا ماحول شعر و سخن

راز یزدانی

دہلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا سب سے اہم دبستان رام پور ہے۔ اس کی آواز شعر و سخن کی بڑی متوازن آواز ہے۔ رام پور کے ماحول شعر و سخن کا مطالعہ کیے بغیر گویا اردو شاعری کا مطالعہ تشنہ رہ جاتا ہے راز یزدانی ہمارے مشہور اہل قلم میں سے ہیں۔ انھوں نے بڑی کاوش فنی مہارت اور دیانت کے ساتھ اس کی داستان بیان کی ہے جو داستان کے ساتھ ساتھ تجزیہ بھی ہے۔

زیر ترتیب

نگار بُک ایجنسی رامپور۔ یو پی

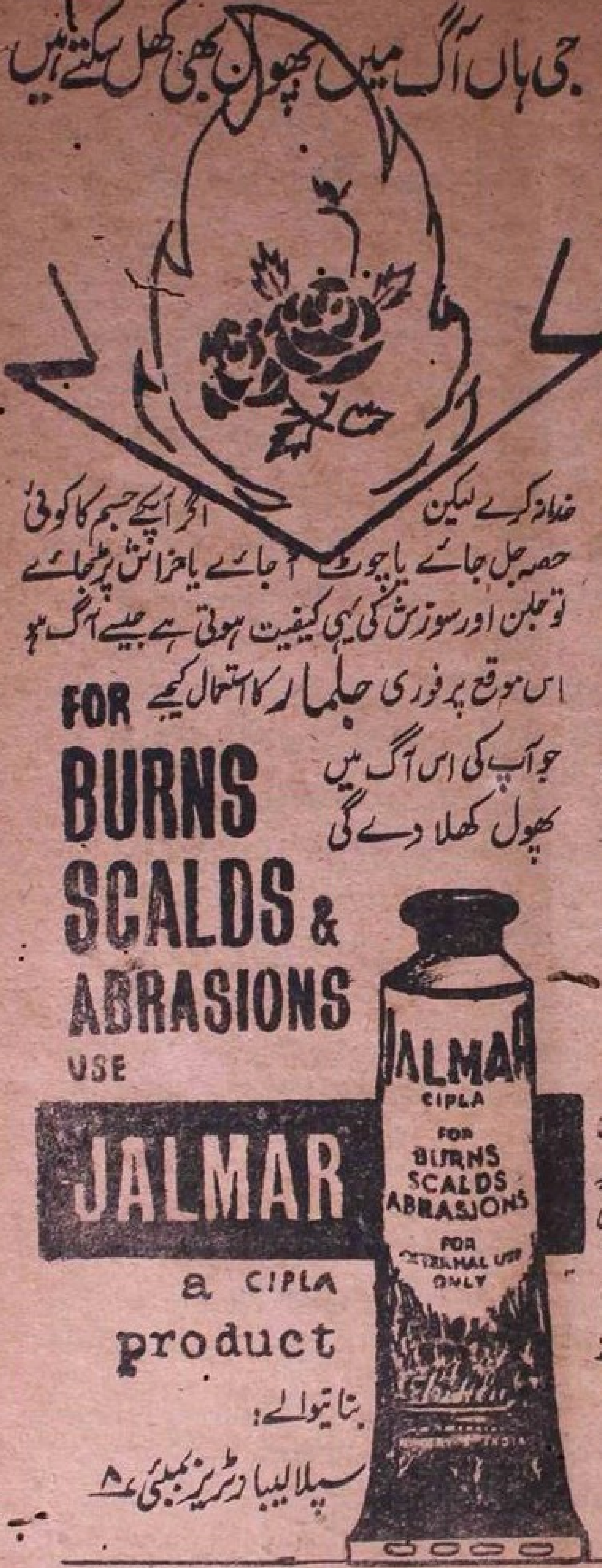

واجد علی شاہ کے زمانہ قیام کلکتہ کے بعض اہم حالات

امیر حسن نورانی

اودھ کے حکمراں نواب واجد علی شاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۶ء میں تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا، وسط ماہ مئی ۱۸۵۶ء کو شاہ ممدوح اپنے متوسلین کے ساتھ کلکتہ پہونچے اور راجہ بردوان کے محل میں قیام کیا جسے پہلے ہی مولوی مسیح الزماں کے ذریعہ کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں مٹیا برج کے علاقہ میں بڑے بڑے محل، مکانات بنوائے باغات لگوائے۔ بیس ہزار سے زیادہ ملازمین و متوسلین شاہ موصوف کے ساتھ رہتے تھے، یہ علاقہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کا نمونہ نظر آتا تھا، اور ستمبر ۱۸۸۷ء کو واجد علی شاہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ کلکتہ کے اس طویل زمانہ قیام میں جو حالات و واقعات مٹیا برج میں پیش آئے ان کو ہندوستانی اور انگریز اہل قلم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تحریر کیا ہے۔ واجد علی شاہ کے حالات زندگی پر متعدد کتب موجود ہیں اور ان میں قیام کلکتہ کے حالات بھی درج ہیں۔ لیکن کچھ حالات و واقعات اس زمانہ کے اخبارات میں بھی نظر آتے ہیں جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے شایع ہوتے تھے۔ اودھ کے باشندوں کو خاص طور سے شاہ معزول کے حالات سے گہری دل چسپی تھی۔ اس لیے ان کے متعلق اہم اور غیر اہم خبریں شایع کرنے میں ہفتہ وار "اودھ اخبار" پیش پیش تھا۔ اور اس مقصد کے لیے منشی نولکشور مالک اخبار مذکور نے مٹیا برج کلکتہ میں اپنا ایک نامہ نگار مقرر کیا تھا۔ اسی لیے ہر ہفتہ واجد علی شاہ کے متعلق کوئی خبر شایع ہوتی تھی۔

اس وقت میرے پیش نظر اودھ اخبار" مطبوعہ ۱۸۶۲ء کی مکمل فائل ہے اس کے مختلف نمبروں میں جو خاص خاص خبریں شایع ہوئی ہیں ان کو بجنسہٖ پیش کر رہا ہوں۔ ان خبروں کا تجزیہ کرنے سے شاہ اودھ کے سوانح نگاروں اور ان کے حالات سے دل چسپی رکھنے والے اہل ذوق کو کچھ نہ کچھ مواد مل سکتا ہے۔

"اودھ اخبار" کے ایڈیٹر کو شاہ اودھ سے ہمدردی ہو یا نہ ہو لیکن اخبار کا نقطۂ نظر حکومت کی خوشنودی تھا اسی لیے کہیں کہیں اخبار کا لب و لہجہ اور انداز بیان طنزیہ نظر آتا ہے۔ میں نے جنوری ۱۸۶۲ء سے نومبر ۱۸۶۲ء تک شایع ہونے والی خبروں کو ترتیب وار نقل کیا ہے۔ ہر خبر کے سلسلہ میں وہی سرخی درج کی ہے جو ایڈیٹر "اودھ اخبار" نے قائم کی تھی۔ بعض الفاظ کا املا اس طرز سے مختلف ہے جو اِس وقت رائج ہے۔ جیسے روپیہ کو روپیا لکھا ہے۔ اس کو ناظرین کاتب کی غلطی نہ تصور کریں۔ اخبار میں جس طرح تھا بجنسہٖ نقل کر دیا گیا ہے۔

شاہ معزول اودھ

مدت سے ہمارے ناظرین اخبار کو شاہ اودھ کے حالات معلوم نہ ہونے سے شاید خیالات گوناگوں گذرتے ہوں گے۔ اب اخبار حیدری مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء میں انگلشمین سے لکھا ہے کہ شاہ معزول اودھ نے بہت سے مکانات مع زمین افتادہ متصل ریچھ باغ کے خریدے ہیں اور ہزارہا آدمی سوائے اپنے ملازموں کے وہاں بسا لئے یہ لوگ اکثر جواری، تماشا بین، چور، میخوار وغیرہ ہیں۔ جس بدنام کو کہیں جائے سکونت نہیں ملتی وہ یہاں بود و باش کرتا ہے شب و روز استعمال عیوب کا دروازہ کھلا ہے اہالیان پولیس کا اس میں گذر نہیں کہ کسی طرح سیاست کریں اور اکثر مردم بدشعار سزائے عدالت سے بچکر اس جگہ پناہ گیر ہوتے ہیں کئی لاکھ روپیہ قرض شاہ ممدوح پر ہو گیا ہے۔ اور خرچ اس قدر زیادہ کہ آیندہ کو قرض ملنا ممکن نہیں میجر ہربرٹ صاحب ہمیشہ ان کو فہمایش کرتے ہیں مگر کچھ اثر پذیر نہیں۔ صاحب کمشنر کی تجویز ہے کہ ایک چوکی پولس کی ریچھ باغ میں مقرر کی جائے اور اس کا خرچ وہاں کے باشندوں سے وصول ہو۔ بالفعل ہم سپاہی اور افسر وہاں رہتے ہیں مگر وہ فقط حفاظت راستے کی کرتے ہیں مداخلت اُنکی

اندر باغ کے بالکل نہیں لفٹنٹ گورنر نے نواب گورنر جنرل کو لکھا ہے کہ وہ شاہ مذکور کو ہدایت کریں کہ بدچلن اور بدوضع آدمیوں کو اپنے مکان سے نکال دیں یہ بھی سنا گیا کہ ایک جماعت مفسدوں کی جو فساد ایام گزشتہ اودھ میں شامل اور ممد و معاون تھی اور معافی نامے کی رو سے بری الذمہ ہو گئی وہ سب آنجماب پھر بادشاہ کے نوکر ہوئے ہیں۔ فقط

صاحب اخبار حیدری نے جو کچھ کہ شاہ معزول اودھ کی نسبت تحریر فرمایا یہ تو ہزاروں میں سے ایک شمہ بھی نہیں اندنوں بضرورت بعض امور کے راقم اودھ اخبار کا کلکتہ گیا تھا جو کچھ لکھنؤ کے باہر سن کر خیال کرتا تھا کہ ع باطل است آنچہ مدعی گوید ؎ وہ سب آنکھوں دیکھا متواتر سنا اور ان سماعی باتوں کے لاکھوں قرینے حضرات رفقائے شاہ معزول اودھ اور خود حضرت شاہ کے دیکھے کہ ایسے امور لغو و نالائق حرکات درج صحیفہ کرنا عار معلوم ہوتا ہے۔ ایک شمہ یہ ہے کہ حضرات رفقائے حضرت اودھ کو ایک گلا دیچلا بنا رکھا ہے جس طرف چاہا پھیر دیا۔ صدہا فاحشہ عورات رذیل قوم کو پیشکش شاہ دیگر ابنار سوخ ظاہر کرتے ہیں اور روز دس بیس محل کی متعہ اور نکاح سے بھی بھرتی ہے موچی کہولے کے مقام گاہ میں حضرت کی وجہ سے روز رندانہ جلسے رہتے ہیں حضرت شاہ کی مری مٹی کو خراب کرتے ہیں کسی نے کوتاہی نہیں کی لاکھوں روپیہ کھا گئے شاہ کے سر پر قرض اس قدر ہو گیا ہے کہ عمر بھر مخلصی ممکن نہیں وہاں کے سرخیل نالائقان ایک حضرت نے بادشاہ کو اس طرف اپنا مطیع کیا ہے کہ خود شاہ اودھ ہو رہا ہے وہاں کے بنگالیوں اور مؤسلائے موچی کہولے سے مکانات کرایہ لے کر بادشاہ کو دھوکا دیتے ہیں کہ حضرت سلامت یہ مکان مول لیا گیا اس قدر روپیہ چاہیئے اسیطرح مکانات کی قیمت وصول کر کے صرف کرایہ پر مالکوں سے اس مکان کو لیتے ہیں۔ سوا اس کے عجیب عجیب حرکات نالائق ایسے مشہور ہیں کہ ہماری تحریر کی چنداں حاجت نہیں۔ راقم کلکتے ہی میں تھا سنا کہ ۳ دسمبر کو ایک فہمائش نامہ جناب گورنر جنرل بہادر کشور ہند سے معرفت جناب میجر ہربرٹ صاحب کے خدمت شاہ معزول اودھ میں ارسال ہوا اس کے مضمون کا انتخاب یہ سنا گیا کہ خواب غفلت سے جاگیے ورنہ آپ کے ہاتھ پکڑ کر قید حرام کی جائیگی نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند جملہ حرکات سے مطلع ہوئے ہیں۔ تمہاری نالائق شکایتوں کو سن کر کانوں میں درد پیدا ہوا۔ دل میں جگہ نہ دی مفت میں تمہارے نالائق مصاحب جہنم کی راہ بتانے والے ایکدن ہٹائیں گے۔ اور نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ایسا بھی فرماتے ہیں کہ ایسے ایسے نالائق حضرات جو اغواکنندہ حضرت ہیں ان کو نواب معتمد الیہ کے ملازمان درگاہ خوب جانتے ہیں فقط۔ اسی طرح بہت کچھ لکھا تھی مگر وہاں کے شیاطین طینت جو حضرت کو راہ راست سے کوسوں دور رکھتے ہیں انکی روش کو خراب کرتے ہیں اکثر حضرات نے مشہور کر دیا ہے کہ ہم نے روپیے خرچ کر کے ایسا بندوبست کر دیا کہ مبشر حالات گورنمنٹ کی منشا کے جلد ہو جاتے ہیں اور ہم اس کا تدارک اوپر ہی اوپر کر سکتے ہیں اس بہانے سے بھی لاکھوں روپیے بنام بہادر رشوت کہ فلاں صاحب کو دیں گے۔ فلاں صاحب نے وعدہ کیا ہے لیتے ہیں اور خود نقد روپیہ ہاتھ نہیں آتا تو اسم فرضی پر تمسک لکھوا کر جھوٹا قرض اپنا اپنا کثیر الیا ہے اور شاہ کو اس قرضے سے دبائے ہوئے ہیں حضرت اس خوف سے نہایت مضطرب رہتے ہیں۔ ہمارے ایک عنایت فرمانے وعدہ کیا ہے کہ ہفتہ وار حضرت کے حالات سے مطلع کرتے رہینگے فقط۔ (اودھ اخبار مطبوعہ ۸ جنوری ۱۸۶۷ء صفحہ ۲۵، ۲۶)

شاہ اودھ

اودھ گزٹ سے معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ شہر کلکتہ مقام مٹیا برج میں ایک بڑا مکان تعمیر کراتے ہیں اور کے وہاں مکان بنوانے سے گرد نواح کی رعایا کو بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ اور دوسری تکلیف یہ ہوئی کہ کاشی پور میں جو ولیعہد بہادر نے مکان بنوایا وہاں کی رعایا کو بھی نہایت تکلیف ہوئی سرکار اس کو خیال فرمائے۔ (اودھ اخبار مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۴۴)

شاہ اودھ

شاہ اودھ نے درخواست اپنی پنشن اور ضبطی ملک اودھ ۱۸۵۹ء تک دی صاحب آف اسٹیٹ انڈیا نے منظور نہ کی اور لکھا کہ

آج تک شاہ اودھ نے قبول نہ کی اب اس روپیے کے مستحق نہیں۔ فقط (اودھ اخبار مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۶۸)

شاہ اودھ

لبکہ حضرات اوباش شیوت کا بیشہ موچی کھولہ قیام گاہ حضرت شاہ اودھ میں جماؤ تھا اور اس وجہ سے اکثر حکام متعلقان سے شکایت بدوضعی تا حضور نواب گورنر جنرل بہادر پہونچی تھی۔ چنانچہ واسطے اصلاح بعض بعض خرابیوں کے نیجر ہربرٹ صاحب ایجنٹ گورنر جنرل کا اجلاس موچی کھولے میں ہوا کرے گا اور اسی جگہ پر صاحب ممدوح تشریف رکھیں گے۔ ایک داروغہ پولیس بھی مقرر ہوئے لہٰذا اب چوری کثرت سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ اودھ کے دل افروز محل کے بطن مبارک سے دختر زہرہ جبیں تولد ہوئی دایہ ہرکارہ وغیرہ خار کش کو خلعت عطا ہوئے۔ شاہ اودھ کو کمال ملال ہوا۔ کیونکہ حضرت نے بتوقع تولد فیر اوج اقبال سلطنت کے ہزار ہا روپیے کا سامان مہیا فرمایا تھا مگر قسمت۔ (اودھ اخبار مطبوعہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۳ء صفحہ ۱۸۴)

"انتخابات اخبارات"

شاہ اودھ

لبکہ حضرات رفقا اور ندما کی عنایات سے حضرت محتشم الیہ کا نہایت درجہ حال پتلا ہو چلا تھا ہر ایک متنفس نے جو ذرہ بھی دخیل ہو گیا بادشاہ کو دھوکا دے کر لاکھوں کے قرض جھوٹ موٹ لکھوا لئے۔ اور پھر بادشاہ کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ غرض ایسی ایسی حرکات سے شاہ ششدر میں تھے۔ اور بیشتر عدالت کے ضوابط سے ایک نوع کی نگہداشت حفاظت تعظیم شاہ محتشم الیہ میں چنداں لحاظ نہ رہا۔ اگرچہ اُن حضرات رفقا اور ندما کی بے اعتدالیوں سے اس طبقے بھر میں حمیت کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اور یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سے مقدمات خفیفہ کے واسطے شاہ محتشم الیہ کے دستخطی مختار نامے کہ جن کے عنوان کی عبارت میں بیشتر یہ تھا (منکہ واجد علی سابق شاہ اودھ ام الخ) پھر ہمارے ناظرین اخبار ملاحظہ فرماویں کہ کہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ ہر چند اکثر دل جلے یا صاحب دانش و فرہنگ ایسا کہہ سکتے ہیں کہ جب تخت و بخت جاتا رہا تو پھر کونسی منزلت باقی رہی۔ مگر نہیں یہ شاہ محتشم الیہ کے رفقا اور ندما کے حسن لیاقت کا اظہار ہے ورنہ عرصہ تک خاندان تیموریہ کے مراتب کی نگہداشت کیسی رہی اور کس داب سے زمانے کے اتفاق تک اتفاق کیا گر لبکہ سرکار انگریزی کی ہر ایک امور میں جہاں بلند نظری کام کرتی ہے اس جگہ کچھ یہی ضرور نہیں ہے کہ کوئی درخواست ہی دے تو یاد آوے بلکہ داب سلطنت شاہنشاہی کہاں جاتا ہے۔ اندنوں بنظر حفاظت منزلت و مراتب شاہ اودھ کے ایک خاص قانون اجرا ہوا جس سے ہر عنوان سے شاہ محتشم الیہ کی حفاظت کی مگر ایک بڑی آسایش اس ایکٹ کے جاری ہونے سے ہوئی اور وہ یہ ہے کہ اب کوئی قرضہ شاہ موصوف کو نہ دے گا۔ کیا معنی کہ جب قرضخواہ کا زور عدالت جاتا رہا۔ تو پھر قرضے کے وصول کی تدبیریں خیر بہر حال مقام شکر کا ہے کہ جب کوئی قرضہ نہ دے گا تو بادشاہ اسراف بھی نہ کر سکیں گے۔ تو اس صورت میں یہ نتیجہ نکلا کہ اپنی زندگی بھر آسایش پائیں۔

ایکٹ نمبر ۸ سنہ ۱۸۶۲ء

ایکٹ برائے نگہداشت منزلت ذاتی شاہ اودھ

ہرگاہ بموجب اس اقرار کے جو کہ منجانب سرکار انگریزی شاہ اودھ سے کیا گیا تھا واسطے قائم رکھنے شاہ موصوف کی منزلت ذاتی کے یہ قرین مصلحت ہے کہ شاہ موصوف عدالت ہائے دیوانی اور محکمجات مال اور فوجداری کے احاطہ اختیار سے کسی قدر مستثنیٰ ہوں لہٰذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۔ ازروئے دفعہ ہذا کے شاہ اودھ اختیار عدالتہائے فوجداری سے باہر قرار دیئے گئے ہیں۔ اور باہر ہیں مگر بجز ان جرموں کے جن کے واسطے بموجب مجموعہ تعزیرات ہند سزائے موت مقرر ہے اور واضح ہو کہ جرائم مذکور کے سوا کوئی عدالت فوجداری یا مجسٹریٹ اختیار کسی نالش کی تحقیقات کا جو بنام شاہ موصوف ہو یا صدور کسی حکمنامے کا بنام انکے نہ رکھے گا۔

دفعہ ۲۔ کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر بلا وارنٹ کے شاہ موصوف کی گرفتاری کا اختیار نہ رکھے گا۔ اور کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر عام اس سے کہ کسی وارنٹ

کے اجرا کے واسطے مامور ہو یا نہ ہو مجاز نہ ہوگا کہ بغرض گرفتاری کسی شخص یا تلاشی کسی شے کے ایسے مکان کے اندر جو کہ اس وقت مسکن شاہ موصوف ہو بجز موجودگی اور اجازت اس عہدہ دار کے جو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے شاہ موصوف کے پاس بطور ایجنٹ مقرر کیا جاوے داخل ہو یا اس مسکن میں ٹھہرے۔

دفعہ ۳۔ اگر کوئی نالش یا اطلاع نسبت شاہ موصوف بابت کسی ایسے جرم کے جو جرائم متذکرہ دفعہ اول ایکٹ ہذا سے خارج ہو گذرے تو جو عہدہ دار کہ شاہ موصوف کے پاس بعہدہ ایجنٹ متعین ہو اُسے اجازت ہے کہ مقدمے کی تحقیقات کر کے کیفیت اس کی نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجے اور نواب محتشم الیہم با اجلاس کونسل بر وقت پہنچنے اس کیفیت کے اس جرم کے تجویز کے واسطے کمیشن مقرر فرما دیں اور اُس کمیشن کو کوئی اختیار منجملہ اُن اختیارات کے جو کہ از روئے مجموعہ ضابطہ فوجداری کسی عدالت کو حاصل ہیں۔ اس باب میں عطا کریں۔ مگر ملحوظ رہے کہ در صورت ثبوت کے اہل کمیشن مذکور کو اختیار صدور حکم سزا کا نہ ہوگا۔ لیکن اپنی رائے سے نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کو مطلع کرنا چاہیے۔ کہ نواب محتشم الیہ درباب حراست ذات یا نیلام جائداد شاہ موصوف کے یعنی جیسا کہ بحسب صورت مقدمہ ضروری متصور ہو حکم صادر کریں گے۔

دفعہ ۴۔ کوئی رٹ یا حکمنامہ نسبت ذات یا مال یا جائداد شاہ موصوف کے کسی عدالت دیوانی یا محکمہ مال و فوجداری سے کسی وقت صادر اور عمل پذیر نہیں ہو سکتا ہے۔ الا اس صورت میں کہ اسکی بابت پیشتر منظوری نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی حاصل کر کے منگائی گئی ہو اور وہ منظوری مصدقہ بدستخط سکریٹری گورنمنٹ ہند ہو۔ اور جو رٹ یا حکمنامہ بلا حصول ایسی منظوری کے شاہ موصوف کی ذات یا مال یا جائداد پر کسی وقت صادر یا عمل پذیر ہو وہ بالکل باطل اور ناجائز ہوگا۔

دفعہ ۵۔ شاہ موصوف کسی عدالت میں یا روبرو کسی اہل کمیشن کے جو کسی عدالت سے مقرر ہو واسطے دینے اظہار یا اظہار حلفی کے جب کہ وہ کسی مقدمے یا کارروائی مرجوعہ عدالت دیوانی یا محکمۂ مال فوجداری میں مطلوب ہو اصالتاً بطور گواہ حاضر نہ کرائے جاویں گے۔

دفعہ ۶۔ درصورتیکہ شہادت شاہ موصوف کی ایسے مقدمے یا کارروائی میں مطلوب ہو تو عدالت یا وہ شخص جو چاہتا ہو سوالات تحریری واسطے اظہار شاہ موصوف کے مرتب کرے اور جو مقدمہ یا کارروائی اس قسم کی ہو کہ کوئی فریق ثانی قانوناً مستحق سوالات تردیدی کا ہو تو وہ بھی مجاز طیار کرنے سوالات تردیدی کا ہوگا اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی ایجنٹ حاضر باش شاہ موصوف کے پاس بھیجے جاویں گے اور وہ اونھیں شاہ موصوف کو دکھلائے گا۔ اور اُن کے جوابات باقرار صالح قلمبند کرے گا۔ بعد ازاں سوالات مذکور اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی مع جوابات کے اُسی عدالت میں واپس بھیجے جائیں گے کہ جس میں مقدمہ یا کارروائی مذکور دائر ہو اور اس کے ساتھ ایجنٹ مذکور اپنا سارٹیفکٹ بایں مضمون کہ جوابات حسب ضابطہ لیے گئے ہیں معطوف کرے گا۔

دفعہ ۷۔ جس وقت کہ نسبت اظہار حلفی کے شاہ موصوف کا حلف کسی مقدمے یا کارروائی میں لینا مطلوب ہو تو وہ اظہار اور حلف روبرو ایجنٹ مذکور کے لیا جائے گا۔ اور ایجنٹ مذکور اس اظہار کو مع سارٹیفکٹ اس امر کے کہ اس کی نسبت حلف حسب ضابطہ کیا گیا اس عدالت یا حاکم کے پاس جس کے روبرو مستعمل ہونے والا ہوگا بھیج دے گا۔

دفعہ ۸۔ جس وقت شاہ موصوف سے سوالات کے جواب یا حلف نسبت کسی اظہار کے حسب احکام ایکٹ ہذا لیا جاتا ہو کوئی دوسرا شخص بجز ایجنٹ مذکور الصدر کے سوائے اس صورت کے کہ خود شاہ موصوف اجازت دیں مجاز حاضر ہونے کا نہ ہوگا۔

دفعہ ۹۔ جواب سوالات کے یا اظہار حلفی شاہ موصوف کا جو کہ بموجب احکام ایکٹ ہذا قلمبند ہوئے ہوں یا جس کی نسبت حلف کیا گیا ہو بطور شہادت منظور ہوں گے۔ مگر جو اعتراضات کو جوابات یا حلف مذکور کی نسبت سر اجلاس عدالت یا معرفت کمیشن کے ہو سکتے صورت میں ہوتے وہی صورت متذکرہ بالا میں بھی ہو سکیں گے۔

دفعہ ۱۰۔ ایکٹ ہذا بعد وفات شاہ موصوف کے نافذ نہ رہے گا۔ فقط۔

(ماخوذہ اخبار مطبوعہ، مئی ۱۸۶۲ء صفحہ ۳۱۲ ، ۳۱۴)

خدا مہربان تو کل مہربان

مصحفیؔ جب مرے ایام برے آئیں گے ؛؛ بن بلائے میرے گھر آپ چلے آئیں گے ۔

مکرم خاکسار صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار فیض بار ہفتہ ماضیہ میں نظر راقم سے وہ سرکلر گذرا جو مجوزہ جناب مسٹر سیسل بیڈن صاحب ممبر کونسل حرفاً حرفاً پیشگاہ نواب گورنر جنرل باجلاس کونسل ہے در باب حفظ مراتب شاہ مظلوم اودھ کے منظور ہوا جسکے منشا کا یہ انتخاب ہے کہ باستثنائے جرم مستلزم القصاص کے اور نالش کسی قسم کی شاہ موصوف پر نہ دائر ہو نہ کوئی عدالت مجاز سماعت ہے ۔ نہ شاہ کی گرفتاری جائز اور امور واجب الاستفسار بذریعہ صاحب ایجنٹ حاضر دربار شاہ موصوف کے اونسے دریافت کیا جایا کریں گے ۔ سبحان اللہ کیسے نیک نیت پاک طینت ممبر اور حاکم ہیں کہ گئے گذرے زمانے پر حفظ مراتب شاہی کو مرعی فرماتے ہیں بعد شکر خالق کے ان اصحاب و سیبرلئے اور گورنمنٹ کی نیک نیتی اور پاسداری حق بجانب قابل ہزار تحسین اور صد ہزار آفریں کے ہے ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ؛؛ چرا نباشد گوے لیا مگر سرکار ہی کا بخت تاج و تخت ہے ۔ گورنمنٹ ہی کو ان کی لاج ہے مردہ بدست زندہ مردانگی اور سیر چشمی اسی کا نام ہے نیت شاہانہ پادشاہوں کا کام ہے ۔ جہانتک یہ قواعد مجوزہ تجویز ہوئے بہت انسب میں آئندہ کو شاہ مظلوم اپنے بدخواہ ملازم شکم پرور مطلب آشنا کے فریب اور دغا سے بجگر حیات مستعار اپنی سلامتی اور عافیت سے گذرانیگے ۔ مگر چند امور گزشتہ اور بھی جن کی ترمیم و تجویز از ہمہ مقدمات ہے و اجب الاصلاح ہیں ورنہ یہ تپ دق قرض اور تباہی جو عارض حال شاہ ہے دفع نہوگی وہ بیان کرتے ہیں تاکہ گورنمنٹ وہ بھی تجویز فرماکر نافذ اور بطور تتمہ سرکلر کے قائم فرمائے و ہو ہذا ۔

تن پرور بدخواہ مفسد بندۂ غرض عیار مکار ملازمان شاہی نے جن کو شاہ موصوف کی بے زبانی اور مجبوری سے جو بقول جعفر (البادشاہ کا ل زبان) عادت شاہی کے مزاج شاہی میں درخور اور انکے حزو و کل پر محیط ہیں واسطے حاصل کرنے زر خطیر کے کارخانہ یا نام نہاد شاہی یا کارخانہ و خرید و غیرہ شاہی کے لفظ جنس سوداگر اور مہاجنان کلکتہ سے اصل قیمت سے چارگونہ بلکہ دہ گونہ قیمت پر اپنا حصہ ٹھہرالیا اور مجکمے سے نام کو پیروی کر کر نالش سے شاہ پر ڈگریاں کرادیں اور رقعہ تمسک لکھدیئے ۔ اس میں آپ تو فاقہ مستی سے بچے قارون بن گئے مگر شاہ بیچارہ بیخبر و غافل کا قتل ہو گیا لوٹ لے اور کوٹھی جو خریدی اور سود لوٹ بھی اپنے نام کرالیے اور اس میں لاکھوں روپیا شاہ پر اپنا فاضل نکالدیا دیکھو ایک تو سلطنت اور دولت گئی دوسرے مال متاع جو تھا وہ نیلام ہوا اس پر ڈگریاں بھی ہو گئیں اب شاہ میں صرف یک بیتی و دو گوشت و استخوان پوست باقی رہ گیا ہے سو یہ آدم خور بد خصال اب استخوان خوری دشمنان شاہ کیواسطے ہا بلکہ وہ بھی چکھنے کو تیار ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین استغفر اللہ و لاحول ولا ۔

اندریں حالت ایک کمیٹی چند حکام و سوداگر انگریز و دو ایک معتمد شاہی جو دل سے درد مند و دلسوز شاہی ہوں اور متدین بشرکت صاحب ایجنٹ کے مقرر ہو کر جو قرضہ شاہی ہے اور جس کی ڈگری ہو چکی اور جس جس کا دستگرداں یا رقعہ یا تمسک کی بابت ہے اور جس کی قسط بندی بھی ہو گئی عام اس سے کہ قارض ملازم شاہی ہو یا اسم فرضی یا بازار کا سوداگر یا مہاجن وغیرہ پس قیمت اشیا رجو واجب و عین المال ہے ۔ اس کی اصل قیمت قائم کر کر اس قدر مسلم رکھا جاوے باقی بدر اور منسوخ تخمینہ لاگت عمارات کا بھی بمعیت کمپنی و صاحب انجنیئر کے ٹھیک ٹھیک لگا کر حساب شاہی سب گاؤ خورد کر کر اوسیکو مسلم کر و اگر اس کل قرضے اور فاضل کی میزان کر کر منجملہ لاکھ روپیہ تنخواہ شاہ کے جس میں سے وہ ماہانہ قسط قرضہ ادا کرتے ہیں ۔ مگر خائن غابن اہلکار آپ ہی شیر مادر کر جاتے ہیں ہر قرضے کی قسط بندی مقرر کر کر بآسانی ادا کرادیا جاوے ۔ اور آئندہ کو ممانعت ہو کہ کوئی نقد و جنس قرض نہ دے ورنہ نالش اس کی سماعت نہ ہوگی ۔ اسمیں تغلب سب نکل جاوے گا ۔ بلکہ چھٹی کا دودھ بھی حرام خوروں کا لبوں پر آوے گا سب قارض کی حق رسی ہو جاوے گی سب سرکار کے مشکور ہونگے ۔ اور شاہ پھر کوئی دن زندگی کا چین اور استقلال سے گزرائیں گے ۔ اگر یہ نہوا تو پچھلے قرض اور رقعہ اسد ڈگری میں ان کا کام تمام ہو جاوے گا ۔ اور ہو گیا ہے قابل شرکت کمیٹی بخیر دیانت الدولہ کے کہ واقعی اسم با مسمیٰ شخص یکرنگ و ایماندار ہے اور مطلع صاف ۔

ملازم شاہی میں کئی بڑے آدمی ایسے ہیں جنکا حکم سرکار سے اخراج کا ہے مگر حیلہ حوالے سے ابتک شاہ کا پیچھا نہیں چھوڑتے دہی برباد اور بدنام کرتے ہیں اونکی بد وضعی بدمعاملگی او بداشی نمک حرامی زمین سے آسمان تک روشن ہے وہ بھی مردود و مخرج ہوں غرض شاہ کو ایک ایسا مسہل دیا جائے جس سے یہ سب سدے دور ہو جاویں جب تو مرض کہنہ کو شفا ہوگی ورنہ نیم حکیم خطرۂ جان ہے۔

ساتھ اس کے علاوہ باہر کے قرضخواہوں کے شاہ کا حساب لاکھوں روپیہ کے مال خانے اور توشہ خانے اور نقد و جنس وغیرہ کا جو اونکی اہالی سے متعلق ہے بحضور کمپنی، صاحب ایجنٹ وغیرہ اونسے سمجھا جاوے (یہ بھاری کا چوہا جب ٹھنڈا اور خوش مزاشفاف پارہ دیکھ کر پی جاتا ہے پھر اس سے ہلا نہیں جاتا) غرض مال مست لوگ کھا کھا کر ایسے بھاری ہو گئے ہیں کہ مثل قارون کے زمین کے بیخ ہو گئے۔ نکالے سے بھی نہیں نکلتے شاید نیچے سے سرنگ لگے تو اوڑ جاویں مگر کھایا پیا سب خاک میں مل جاوے گا۔ چاہیئے کہ پہلے اونکا حال قال پوریا بدھنا سنبھال لیا جاوے ہند کے باشندوں کا تو خیریت سے کہیں زمین کے پردے پر کھوج بھی مل جاویگا۔ اور جو حال کے مچھلی ہے وہ اگر کہیں کشمیر کے ڈل میں غوطہ لگا کر سون کھینچ گئی تو ہزار ہا اچھی جال ڈالیں اور نہایو اور دہیان سو پکاریں مگر خبر بھی نہ ملے گی خبر شرط ہے۔

(تنبیہ) اب ایک اندیشہ باقی رہا کہیں گیہوں کے ساتھ گھن نہ پس جاوے یا لیے کے ساتھ کوئی گوشت کا ٹکڑا جان کر شلغم نہ کھا جاوے اس واسطے ہم سب اصحاب کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس حساب کتاب اور تغلب اور بدر میں کہیں بیچارے منشی صفدر صاحب کا کچھ یہ بیا یا حساب کتاب جو قریب ۲۰ لاکھ وہ اپنا ذمہ شاہ کے بتاتے ہیں نہ مارا جاوے (راے صاحب اودہ اخبار میں ایک سوال کے جواب میں بڑے شش و پنج میں ہوں یعنی ایک بزرگ مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کہ شاہ معلوم تو بے زبان ہیں۔ یہ منشی صفدر صاحب لسان السلطان کہاں ہو گئے آپ بڑے زبان آور ہیں اور سائل زبان دراز اب براہ زبان دانی ضرور ایک جواب دندان شکن ایسا دیجیے کہ زبان زد ہو جائے اور پھر سوال سائل زبان پر نہ آئے جراحات السنان لہا التیام ؛ و لا یلتیام ماجرح اللسان تا لوگ آپ کو مجیب کہیں اور جواب کو عجیب آمین یا مجیب الدعوات آمین ؛

چند اصحاب یہ بھی متفسر ہیں کہ منشی صاحب بے نشان لامکان تھے صرف سے رکے نواب منور الدولہ کے نوکر رہے اونکی جہت سے دربار شاہ تک راہ پائی اور کوئی کارندہ نہ تھا ذوالفقار الدولہ کی ناکاروائی اور کاہلی نے انکو محیط اور قابو یافتہ کر دیا وہ بیک بینی و دو گوش آئے تھے اب لاکھوں کے آدمی کہاں سے ہو گئے۔ جن کا ۲۰ لاکھ بادشاہ پر فاضل ہے جس کے وہ شاہ سے دعویدار ہیں اور چند کوٹھی اور نوٹ شاہی اپنے نام سے لیے اور عدالت میں آپ کو سوداگر لکھاتے ہیں نام ملازمت شاہی سے یہ عار ہے انکے پاس یہ دولت کہاں سے آئی۔ کشمیر کے سوداگر اعلیٰ تو پشمینے کے ہیں اور ادنیٰ پشمینہ باف اور سب پٹو فروش یا کاتب یا ماہی گیر، باقی اس سرد ملک سے اگر ایک وقت کھانے کو ملے تب بھی باہر نہیں آتے۔ منشی صاحب یا انکے بزرگ کس چیز کے سوداگر تھے ایک سوداگر کا اور فرقہ بھی ہے جو کابل ایران لاہور شملہ کلکتہ تک ہوتی ہے۔ سبحان اللہ دولت حسن بھی کیا چیز ہے ہم اس کے جواب سے بھی قاصر ہیں۔ عقل کام نہیں کرتی مگر ہم اس قدر رائے دیتے کہ منشی صاحب یہ کہدیں کہ ہم نے منور الدولہ سے نیکیر صرف کیا تھا اور پھر جیسے سے لو اگر مٹھ رہیں ورنہ کشمیر لے گئے تو وہاں علمداری جس بیدار مغزکی ہے ظاہر ہے وہ نہ ہو کہ ع زر زر کشند در جہاں گنج گنج۔

پھر ایسا او ان تہ لگے گا حضرات کشامرہ کی وفاداری اور شرافت اور خوبیوں کی ایک کتاب منشی صاحب نے تالیف کی ہے خداوہ صحیفہ ہم پر نازل کر دے تو ہم بے نقط تفسیر اس کی لکھیں جس سے سب کو عبرت ہو اور حیرت ع۔ من خوب مے شناسم البلیں بے وفارا فقط

راقم کلمۃ الخیر (اودہ اخبار مطبوعہ ۴ جون ۱۸۶۲ء صفحہ ۳۷۵ لغایتہ ۳۷۷)

کوائف شاہ اودھ

نامہ نگاران اخبار نامہ اودھ گائیڈ مقام موچی کھولہ سے ایسا لکھتے ہیں کہ یہ سراپا نیاز عرصہ دراز ہوا کہ آپ کی طرف سے اس بات کا مجاز ہے کہ گاہ گاہ بارگاہ سلطانی کے اخبار کہ سلطان الاخبار ہے آپ کی خدمت میں لکھا کروں مگر کثرت کار و ہجوم افکار سے مجھکو

دشوار ہے اور نہ لکھنا ناگوار چار و ناچار یہ چند سطور مسطور ہوتی ہیں امید کہ شرف قبول پائے اور آپ کے پرچہ اخبار میں چھپ جائے۔ کئی سال سے یہ شکستہ بالی یہاں کا حال بریں منوال دکھتا ہے کہ بہت سے دولہ جمع ہوکر کچھ میں لوں کچھ تو لے کر رہے ہیں اور دولت خانہ سلطانی کو خالی کر کے اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ انھیں کارندوں کے کردار سے یہ سرکار عالی وقار گورنمنٹ انگلشیہ کے دربار میں غیر منتظم اور غفلت شعار ٹھہرائی گئی اور ایک عالم میں اس سلطان عالم کی بدنامی ہوئی خلق نے ناحق اس شاہ بیگناہ کو بدنام کیا اور اُن کو چھوڑ اِن کو الزام دیا ان پر الزام اس وقت لاکلام ہوتا کہ ان کا کوئی حکم باعث خلل نظام ہوتا سو حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر کام کا انتظام اس کارخانہ کے مدار المہام کے ید اقتدار میں دیا ہے اور اپنے کو اس کے خیر و شر سے بری کیا ہے کسی طرح کا دین لین اپنے ذمہ نہیں لیتے اور کسی تمسک اقرارنامے یا حسابات کارخانجات پر دستخط نہیں کرتے ہم ان کو غافل تب کہتے کہ قبالجات پھیر نہ لیتے اور پرامیسری نوٹوں کا معاملہ بے تصفیہ چھوڑ دیتے اس کا قصہ یوں ہے کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپئے اپنے کارندوں کو حوالے فرمائے۔ کہ کئی قطعہ مکان بنام بندگان عالیشان سلطان مول لیویں اور قبالجات داخل خزانہ سلطانی کردیویں مگر اُن کارندگان خوش اطوار کے کردار سنئیے کہ چند کوٹھیاں تو خرید کیں مگر قبالجات احمد محمود کے نام لکھوا لیے اور بادشاہ سے یہ کہدیا کہ پیرومرشد خانہ زاد نے حسب فرمان واجب الاذعان مکان مول لیا اور غلامان شاہی کا اس پر قبضہ کر دیا باقی رہا قبالجات سو بعض ضروریات کے سبب بندے کے ہاتھ میں ہیں۔ اب یہاں ہوشیاری و دانش شعاری اس بادشاہ خجستہ اختر مروت پیکر کی سنئیے کہ اُسوقت کثرت مروّت اور شدت رافت سے چپ رہ گئے اور بھولے بنکر درگزر فرمایا اور ایک عرصہ دراز تک خاموش رہ کر رنگ دیکھا کئے آخر جب دیکھا کہ یہ لوگ تمام ہضم ہی کرنے کی فکر میں ہیں تب کچھ بار بطور تذکار اُن قبالجات کو پوچھا نوٹوں کا ذکر کیا مگر انھوں نے مال مردم خوری کے طریقے سے سمجھا دیا اور ایک پرزہ نہ دیا تب تو بادشاہ نے تنگ طلبی کی اور جس طرح بن پڑا قبالجات کو بدلوا اپنے نام کرلیے اور نوٹ جو زر جو دیکھتے وہ لے لیے جو عدم اطلاع میں سلطان عالم کے بک گئے وہ واپس آنے والے ہیں اب دیکھیے کہ یہ ہوشیاری ہے یا غفلت شعاری بیدار مغزی ہے یا ناتجربہ کاری۔ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے بمقتضائے اتحاد اور اسی وجہ بیدار مغزی کے بادشاہ کو مواخذہ دیوانی و فوجداری سے بری الذمہ کیا کہ جی کھول کے ایسے معاملات کارندوں سے سمجھ لیویں لیکن مفصل معلوم نہیں کہ اصلاح ان امور میں کون کارندہ ذریعہ خیر خواہی ہوا۔ آئندہ جو دریافت ہوگا عرض کریں گے فقط

دوربین

(اودھ اخبار مطبوعہ ۲۵ رجب سنہ ۱۲۶۲ھ صفحہ ۴۲۵)۔

"دیوان افسر" بقیہ صفحہ ۱۳

یہ تو بتا کہ ابلیس نے آکر ذقن غیبت گو

قطعات ۶ ہیں: ۱۔ نعت و منقبت۔ ۲۔ تہنیت جلوس فتح الدولہ (غازی الدین حیدر) ۳۔ تاریخ غسل صحت سعادت علی خاں (مادہ "نہایا بتایید سبحان پاک وزیر الممالک میاں دوعید": ۱۲۱۸) ۴۔ تاریخ وفات مفتی غلام حضرت (مادہ "روح نے خلد میں کیا ہے مقام: ۱۲۳۵) ۵۔ تاریخ ٹھاکر دوارا لالہ فتح چند و لچھمن رام "فیض مجسم ٹھاکر دوارا" (۱۸۷۱ سمبت) ۶۔ قطعہ تاریخ وفات مصحفی۔ رباعیاں جن میں ایسے دوبیتی قطعے بھی شامل ہیں جن کی بیت اول مصرع ہے ۱۳ ہیں۔ دو رباعیاں یہ ہیں:

افسر غم عشق دل سے کھونا معلوم
جی وصل صنم سے شاد ہونا معلوم
مثل شب ہجر عمر رقت میں کٹی
آرام سے غیر مرگ سونا معلوم

ہمبزم کی تیرے بات ہم نے کاٹی
یا خیمے کی شب قنات ہم نے کاٹی
بد بر ہوا اس قدر کہ پھر بات نہ کی
رو رو کے تمام رات ہم نے کاٹی

دیوان کی بیت آخر یہ ہے:

ہو علی حیدر بعطائے علی
گلشن عالم میں بعشرت مقیم

دیوان میں ورق ۱۲ الف سے (۹) تک حاشیے میں نثر جس کے آغاز کی عبارت یہ ہے: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مثل نوسو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی اس کا اصل مطلب یوں سنا جاتا ہے"

غالبیہ ـــــــ دوسرا باب

اکبر علی خاں

اس بار غالبیہ کا دوسرا باب شایع کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایسے حضرات کی اطلاعات کو نقل کیا گیا ہے جو غالب سے ملاقات کے مدعی ہیں۔ غالب بڑے وسیع تعلقات والے تھے۔ ان کی شہرت بھی کم نہ تھی۔ اطراف وجوانب سے جو لوگ دہلی آتے تھے اُن میں سے نہ معلوم کتنوں کے لیے غالب کی ذات باعث کشش ہوتی ہوگی۔ خود دہلی بھی مجمع صاحبان تصانیف وتالیف تھی اور اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو غالب کو نہ جانتا ہو۔ مگر غالب کے اس وسیع حلقے میں سے صرف چند اشخاص ہی ایسے نکلے جنھوں نے اپنی ملاقات کو قلم بند کیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر تاسف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض کی حیثیت صحیح معلومات کے پیش نظر مشکوک ہے۔ مثال کے طور پر امجد علی اشہری کا بیان سراسر غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نہ صرف غالب کا الہ آباد جانا کسی اور ذریعے سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ آخر عمر میں کوئی بھی سفر قرین قیاس نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اشہری نے اپنی کم عمری کی بنا پر کسی دوسرے صاحب کو غالب سمجھ لیا ہو۔

اسی طرح صفیر بلگرامی کے بیان کے بعض حصے بھی غور طلب ہیں جنھیں بغیر پوری جانچ پڑتال کے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں غوث علی شاہ قلندر اور ریاض الدین امجد کی تحریریں اپنی قدامت کے لحاظ سے بڑی اہم ہیں اور ان کی صداقت پر بھی کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی صحبت میں ان سب تحریروں کو پیش کیا جا رہا ہے، یقین ہے کہ ان کے ذریعے غالب کی تصویر کو کچھ ایسے رنگ ملیں گے جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرنے اور ان کی تعارفی علامات کو زیادہ یقینی اور مضبوط بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

تذکرہ غوثیہ

سیّد غوث علی شاہ قلندر

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آ کر لے گئے۔ اور ہمارا حال دریافت کیا ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے۔ علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو　　تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔

غزل مرزا نوشہ

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں میخوار، رو سیاہ، گنہ گار، مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا: چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے: اور فسانۂ عجائب کیسی ہے۔ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے: اجی لاحول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لیے۔ اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دلآزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن　　کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے؟ کہا: کہ ہاں حضرت علی مرتضٰی سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضٰی کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

(۱۰۰-۱۰۲)

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کسی شخص نے مرزا نوشہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کھال دھونتی رہ گیو اور تر بجھ بجھے انگار — اہرن کو ٹھمکو مٹو اور اٹھ گئے میت لوہار
سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہوئے — سدا نہ جوبن تھر رہے اور سدا نہ جیوے کوئے

شنیدم کہ در روزگار کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بفردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی از دار فانی گذشت — نظامی بملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید — بسر چتر اشعار سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
وزاں پس چو نوبت بجامی رسید — جہان سخن را تمامی رسید

عدم ہے یا کوئی کوچۂ صنم ہے — چلی جاتی ہے واں خلقت خدا کی

نہایت خوب آدمی تھے عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجۂ غایت اور خلیق از حد تھے۔ ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مغنی و شرابی و سرودی
زنہار ازان قوم مباشی کہ فریبند — حق را بسجودی و نبی را بدرودی

قطعہ

بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم — کنند باز کہ آن روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آن را ز سرنوشت ازل — اگر زیادہ و کم باشد آن گناہ من است

رند مشرب، بے شر، رحم دل تھے۔ اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔

ندی ناؤ کا بیٹھنا بلک ایک کی بریت — پل میں بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت
ہم دیکھیں جگت جات ہے جگ دیکھے ہم جات — ہم تو بیٹھے راہ پر کس کس کو پچھتائیں

(۳۵۵-۳۵۶)

سرورِ ریاض — شیخ محمد ریاض الدین امجد

بیان قلعہ معلّٰی میں جانے کا اور جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسد اللہ خاں غالب دام افضالہم کی ملاقات سے لطف اٹھانے کا:

چھبیسویں جولائی (۱۸۶۰ء مطابق ۶ محرم ۱۲۷۷ھ) کو صبح کو اٹھا، دہلی کے قلعے میں اکبرآبادی دروازے سے پہنچا۔ یہاں پہلے چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکان ہندستانی طور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہ زادوں اور امیروں نے بنائے تھے: ہر طرح کا تکلف تھا، خوب سجائے تھے لیکن بہ نظر صفائی ان کو سرکار ابد اقتدار نے مسمار کر دیا۔ میدان ہموار کر دیا۔ دیوان عام میں خاص گوروں کا مقام ہے۔ اور دیوان خاص میں عام صاحب لوگوں کا قیام ہے۔ دیوان عام آگرے کے دیوان عام سے چھوٹا ہے اور دیوان خاص آگرے کے دیوان خاص سے بڑا ہے۔ اور سامنے مہتاب باغ ویران پڑا ہے، لیکن بادشاہی چھتہ تا حال ویسا ہی بنا ہے یہ نہیں ٹوٹا ہے۔ پہلے یہاں دکانیں تھیں بازار آباد

تھا ہر شخص شاد تھا کہتے ہیں کہ یہ جگہ ٹکسال تھی۔ چھل چھلا کر جزاد پر آدمی چڑھ جاتا تھا۔ بول چال اوچھوں کی بن جاتی تھی۔ حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ وہاں سے نکلتے دروازے سے نکل کر سرن داس کے باغیچے کے نیچے ہو کر نئے پل کے اوپر پہنچا۔ اور سلیم گڑھ اور نیلی چھتری کی طرف دور سے دیکھ کر کہ پاس جانے میں دیر ہوتی تھی، نہانے والیوں کے دیکھنے کی اور نگم بود گھاٹ پر آنے کی جلدی تھی۔ نگم بود کے گھاٹوں پر گیا۔ ان گھاٹوں کی اچھی تعمیر ہے۔ عمارت دلپذیر ہے۔ پختہ ہیں حمام نہیں بد نمائی کا نام نہیں۔ بندرابن کے گھاٹوں کے برابر نہر کے گھاٹوں سے بہتر عورتیں ہر قسم کی نہاتی تھیں کوئی نہاتی تھی کوئی بالوں کو سکھاتی تھی۔ کوئی ماہ پارہ سورج کی پوجا کرتی تھی اور کوئی زہرہ جبیں ماتھے پر قشقہ بھرتی تھی۔ رخساروں پر چھاپے لگاتی تھی الغرض نگم بود گھاٹ سے بڑھ کر نگم بود دروازے سے نکلا میگہ زین کی طرف چلا۔ یہ دو بڑے انگریزی مکان میں نہایت عالی شان ہیں اور نہر کے کنارے پر چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بڑے تماشے کی بنی ہیں۔ اندر بنچکیاں لگی ہیں۔ باہر ان کا عجب تماشا تھا بڑی دیر تک دیکھا کیا۔ بعد اس کے ہوا کھاتا ہوا بادل پورے میں گیا۔ پھر منصور علی خاں کی حویلی میں کہ اب بھی وہاں عمارات وسیع اور مکانات رفیع، دروازہ عالی شان، مکلف مکان صحن کشادہ، صاف گلی کوچے شفاف موجود ہیں، لیکن آدمی مفقود ہیں، ہوتا ہوا بیگم کے باغ میں آیا۔ یہ باغ بہت آراستہ پیراستہ پایا۔ اب کمپنی باغ اس کا نام ہے۔ کیفیت کا مقام ہے سرکار دولت مدار نے نئے سرے سے مرتب کیا ہے روش بٹریوں سے درست کر دیا ہے۔ بیچ میں نہر جاری روز بروز بڑی طیاری ہے۔ روشیں بلند ہیں سڑکیں اہل فرہنگ کو پسند ہیں۔ ہر طرف باغ میں نہریں رواں ہیں آبشاریں رواں ہیں۔ روشوں کے کناروں پر دوب لگائی ہے اچھی رنگت جمائی ہے۔ غرض کہ آم اور جامن اور مولسری کے پرانے پرانے پیڑ تھے اور نیچے مولسری کے درختوں کے نیچے گرے ہوئے پھولوں کے ڈھیر تھے۔ خدا بخش نے دو چار کو پھول اٹھائے ایک ہار گوندھا تین گجرے بنائے۔ اور تھوڑے سے مرزا نوشہ کے مکان پر جس کا ذکر آگے آوے گا گر پڑے سو وہیں چھوڑ آئے۔ وہاں سے خواص پورے میں جہاں عام لوگوں کی بستی تھی اور علی الخصوص میاں نیاز علی نے پہلے یہاں سکونت کی حویلی لی تھی پہنچا۔ وہاں سے سرائے میں آیا۔ یہاں تین دروازے عالی شان ہیں اور بیچ میں ایک دروازہ ہے اُس میں خدا بخش خیاط کی دکان ہے۔ اب بھی پانچ چار وہاں بڑے بڑے مکان ہیں پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں جناب اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ رہتے تھے گیا۔ مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا۔ سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔ یہ سر آمد زبان دانان شیراز و صفاہاں ہیں۔ مغتنمات روزگار نفیس الطبع، قدیم الوضع، عالی وقار، والا اعتبار، ناخدائے سفینۂ سخن وری، در یکتای بحر معنی پروری آسمان زمین ذی کمالی، نزد بان نازک خیالی مجموعہ اوراق خرد مندی، شیرازۂ اجزائے جرائد معنی بندی، مہر سپہر بلاغت اسد بیشۂ فصاحت، شگفتگی روش طالب حق تو یہ ہے کہ شعرای ماضی و حال ہر فن شاعری میں غالب۔ قد میانہ نہیں بلکہ دراز، اکبر آباد کے سادے انداز کترے ہوئے سفید کچھ سیاہ داڑھی کے بال، گورے چٹے خوبصورت بدرجۂ کمال لا زالت شموس بلاغتہ طالعاً و غمام فصاحتہ متقاطراً۔ میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں۔ اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں۔ فرمایا کہ: کچھ سنایئے، طبع کے جوہر دکھایئے، غرض کہ ہیچ مداں نے دو غزلیں ایک فارسی دوسری اردو کی سنائیں۔ مرزا نے ستائشیں جس کے سزاوار نہ تھا فرمائیں۔

غزل فارسی

شنیدم از صبا من آید انیک شہسوار من — زبان دادم کہ برخیزد بہ تعظیمش غبار من

نمی آید صبا اکنون زدست بر مزار من — غبار خاطر او گشت شاید این غبار من

گذار اے باغباں ما را گماں دزدی مبر ظالم — کہ گلہا نیستند ایں لخت دل اندر کنار من

بدا مادی سخن پرداز آں لو گشتہ ہستم — عروس فکر ہر شب می نشیند در کنار من

ریاض آرزوی وصل آں گل چاک گردیدم
کہ زیں سودا چو آتش سوخت آخر مشت خار من

غزل اردو

پھر رہ گئے گھر میں مجھ ناکام کے — کٹ گئے دن گردش ایام کے

وہ اٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے　　دل کو سینے کو جگر کو تھام کے
لائے ہاتھوں ہاتھ اہلِ کارواں　　ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے
ہاتھ اٹھاؤ ہمرہانِ قافلہ　　اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے
عشق جس کو ہے وہی انسان ہے　　ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے
یہ صدائے قیس تھی اور جذب شوق　　ناقہ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے
تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں　　ولولے ہیں اگلے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض
کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا شعر اپنا ملا کر چار مصرعوں کا ایک قطعہ بنایا تھا۔ خیر وہ بھی سنایا تھا۔

قطعہ

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم　　رات کے دن کے نہ صبح و شام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ اے بھئی چپ رہو یوں کہو کہ ضعف نے غالب نکما کر دیا یا دہر نے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا پھر ارشاد کیا کہ ریختی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو، خاصے شعر ڈھالتے ہو۔ الحاصل دلّی کے ثقات لکھنؤ کے حضرات ہندو مسلمان پیر و جوان ملک ملک کا بھی خیر آباد کا رہنے والا آفت کا پرکالہ مولوی فضل حق کا نواسہ سن میں ذرا سا قطبی میر پڑھتا تھا بات بات میں لڑتا جھگڑتا تھا حاشیہ نشینان بساط ادب تھے، اہلِ کمال سب کے سب تھے بعدہ مرزا نے تین بند مرثیے کے اپنی تصنیف کے سنائے۔ لوگ روئے پیٹے چلائے۔ وہ بند میں نے طلب کیے مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ دیے۔

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو　　اے دجلۂ خون چشمِ ملایک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو　　اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو　　ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو　　گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نہ پایہ جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا　　کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا　　ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

مرزا خود فرماتے تھے کہ یہ حصہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔۔۔۔۔ (ص ۲۱-۲۷)

اُس دن شہادت کی رات تھی۔ لیکن تعزیہ داری کا کیا ذکر یہ عجیب بات تھی۔ اول تو وہاں پہلے ہی تعزیہ داری نہیں ہوتی تھی دوسرے غدر کے

سبب سے کسی میں وسعت نہ رہی زیادہ تر کم ہو گئی۔ سچ جو پوچھو تو یہاں ہر ماہ محرم ہے۔ ہر دم تازہ غم دائم ہے۔ اب بھی قدیم مکانوں میں محفلیں ہوتی ہیں۔ جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں۔ سو وہاں بے سر و سامانی ہے بڑی پریشانی ہے۔ جہاں بڑی طیاری کے علم تھے۔ اب ان کا نشان بھی نظر نہیں آتا ہے۔ امام باڑہ دیکھا نہیں جاتا ہے۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں گو افسردگی ہے لیکن دن کو محفل قرینے کی ہوتی ہے۔ وہی بقول جناب فیض مآب اسد اللہ خاں غالب کے کہ اے بھی مرثیہ لکھیے تو ایک کا لکھیے تو حرکیجیے تو دو کا کیجیے جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے۔ (ص ۴۳-۴۴)

دوبارہ حاضر ہونا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں اور دیکھنا ایک مجذوب کا اور جانا اکثر بڑے بڑے کوچوں میں اور معائنہ کرنا عمارات خوش اسلوب کا

یکم اگست ۱۸۶۰ء (بارھویں محرم ۱۲۷۷ ہجری) صبح کو جناب مستغنی عن الالقاب اسد اللہ خاں غالب کے مکان پر آیا۔ انھوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور حیلوں کا تذکرہ فرمایا۔ فارسی کا دیوان دکھایا اور میر طالب علی اور میر خیر الدین حسین اور منور علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کو توال اور دیگر عمال کے حلیوں کا جو آگرے میں گزرے ہیں جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے سنایا۔ دیر تک حاضر رہا اور دل میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے زمانہ کہیں جوہر سے خالی نہیں رہتا دو چار اہل کمال سب جگہ موجود ہیں افسوس کہ قدردان نابود ہیں زمانہ ماتقدم میں کیسے کیسے فاضل اجل شاعر بے بدل اسی شہر میں ہوتے گئے۔ خلوت کدہ عدم میں سوتے گئے۔ علی الخصوص ۱۲۰۹ ہجری میں خواجہ میر درد صاحب کیسے صاحب کمال اہل قال باحال ہوئے جن کا کلام معجز نظام دردمندان عشق کو تریاق تجربہ کا اثر دکھاتا ہے اور بیماران محبت پر کار مسیحائی کرتا ہے۔ مردہ دلوں کو زندگی کا مزہ آتا ہے۔ ازاں بعد ۱۲۲۵ھ میں جناب میر تقی میر صاحب ریختہ گوئی میں صاحب ایجاد ہوئے اجلہ شعرا کے استاد ہوئے۔ اقلیم سخن ان کے قبضۂ قدرت میں آئی انھوں نے صدائے کوس لمن الملکی بلند فرمائی۔ پھر میر سوز صاحب کی آتش بیانی نے حاسدوں کو جلایا۔ وہ تحریر فرمایا کہ آج تک روشنی بزم سخن ورکی ہے۔ سچ جو پوچھیے تو انھیں لوگوں سے ایجاد شاعری ہے۔ اور نہ جو میاں نصیر تھے تو یہ بھی اس فن میں بے نظیر تھے۔ بعد و جسرتی اور ممنون اور شیفتہ ہوئے۔ لوگ ان کے کلاموں پر بھی فریفتہ ہوئے۔ ازاں بعد خان معروف اور عارف اور احسان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس فن میں کمال بہم پہنچایا۔ بلکہ شاعری کو خوب چمکایا۔ اور ذوق تو ملک الشعرا تھے۔ اپنے عہد میں یکتا تھے۔ اور مومن خاں یہ شخص جادو بیان عجیب طرح کا انسان تھا۔ اس کی معجز بیانی سے بت بھی سر ہلاتے تھے اور آدمی حق شناس اس قدر چپ ہوتے تھے کہ بت بن جاتے تھے۔ لیکن سب کی ایک ہی ہانک تھی ہمیشہ طرز عاشقانہ میں منہ کھولتے، بجلاف ناسخ و آتش کہ یہ ہزار داستان تھے۔ سب گھر بولتے تھے موتی رولتے تھے۔ اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قایم رکھے اس شہر میں دایم رکھے۔ خیر مرزا سے رخصت ہو کر بازار میں آیا ...... (ص ۵۶-۵۷)

غلام غوث بے خبر

آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا اور میں نومبر کے شروع میں دورے کو جانے والا تھا۔ خیال ہوا کہ دلی پہنچ لوں، حضرت غالب سے مل لوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت سب ایک ہی دفعہ لکھوں۔

اس کی حقیقت یوں ہے کہ چھٹی نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا، رڑکی میں لشکر سے جا ملا۔ جب وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دلی نہ جائیں گے، میرٹھ پہنچ کر موقع ملا، جی نہ مانا، دو روز کی رخصت لے کر دلی گیا۔ احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی دو دن میں کیا کرتا۔ بہرحال اوروں سے ایک بار، حضرت غالب سے دو بار ملا، اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیر فانی ہو گئے ہیں، اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، لکھ کر باتیں ہوتی ہیں، عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی، جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے، لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھیے۔ مگر ہوش و حواس بہت درست شوخی طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم، برخلاف مولوی صدر الدین خاں کے ان کے حواس میں بھی فتور کلی ہے ......

(مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر بحوالہ احوال غالب ۳۷)

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے، اتفاق سے کچھ دیر کے لیے دہلی اُتر پڑے، سرائے میں قیام کیا پھر اسٹیشن پر جانے کے لیے اڈے سے بگھی منگوائی، ابھی بگھی آئی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسن اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیے، فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے، کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا، اتنے میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے، خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلیے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا، ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے بغل میں ایک کمرا اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسّی بیاسی برس کا ضعیف العمر لیٹا ہوا، ایک مجلّد کتاب سینے پر رکھے ہوئے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے، یہ مرزا غالب دہلوی ہیں۔ جو بگمانِ غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی، آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا، ہم نے سلام کیا، بہ مشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے، ہم کو اپنے پاس بٹھایا، قلم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا، اور کہا! آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا، جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو، نام و نشان پوچھا، ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی، جب ہم نے نام دیتا لکھا تو کہا: "مجھ سے ملنے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے، کچھ اپنا کلام بھی سناؤ" ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے، بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کیے، پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ، ہم نے یہ مطلع سنایا:

مہ مصر است داغ از رشک مہتابی کہ من دارم زلیخا کور شد از حسرت خوابی کہ من دارم

(غالب کو "مہ مصر" کی ترکیب میں تامل ہوا، کہا، "ماہ کنعان سنا ہے، مہ مصر نئی ترکیب ہے، صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے[1]) عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا، حد سے زیادہ تعریف کی، پھر آدمی سے کہا کھانا لاؤ، ہم سمجھے بہ خیال مہمان نوازی تکلف کر رہے ہیں، لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے دہلی اتر پڑے تھے، ریل کا وقت بالکل قریب ہے، اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے اسباب بندھا ہوا رکھا ہے، پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں، کہنے لگے، آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے، بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سنا، اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے، اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ شوربا بھی پڑا ہوا تھا، پھلکے کا باریک پرت لیکر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا، تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار خوراک پر کیوں بسر کرتے ہیں۔

(اردوئے معلیٰ طبع لاہور)

صفیر بلگرامی

مولف کا دہلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

سنہ ۱۲۸۰ھ میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں صاحب بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا، جب

---

[1] قوسین کی عبارت مقدمۂ کلیات عزیز سے ماخوذ ہے۔

مارہرے پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا، نانا صاحب سے اور اُن سے ایک ربط خاص تھا، مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں، اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد "مثنوی ابر گہر بار" اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا اور وہاں سے آرے پہنچا، حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دیکر بھیج دیا، جب میں نے بوستان خیال کو اردو کر کے اس کی جگہ ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی، اس وقت سے خط و کتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے نشان و گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند عازمین [illegible] روانۂ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیئے، میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا، دس بجے شب کو دہلی پہنچا، شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا، حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے، ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے، دیکھ کر بشاش ہو گئے، اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا، پوچھا یہ کون ہیں، عرض کیا صفیر، ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا، بولے ذرا ٹھہر جائیے، یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اُٹھے، اور بغل گیر ہوئے، اور برآمدے سے اندر آ کر بیٹھے، گرمی کے دن تھے صفر کا مہینہ تھا، حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا، پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کلی دار، نیمہ سرخ ڈل کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ سفید، منہ پر داڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں، اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی، آنکھوں میں نور موجود تھا، کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔

الغرض اندر آ کر بیٹھے، بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کر دوں، اتنے میں نواب ضیاء الدین صاحب بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے اُن سے ملایا۔ وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے، کرتا پہنے، خلط دار پاجامہ، سر پر ٹوپی جریب ہاتھ میں، بعد اُس کے حضرت نے اُن سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں، اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی، جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اُٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا، ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے لیے، آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، اوپر جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گلی کے رخ پر بنا ہوا تھا۔

لطیفہ: فرمایا بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے، یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے، میں نے کہا سمجھا، یعنی گرمی کے دن میں دہلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے۔ الغرض پھر کوٹھے سے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھلانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں، اس لیے ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے، گو تھوڑا سا دور ہے، مگر آرام بہت ملے گا۔ میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے، یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا، اس مکان میں پہونچے وہ مکان عالی شان تھا ایک بڑا پھاٹک بر سر سڑک جس پر ایک بنگلہ خوش نما بنا ہوا، اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ، سجا سجایا، اس کی پشت پر محل سرا، دونوں بغلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا، ہم سب چھ آدمی تھے، اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے، الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے انھیں رفیق کے ساتھ آئے، معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوش بو تخمی آم تھے، میں خیال کیا کہ جب یہ آم خود ایسے ہیں پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں، الغرض کھانا کھایا بہت مزیدار اور خوش گوار تھا، قورمہ، قلیہ، شیرمال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن، کباب، پراٹھا، سب کچھ تھا، بعد کھانے آم جو کھلنے

میٹھا، صورت حرام نظر آئے بالکل کھٹے، میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی، اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھلائے، اس نے کہیں بہتر پائے، پھر تو نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے:

کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم

اور سب آم منگا لیے، آم کا شوق حضرت کو بہت تھا، الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی، قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا، صبح کو فیض صفیر رسالہ تذکیر و تانیث لے کر گیا، حضرت نے خود لے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا، اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے اور عود ہندی میں بھی موجود ہے۔

ہر روز کی ملازمت سے طبیعت محظوظ ہوتی رہی، ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو بلوائیے، ہنس کر بولے ضرور، اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کنوئیں سے پانی لے آ، میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا، فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، پیا واقعی سرد تھا، فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہی نکلتا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا میرے ماموں صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، "منہم" اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا "منّا"

ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا فرمانے لگے میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہو گیا وہ بند یہ ہیں[1]

پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق میر انیس و دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمول پلاؤ، قورمہ، قلیہ، شیرمال، وغیرہ بھیج دیتا ہوگا۔ آج میرا کھانا دیکھیے، الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا، ایک دسترخوان بچھایا گیا، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور تانبے کی رکابی میں تین پھلکے رکھے گئے، اور ایک رکابی تانبے کی خالی، پھر وہ رفیق آکر بیٹھے انھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے اور خالی رکابی میں رکھے، پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا، اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آبیٹھے، پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے، البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا اور کھا چکے، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے، شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔

ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی، بہت تکلف کا کھانا کھلایا، میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا۔ بہت دیر تک باتیں ہوا کیں،

ایک دن مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے، ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا۔

ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا، وہ میلہ بھی قابل دید تھا، دہلی کا میلہ کیا کہنا ہے، میں نے دہلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی، جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے ..... تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہما السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے، خط کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دہلی عجیب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو، کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو، خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان خمخانہ

[1] یہ تین بند بعینہ وہی ہیں جو ریاض الدین امجد کی سیر دہلی میں مندرج ہیں اس لیے یہاں حذف کر دیے گئے ہیں۔

میں چھپی ہے۔

غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اٹھائے، آخر رمضان ۱۲۸۲ ہجری تک آرہے چلے آئے، جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے، خط و کتابت جاری رہی، آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا۔

کلام معجز نظام اُن کا فارسی اور اُردو ہر جگہ موجود ہے، مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھتا ہوں، ایک وضع اول کی دوسری وضع ثانی کی۔[1]

مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالہ کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے، صفحے الٹنے دیکھ کر فرمایا، ہاں اس کو دیکھو یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے، اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے، کوئی دو ڈیڑھ جز کا رسالہ تھا، جناب ڈائرکٹر صاحب نے مولف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے، چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا، پھر خدا جانے کیا ہوا، اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا، وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے، الغرض اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا، فرمایا میاں، اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے۔ اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا، اب جس کا جی چاہے تراش خراش اردو کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے۔ ہاں قواعد لکھ نہیں گیا، قواعد جاننے والا اُس کے کلام میں مزا پاتا ہے، ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا، مگر یاد رہے، اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا، پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہو تا کیا، میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا، جس میں طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا۔ اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کی ہے، میاں جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہو گا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے، اُس وقت فارسی کی شاعری دلی میں بہت چمکی تھی، مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی۔ اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی داں سب اس کی تقلید پر چلنے لگے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی، مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دیتا تھا، کچھ ایسی دقت نہ ہوئی پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی ہر ایک کی نئی طرز ہو گئی، مگر ناسخ کے کلام نے دلی میں آکر سب کو حیران کر دیا، اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا، دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا، اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام آور دہ تھے، میں اور مومن خاں اور ذوق، ذوق نے ادھر کم رغبت کی، کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں مگر مومن خاں نے خیال کیا، پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی، ادھر میں نے بھی، غرض ہم دونوں دہلی کے طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے، مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ ہو گئی، اور کوئی ناسخ سے نہ ملی، میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے اُسی رنگ میں رہے، خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی۔ وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے، ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے۔ ایک تمہارے سحر صاحب فرماتے ہیں!

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ گھر کے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے۔ اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند

---

[1] جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۲۲۱ - ۲۲۸

شعر پڑھے، میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جائے اور باندھنے سے کام ہے، عشق و عاشقی ان کی بلا جانے، نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق، ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے۔

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں، میں چھپرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے، دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے، مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے، من جملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا:

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں | لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے، آپس میں کہنے لگے، بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے، جناب پھر پڑھیے گا، میں نے پھر پڑھا، ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آ جائے اس کو باندھ دینا چاہیے رکیا ؟ ... یہ معشوق نہیں ہو سکتا ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے، کسی کو گورا پسند ہے، کسی کو سانولا، معشوق من است آں کہ بہ نزدیک تو زشت است کا حال ہے۔

یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے، مگر میاں میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے، وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے، ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد ہیں، فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا ۔۔۔ خیالہائے نازک اور معانی بلند کا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے، سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پرداز دیا، صائب کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اور سعدی کی تحریر نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر، مطلب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہو گیا، جس کو بہ ظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر، اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں، ان کا کیا پوچھنا اور جو مجازی میں پورے نکلے، وہ بھی قدم بہ قدم ٹھہرے اور ان کے کچے بدرجے والے سب حقیقی میں ہیں:

اگرچہ شاعران نغز گفتار | زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں | خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم | ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ "چیزے دگر" حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو | رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار | خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں | ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر، آتش کے یہاں بیشتر، یہ تیز نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں۔ میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں

کے شعر عرض کروں، فرمایا ہاں پڑھو:

ناسخ

یہ بھی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا — کہ اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم — وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار، مہرباں — کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے
مر چلا ہوں امیدواری میں — ایسے ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سُن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں، ان میں بعض نشتر ہیں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے:

آتش

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہم راہ یار آئے — رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا
اس بلائے جان سے آتش، دیکھیے کیونکر بنے — دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست
سجدۂ شکرِ خدا یا میں کیے رکھتا ہوں — قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سن کر فرمایا، ان میں بھی بعض[1]

نثار علی شہرت

میں نے دیکھا کہ حضور جہاں پناہ (بہادر شاہ ظفر) گاؤ تکیے سے سر لگائے آرام میں ہیں اور سامنے چند شعرا موجود ہیں غرضکہ مجکو بھی ان کے عقب میں کھڑا کر دیا گیا۔ اول غالب صاحب نے غزل پڑھی جنھوں نے ایک ایک شعر اس عمدگی سے پڑھا کہ سننے والوں کو نقشِ تصویر بنا دیا......

(آئینۂ داغ ص ۱۰)

ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے[2] میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجے چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا میں نے اس رنگترہ کو ہاتھ نہیں لگایا آپ تاڑ گئے اور فرمانے کیا نہیں:

"ہاں! آپ مولوی آگئے ہیں"

میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے، جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا اُس میں کچھ بنانے لگے، غالبؔ اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے گزارش کی:

"جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں؟" تو فرمانے لگے۔

"اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دیے گئے ہیں اس لیے انھیں نکال رہا ہوں اور شستہ الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں"

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی:

"آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے" فرمانے لگے:

"وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں، شہرت! بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا"

پھر فرمانے لگے:

"دلی والوں کی جو اردو ہے جس کو مشک و عبیر کہنا چاہیے، اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے، آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے"

---

[1] جلوۂ خضر جلد اول: ۲۴۰ در ذکر مومن — [2] کھانا کیا تھا سامنے ایک چھوٹے سے گلاس میں یار اللحم رکھا ہوا تھا۔

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی! "داغ کی اردو کیسی ہے؟" فرمانے لگے:
"ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔"
(آئینۂ داغ ۳۴ - ۳۵)

میر حیدر حسین سہیل

اسد اللہ خاں غالب کو میں نے دیکھا ہے یہ والد کی ملاقات کو فراش خانے آئے تھے میں بہت کم سن تھا، اتنا یاد ہے کہ رنگ گورا تھا داڑھی کتروا ں تھی، بال ترشوائے تھے، کشیدہ قامت قوی الجثہ تھے۔
(صلائے عام جنوری ۱۹۱۱ء)

سید امجد علی اشہری

غالب: مجھ کو دلی کی آبادی اور شاعری میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیکھ لینا دلی و سودا سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے ۱۲۸۵ھ میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا تھا ان کی شیوا بیانی سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والی سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر میرزا سے دلی چھٹنا مشکل تھا۔
میرزا غالب کا اردو دیوان شاعری کی جان ہے۔ ——————— اگر اردو میں شاعری کی صورت نظر آسکتی ہے تو میرزا غالب کے دیوان میں۔ مگر اس کا سمجھنا معمولی بات نہیں۔ اس لیے مولانا شوکت کے حل غالب سے مشکل کشائی کا کام لینا چاہیے۔ میرزا غالب فارسی کے شاعر ہیں اور ان کا فارسی کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں استادانہ درجہ رکھتا ہے۔ مگر دلی کی بود و باش اور شاعری کے حقیقی مذاق نے ان کی اردو شاعری پر جو اثر کیا وہ میرزا غالب اور صرف میرزا غالب کا حصہ ہے۔ وہ اردو شاعری میں اپنی وضع کے آپ موجد ہیں اور آپ خاتم۔ حکیم مومن خاں اور استاد ذوق ان کے مشہور اور مستند ہم عصر ہیں لیکن میرزا غالب کا کمال فن اور چیز ہے۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دگیری
(ایشیائی شاعری)

ادارہ اشاعتِ ادب کی مطبوعات

ادارہ اشاعتِ ادب رامپور نے رامپور کے قدیم و جدید اہم شعراء کے کلام کا انتخاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں:

"میں بھی شاعر ہوں"
(زیر طبع)
استاد رامپوری کے کلام کا انتخاب
قیمت: ۲۵ نئے پیسے

"نقشِ قدم"
(زیر طبع)
ذوقی رامپوری کے کلام کا انتخاب
قیمت: ۲۵ نئے پیسے

"کہکشاں"
(زیر طبع)
سہیل جلالی (مرحوم) کے کلام کا انتخاب
قیمت: ۲۵ نئے پیسے

"لیلائے غزل"
(زیر طبع)
قیس رامپوری کے کلام کا انتخاب
قیمت: ۲۵ نئے پیسے

مزید معلومات کے لیے اس پتہ پر لکھیے: ادارہ اشاعت ادب انلی عصمت خاں رامپور یوپی

نورانی تیل

سازندہ: انڈین کیمیکل کمپنی متونا تھ بھنجن یو۔ پی

• آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے

• حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے اور درد، چوٹ، زخم ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے

Summit Advt. NU/9

رُوح افزا — گرمیوں کا ایک تقویت بخش
مزے دار ٹانک، جو ہر عمر کے اشخاص کے لیے
مفید اور پسندیدہ ہے۔ اس میں جڑی بوٹیوں،
ہری ترکاریوں اور پھلوں کا ایکسٹریکٹ اور
دس فی صد سنترہ اور اناناس کا رس شامل ہے

دہلی ، کانپور ، پٹنہ

رُوح افزا

بغیر عنوان کے

احمد جمال پاشا (لکھنؤ)

نگار کے لیے پانچ خریداروں کے چندے جلد ہی بھجوا رہا ہوں۔

ذکیہ جیلانی (علیگڑھ)

کچھ پتے لکھ رہی ہوں ان کو میرے حوالے سے ایک سال کے چندے میں نگار وی۔پی سے بھیج دیں۔ خود میرا چندہ یقینی ہے۔

شفقت فاطمہ (سیتاپور)

دو سالانہ خریداروں کے پتے بھیجے جاتے ہیں۔ ان کو وی پی کر دیجیے۔ میں نے پہلے گفتگو میں طے کر لیا ہے۔ اطمینان رکھیں۔

عطا محمد شعلہ (بنارس)

اپنا چندہ مبلغ دس روپے حاضر ہے۔ دو خریداروں کے پتے علیحدہ ایک خط کے ذریعے بھیج رہا ہوں، ان کے نام وی پی نشر ما دیں جلد سے جلد۔ آئندہ بھی کوشش جاری رکھوں گا۔

(منی آرڈر کوپن سے)

ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور)

.... میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔ اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا۔

نقی احمد ارشاد (ڈمکا، سنتھال)

اس پہاڑی اور قبائلی علاقے میں بھی مقامی ایجنٹ اس نادر اردو رسالے کو پہنچا دیتا ہے۔ جہاں اردو لکھنے والے تو در کنار بولنے والے بھی بہت کم ہیں۔

آئندہ سے میں نگار کا مستقل خریدار بن جاؤں گا۔

رزاق فاروقی (حیدرآباد دکن)

حسب وعدہ آپ کے نگار کو میں خریدار دے رہا ہوں۔ چھٹیاں ختم ہو جائیں تو کالج کا چندہ بھی پہنچ جائے گا۔ جن خریداروں کے پتے دیئے ہیں ان سے بھی توسیع اشاعت کے لیے کہا ہے اور یہ یقین ہے کہ یہ لوگ بھی نگار کو نئے خریدار دلائیں گے۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو بہت خوب ہو

چھیڑ غالب سے چلی جائے

مولانا حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف بتایا ہے۔ غالب کے خطوط میں خصوصیت سے جگہ جگہ یہ وصف نمایاں ہوتا ہے۔ مرزا غالب کو عام لوگوں تک پہنچانے میں ان کی زندگی کی رنگارنگی اور بوقلمونی بڑا سہارا بن سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے غالب کی زندگی کو ان کے کلام اور خطوط کی مدد سے ڈرامائی اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کے بارے میں بہت سے ریڈیو فیچر بھی ملتے ہیں۔ ایسے ڈراموں، فیچروں اور مزاحیہ مضامین کا ایک انتخاب اس کتاب کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی ہفت پہلو شخصیت کو جتنی عمدگی کے ساتھ ان تحریروں میں سمو دیا گیا ہے وہ پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تحریروں کے مصنف ہی خود اعلیٰ معیار کے ضامن ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کرنے والی یہ اردو زبان کی اکلوتی کتاب ہے۔

چند لکھنے والے:

ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حمید احمد خاں، پروفیسر آل احمد سرور، سید وقار عظیم، شوکت تھانوی، ڈاکٹر محمد اشرف، ہری چند اختر، حمیدہ سلطان، سراج احمد علوی، کنہیا لال کپور، فیاض عالم، حاجی لق لق، اور دوسرے

قیمت ــــ ۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

جی ہاں آگ میں پھول بھی کھل سکتے ہیں

خدا نہ کرے لیکن اگر آپ کے جسم کا کوئی حصہ جل جائے یا چوٹ آجائے یا خراش پڑ جائے تو جلن اور سوزش کی یہی کیفیت ہوتی ہے جیسے آگ لگ رہی ہو اس موقع پر فوری

جلمار کا استعمال کیجیے

جو آپ کی اس آگ میں پھول کھلا دیگی

FOR
BURNS
SCALDS &
ABRASIONS
USE
JALMAR
a CIPLA
product

بنانیوالے:
سپلا لیبارٹریز بمبئی ۸

ضروری اعلان:
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں
رسالہ جاری کر دیا جائیگا
نمائندہ نگار ۱۷/۶ این سمن آباد لاہور

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

جلد ۴۲	فہرست مضامین مئی ۱۹۶۳ء	شمارہ ۵

ملاحظات ۳-۴
اردو ڈراما۔ حال اور مستقبل (ڈاکٹر عبد العلیم نامی) ۵-۷
حسرت کی رومانیت (سعادت نظیر ایم اے) ۸-۱۱
فروق۔ ایک مطالعہ (محمد انصار اللہ نظر) ۱۲-۲۰
سنہ اُنیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ مزاحیہ ادب (احمد جمال پاشا) ۲۱-۲۴
منظومات (محمور سعیدی۔ مولوی محمد افضل) ۲۵
باب الانتقاد (جذبات نادر ترقی اردو بورڈ ایڈیشن پر ایک نظر) (رشید حسن خاں) ۲۶-۴۷

ملاحظات

خدا مغفرت کرے، شوکت تھانوی چل بسے۔ خبر بڑی اچانک سی تھی۔ وہ دن قاضی جی کی حیثیت سے ان کی حاضری کا تھا کہ ریڈیو نے قاضی عبد الغفور المتخلص بہ قرن کے مدفون ہونے کی خبر سنائی۔ دل کو ایک دھچکا لگا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ جس کا کام ہنسنا ہنسانا تھا وہ رلا دے گا۔ کم لوگوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ قلم کے ساتھ ساتھ آواز اور حرکات و سکنات پر جس بے پناہ قدرت کے وہ مالک تھے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی فنکار تھے اور ظاہر ہے کہ فنکاری کا یہ درجہ کتنا ممتاز ہے۔

دو ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی بار طفیل صاحب کے یہاں دفتر "نقوش" میں تانگے سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا اور بغیر کسی دقت کے پہچان لیا۔ جیسے وہ خود بول رہے ہوں کہ میں شوکت تھانوی ہوں۔ بڑے مضطرب سے معلوم ہو رہے تھے۔ طفیل صاحب سے اپنی کتابوں کی ایک ایک جلد لی۔ شاید انگلستان کسی ادبی وفد کے ساتھ جا رہے تھے اور جلدی میں تھے مگر لطیفوں سے غافل نہ تھے۔ پھر ایک بار لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے ملے اور اپنی دو کتابیں دیں۔ بار خاطر اور قاعدہ بے قاعدہ آخری کتاب دیتے ہوئے کہنے لگے کہ میں خود ہی بے قاعدہ ہوں کہ آپ جیسے باقاعدہ نوجوان کو قاعدہ پڑھا رہا ہوں۔ وہ صرف لفظوں کے بازی گر نہیں تھے۔ لفظوں سے اپنا الگ ماحول تخلیق کرتے تھے۔ اپنے نمایاں کرداروں کے ساتھ لکھنوی تہذیب کی اتنی پر لطف نمائندگی اب کسی سے کاہے کو ہوگی۔

ان کی بہت سی تحریریں اخباروں میں چھپ کر رہ جائیں گی۔ طفیل صاحب ہی یہ کام کر سکتے ہیں کہ اخباروں کے اوراق سے نکال کر

ان سب کو ایک اچھے انتخاب کی شکل میں شایع کردیں۔ اُن کے ورثہ کو بھی اس سے یک گونہ مگر بروقت تسکین کا سامان بہم پہنچ گا۔

اگر آج ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں کتابوں کی آزادانہ خرید و فروخت ہوتی تو شوکت تھانوی جیسے کتنے ہی ہندوستانی پاکستانی مصنفوں کے حقوق محفوظ رہتے اور ان کے اہل و عیال پر آئی ہوئی مصیبت اتنی سخت نہ رہتی جتنی موجودہ صورت میں بن جاتی ہے۔ سنا تھا کہ انجمن مصنفین پاکستان سلسلہ جنبانی کر رہی ہے مگر شاید وہ بھی سپرانداز ہوگئی۔ اور یہ اہم ترین معاملہ جو کتنی ہی بدمعاملگیوں کا سدباب ہو سکتا تھا، لیت و لعل میں پڑا ہوا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کو چاہیے کہ وہ بھی اس حق کے لیے آواز اٹھائیں۔ اس ملک کا تو وزیر اعظم بھی مصنف ہے۔ اس سے زیادہ "اتق امت" کے حقوق کو کون جانے اور سمجھے گا۔ شوکت تھانوی کی موت نے مصنفوں کے جائز حقوق کی یاد دلائی ہے تو انھیں یہ حق ملنے بھی چاہئیں۔ کیا کتابوں اور رسالوں کی تجارت سے زیادہ بے ضرر تجارت ان دونوں ملکوں کے درمیان کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس تجارت سے زیادہ مبارک کوئی اور تجارت بھی ہے جس سے عقل و علم کی دنیا میں روشنی اور عمل کی دنیا میں ہما ہمی آئے۔

کشمیر کے مذاکرات ختم ہوگئے بغیر کسی نتیجے تک پہنچے ہوئے۔ یہ اونٹ کسی بھی کروٹ بیٹھتا تو دونوں ہی ملکوں کے تعلقات شستہ اور شائستہ ہو جاتے۔ لاکھوں انسان ادھر اور ادھر دونوں طرف تنے جانے کی پابندیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اعزا و اقارب کہاں ہیں اور خود کہاں، کتنے دوست بچھڑے کتنے اپنے دیکھتے دیکھتے اس حدبندی نے پرائے سے کر دیئے۔ ایسے قریب کے پڑوسی کب تک الگ تھلگ رہیں گے یا رہ سکیں گے۔

وصل و فراق کی یہ کیفیت اور امید و بیم کا یہ طلسم دیکھیے کب ٹوٹتا ہے۔ اور دو بھائی کب گلے ملتے ہیں، ایسے کہ فرط مسرت سے ان کی آنکھیں اشک بار، گلے رندھے ہوئے اور دل کی دھڑکنوں میں انبساط فراواں کے نغمے مچلتے ہوں۔ دو بھائی ——— ہند و پاک۔

جنوری میں نگار کے خاص نمبروں کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ سب سے پہلے ذاکر حسین نمبر کی تیاری کرنا ہے یوں تو ادارہ نگار فرداً فرداً بھی تعاون کی درخواست کرے گا مگر ضروری نہیں کہ سارے متعلقہ حضرات تک پہنچ ہو سکے۔ اس میں بہت سی دشواریاں ہوتی ہیں بعض اوقات صحیح پتے نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیے جو نگار دوست اس نمبر کی تیاری میں کوئی بھی مدد دے سکتے ہوں وہ اس سے گریز نہ فرمائیں اور اس بات کا بھی انتظار نہ کریں کہ براہ راست انھیں لکھا ہی جائے۔ اس انداز کے کاموں میں سرگشتہ خمار رسوم و قیود نہیں رہنا چاہیے۔

جامعہ ملیہ دہلی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور حیدرآباد میں ذاکر صاحب کے دوستوں عقیدت مندوں اور شاگردوں کے حلقے آباد ہیں۔ یہ حضرات توجہ کریں اور ذاکر صاحب کی شخصیت، ان کے تعلیمی کارناموں پر لکھیں۔ ذاکر صاحب کے خطبات و پیغامات اور خطوط وغیرہ کو روداروں اور رسائل و اخبارات کے صفحوں سے جمع کریں۔ ذاتی طور پر ان میں سے جو کچھ بھی جس کسی کے پاس ہو وہ اسے ملک و قوم کی امانت جانتے ہوئے ادارہ نگار تک پہنچائے تو یہ نمبر ایک اہم دستاویز بن جائے گا اور اس طرح ادب و انشا کے شہ پاروں کے ساتھ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کے ایک اہم تجرباتی دور کی تاریخ بھی سمٹ آئے گی ———

جذبات نادر کے ترقی اردو بورڈ ایڈیشن پر برادرم رشید حسن خاں نے حسب عادت بڑی محنت سے تبصرہ کیا ہے۔ ترتیب کا کام جتنا آسان سمجھا جاتا ہے در اصل اتنا آسان ہے نہیں۔ اس کے اپنے کچھ مطالبات ہیں۔ اگر ان کو پورا نہ کیا جائے تو نولکشوری عہد کی کتابوں اور موجودہ دور کی مطبوعات میں کیا فرق ہوگا۔ یہ تقاضے ایسی صورت میں اور بھی سخت ہو جاتے ہیں جبکہ کتاب پہلے سے مطبوعہ شکل میں موجود ہو اور پیش کرنے والے کا یہ دعویٰ بھی ہو کہ اس نے ایڈیٹنگ کے ذریعے زیادہ مکمل شکل دینے کی کوشش کی ہے ——— اردو میں ایڈیٹنگ کا معیار کیوں بلند نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ اس کے وجوہ بہت سے ہیں جس میں مرتب اور ناشر اور ان دونوں کے ساتھ اہل علم کا تساہل بھی کچھ شامل ہے۔ آئندہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

اردو ڈراما — حال اور مستقبل

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

اردو ڈراما عہد جدید کی پیداوار ہے اور اس کے لیے ہم پرتگیز کا جس قدر احسان مانیں کم ہے. مغربی اقوام میں پرتگیز ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں. وہ من حیثیت القوم سب سے پہلے لوگ ہیں جو نامعلوم راستوں کو عبور کرتے ہوئے ساحل ہند تک پہنچے اور صرف بارہ سال کی کوشش سے نہ صرف گوا پر قابض ہو گئے بلکہ اس کے ذریعے ایک وسیع علاقے کے حاکم بن گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں بہمنی حکومت کے زوال پر احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور برار کی مسلم حکومتیں قایم ہو چکی تھیں، اردو اپنی ابتدائی منزلیں طے کر کے عدالتی زبان بنتی جا رہی تھی۔ سلاطین دکن نہ صرف علم و ادب کے سرپرست ہی تھے بلکہ خود بھی سخن سنجی اور سخن فہمی کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔

یہ رومتہ الکبریٰ کے بھی عروج کا زمانہ تھا۔ اسپین کی عظمت ایک کیتھولک ملک کی حیثیت سے مسلمہ تھی اس لیے اسقف اعظم کے اشاروں پر چلنے والی حکومتیں فوجی دستوں کے ساتھ ساتھ مبلغین کے دستے بھی روانہ کرتی تھیں جو "جاہل اور بت پرستوں" کو "خداوند یسوع مسیح" کا درس دیتی اور "آسمانی روشنی" سے ان کے دلوں کو منور کرتی تھیں۔

گوا کو مرکزی حیثیت ملتے ہی مبلغین تثلیث نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں، چونکہ اردو عوامی زبان بن چکی تھی اس لیے پرتگیز نے اسی کو تبلیغ تثلیث کا ذریعہ بنایا اور شہر شہر گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھر کر نہ صرف تقریروں کے ذریعے حضرت عیسیٰ کے پیغام کو پہنچایا بلکہ ان کی زندگی کے حالات بھی اسٹیج پر پیش کیے۔ یہیں سے اردو ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے۔

اگرچہ اب تک اردو کے ابتدائی دور پر تحقیق کرنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ہے اور یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ پرتگالیوں نے اپنے دور میں کس قدر مدارس اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے قایم کیے۔ نصاب کس قسم کا تھا۔ درسی کتابیں کس نے لکھیں اور کب لکھی گئیں اور کیا مابعد زمانہ میں وہ شایع ہوئیں یا نہیں پرتگیز مدارس کے مدرسین ہندوستانی تھے یا سب غیر ملکی، اردو اور فارسی کے علاوہ دکن کی اور کونسی زبانیں ان مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اگر ان سوالات کا جواب ہم کو مل جائے تو نہ صرف اردو ڈراموں کی ابتدائی تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ تاریخ ادب اردو کے ابتدائی دور کی ترتیب و تدوین میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب اردو ادب کے محققین اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

پرتگالیوں کی خوش قسمتی سے مغلیہ حکومت کا آفتاب طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اکبر نے فتوحات دکن کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس لیے مبلغین تثلیث کے ہاتھ ایک نیا میدان آیا اور انھوں نے دہلی اور آگرہ میں بھی تثلیث کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اکبر اور جہانگیر کی سرپرستی اور مسلم اراکین دولت مغلیہ کی ہمت افزائی نے ان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا اور وہ پنجاب اور کشمیر سے آگے بڑھ کر تبت تک جا پہنچے۔ پرتگیز مبلغین کو اس داد و دہش سے کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ ہم کو البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ تبت میں بھی اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ تبلیغی سلسلہ کم و بیش ایک صدی تک جاری رہا۔ بعدہٗ انقلاب زمانہ نے پرتگالیوں کو بیک بینی و دوگوش ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ ان کی جگہ پہلے ڈچ، پھر فرانسیسی اور بعد میں انگریزوں نے لی۔

ابھی تک ہم یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اردو زبان و ادب کی کیا خدمت کی لہذا ہم اس عبوری دور سے گزرتے ہوئے ۱۷۵۰ء پر پہنچتے ہیں جب کہ انگریزی کا پہلا اسٹیج ہندوستان میں قایم ہوتا ہے۔ اس کا نام "بمبے تھیٹر" تھا اور بمبے گرین۔ بمبے" میں تعمیر ہوا تھا یہ اسٹیج ۱۸۳۶ء تک قایم رہا۔ بعد کو قرض خواہوں کی نذر ہو گیا۔ دس سال کی کوشش اور جد و جہد کے بعد ایک دوسرا انگریزی اسٹیج ۱۸۴۶ء میں تعمیر ہوا۔ اس کا سرکاری نام اگرچہ "بمبے تھیٹر" تھا لیکن وہ "گرانٹ روڈ تھیٹر"، "راتی کا تھیٹر" اور "شنکر سیٹھ کا تھیٹر" بھی کہلاتا تھا۔ اس میں ۱۸۵۳ء تک صرف انگریزی ڈرامے دکھلائے جاتے تھے۔ سال مذکورہ میں

بمبئی تھیٹر کی مجلس منتظمہ کے ایک اہم رکن جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے کمپنی کی اجازت سے اس میں مرہٹی ڈرامے دکھلائے کیوں کہ مرہٹی شنکر سیٹھ کی مادری زبان تھی لیکن مرہٹے چونکہ اوسطاً غریب تھے اس لیے مسلسل نقصانات کے پیش نظر مرہٹی کے بجائے ہندوستانی یا اردو میں ڈرامے دکھلانے شروع کیے۔ چونکہ انگریز اردو زبان سے واقف تھے جو ان کو بطور زبان خاص ایسٹ انڈیا کالج لندن اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سکھلائی گئی تھی اس لئے انھوں نے اردو ڈراموں کو خوش آمدید کہا اور پہلا ڈراما ”راجہ گوپی چند اور جلندھر“ جو ۲۶ نومبر کو دکھلایا گیا تھا دیکھنے کیلئے گورنر بہ اجلاس کونسل کمانڈر انچیف اور دوسرے سول اور ملٹری عہدیداران سرکاری تشریف لائے۔

یاد رہے کہ ”راجہ گوپی چند اور جلندھر“ ۱۸۵۳ء میں دکھلایا گیا۔ گورنر اور کمانڈر انچیف کی موجودگی میں پیش کیا گیا۔ ایک ایسے اسٹیج پر پیش کیا گیا جو لندن کے رائل تھیٹر ڈرروری لین کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا اور انگریز جسے ”آورئنٹل ڈرروری“ کہتے تھے اور جس کا مکمل ریکارڈ اب بھی حکومت مہاراشٹر کے آرکیوز میں محفوظ ہے۔ پھر بھی بعض لوگ ”رہس“ کو ”ڈرامہ“ کے جامے میں پیش کر کے اندر سبھا کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی شواہد کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ میں کوئی اسٹیج ہی نہ تھا۔ نہ پرتگیزوں نے تعمیر کیا تھا۔ نہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اور نہ کبھی انگریزوں نے اس کی تعمیر کا خیال ظاہر کیا تھا اس لئے اگر نوٹنکی۔ رام لیلا اور رہس وغیرہ کو ناٹک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب اسٹیج ہی موجود نہ ہو — واجد علی شاہ جلیل القدر حکمروں نے ماڈرن اسٹیج ہی نہ دیکھا ہو اور امانت جیسے مصنف کو خواب میں بھی کبھی نظر نہ آیا ہو تو واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کا رہس کس طرح ڈرامے کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

”اردو ڈرامہ“ کا مقدمہ کچھ طویل ہو گیا۔ آئیے اب ہم اردو ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اردو ڈرامہ پانچ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ سے شروع ہو کر نرمدا شنکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والے تقریباً سب پارسی تھے الا سوکر بابوجی ٹھلو کیکر کے جو ایک مرہٹہ تھا اور نرمدا شنکر کے جو گجرات کا باشندہ تھا۔ پارسی ڈراما نویسوں میں افضلیت کا شرف خان صاحب منشی مہروان جی آرام کو حاصل ہے جنھوں نے گل باصنوبر چہ کرد۔ ہیرا۔ چندراوتی۔ حاتم طائی۔ باغ و بہار۔ لیلیٰ مجنوں۔ عالمگیر۔ گوپی چند۔ جوان بخت۔ گل بکاؤلی۔ نورجہاں بہرام اور شیریں نامی ڈرامے اور ایک درجن کے قریب اوپرا یعنی منظوم ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد ایدل جی بھائی۔ بندہ خدا۔ ڈاکٹر پارکھ۔ رانڈ جیلیا۔ فرامرز۔ کا براجی کھودی اور جہانگیر پٹیل کا نمبر آتا ہے۔ جنھوں نے خسرو شیریں۔ پاکدامن گلنار۔ بھولی گل۔ دورنگی دنیا۔ رستم و سہراب۔ جمشید۔ شاہزادہ شیاوکس۔ خدابخش قیمرانہ۔ ظالم زر۔ ستمگر۔ عالمگیر۔ پاکذات پرزین وغیرہ لکھے۔ اس دور کے ڈرامے عموماً گجراتی زبان میں لکھے اور اردو میں ترجمہ کیے جاتے تھے۔ آرام کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ اردو فارسی سے واقف تھے اور براہ راست اردو میں لکھا کرتے تھے۔

دوسرا دور احمد حسین خاں سے شروع ہو کر بابو ہرلنش چندر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے بیشتر ڈرامہ نویسوں نے اپنے ڈراموں کی زبان کے لیے اردو کو استعمال کیا ہے یہاں سے واضح طور پر اردو کی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔ لکھنے والوں میں افسوس مرادآبادی۔ امراؤ علی لکھنوی۔ بالو بابشیور پرشاد۔ بزرگ لاہوری۔ جیون خاں بلبل۔ دھنپت رائے بیکس۔ نقیر محمد تیغ۔ سید سجاد حسین جوہر بنارسی۔ میاں چراغ الدین چراغ۔ لالہ چندن لال۔ محمد الف خاں حباب فتح پوری۔ درگا پرشاد۔ دینا ناتھ فتح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ان کے ڈراموں میں خورشید حسینا۔ نازاں۔ رزم بزم۔ طلسم عشق۔ جود جابر۔ ساحر سبھا۔ سحر سامری۔ عشرت سبھا۔ طلسمات سلیمانی۔ اکسیر اعظم۔ دلبر دلشیر۔ انجام الفت۔ ہارا خدا۔ عصمت کا ڈاکو۔ شرارہ عشق۔ جشن کنورسین۔ مارآستین وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ اسی دور کے دیگر ڈراما نویسوں میں رونق بنارسی۔ سجاد دہلوی۔ کدارناتھ صورت۔ ونایک پرشاد۔ غلام حسین ظریف۔ سید میر عباس علی۔ حافظ محمد عبداللہ۔ عبدالوحید قیس۔ پنڈت بنواری لعل عطا شمس آبادی۔ غلام قادر فصیح۔ مراد بریلوی۔ نظیر اکبرآبادی اور نظامی جبلپوری نے کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا تیسرا دور احسن لکھنوی سے شروع ہو کر یعقوب علی پر ختم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دور اردو ادب کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لیے ڈراما نویسوں اور ان کی تصانیف کی تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔

احسن لکھنوی : کے دس ڈراموں میں چندراولی۔ خون ناحق۔ بزم فانی۔ الفردس۔ بھول بھلیاں۔ چلتا پرزہ۔ شریف بدمعاش کافی مشہور ہوئے۔

آرزو لکھنوی :۔ کے دس ڈراموں میں متوالی جوگن اور حسن کی چنگاری سے شہرت پائی۔

بیتاب دہلوی :۔ کے ۱۲ ڈراموں میں کرشن اوتار۔ کسوٹی۔ میٹھا زہر۔ زہری سانپ۔ امرت۔ مہابھارت۔ رامائن۔ اور کرشن سداما اسٹیج پر مقبول ہوئے
حشر کاشمیری :۔ کے ۳۲ ڈراموں میں اسیر حرص۔ شہید ناز۔ صید ہوس۔ خواب ہستی۔ خوبصورت بلا۔ یہودی کی لڑکی۔ بلوا منگل۔ بھگیرت گنگا۔ ہندستانی ترکی حور۔ سیتا بن باس۔ دھرمی بالک۔ بھارتی بالک۔ دل کی پیاس اور رستم وسہراب نے نام پیدا کیا۔

دیوانہ امرتسری :۔ کے کئی درجن ڈراموں میں تائید یزدانی۔ مہاراجیہ۔ آفتاب۔ اجودھیا۔ بیر پرستان کافی مقبول ہوئے۔
ذاکر لکھنوی :۔ کے ۱۴ ڈراموں میں نور عرب۔ تاج نوران ستی ساوتری۔ زہر کی انگوٹھی۔ فخر عرب۔ دھرم یوگی۔ کشتۂ بھر خون نے شہرت پائی۔

رحمت علی :۔ کے نصف درجن ڈراموں میں درد جگر۔ باوفا قاتل۔ جلاد عاشق مشہور ہوئے۔
عباس علی :۔ کے ۳۱ ڈراموں میں۔ نیرنگ ستمگر۔ جہاں آرا۔ جاں نثار۔ نور اسلام۔ پنجاب میل۔ شریمتی منجری۔ موہنی نبالے۔ لیڈی لاجونتی پورن مل۔ سچی سندری نے عزت پائی۔
محشر انبالوی :۔ کے ۱۹ ڈراموں میں دشمن ایمان۔ جوش توحید۔ دوزخی حور۔ خون جگر۔ سنہری خنجر شکنتلا۔ خود پرست کافی مشہور ہوئے۔
مراد لکھنوی اشتر لکھنوی اور مراد لکھنوی کے ڈراموں نے بھی کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا چوتھا دور آرزو بدایونی سے شروع ہو کر یکتا پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں آرزو بدایونی۔ آصف مدراسی۔ اعظم حیدرآبادی۔ افسوں شاہجہانپوری۔ دل لکھنوی۔ رحمن مرادآبادی۔ رادھے شیام۔ رندھیر۔ شمس گیاوی۔ اور شمس لکھنوی نے نام پیدا کیا۔

اس کے بعد جب اردو ڈراما اپنے پانچویں دور میں داخل ہوتا ہے تو کم از کم اپنی ٹکنک ختم کر چکا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو صرف مطالعہ کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔

اگرچہ اردو ڈراما آج ختم ہو چکا ہے اور اسٹیج کم و بیش مردہ تصور کیا جاتا ہے لیکن حالات بتلاتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں ہے جب اردو اسٹیج دوبارہ اپنی سابقہ عظمت حاصل کرے گا۔

آج ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ عوام کو ڈرامے کے صحیح فن سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنے ڈراما نویسوں اور ان کے پیش کردہ ادب کو پہچان سکیں۔ آج دنیا کا ہر ملک اپنے ڈراما نویسوں پر فخر کرتا اور نظم میں ڈرامے کو سب سے بلند مقام دیتا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہوگا کہ شکسپیر۔ شاد۔ ابسن۔ گوئٹے۔ شلر اور گالسوردی کا درجہ اپنے ملک کے دوسرے ادیبوں پر بھاری ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو اسٹیج اور ڈرامہ کا مستقبل شاندار ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ اس میں دلچسپی لے کر اس کو اس کے صحیح مقام پر جلد یا بدیر پہنچا دے گا۔

طبی ڈائجسٹ گزشتہ پانچ سال سے — زبدۃ الحکماء حکیم محمد صلاح الدین نعمانی سابق پروفیسر طبیہ کالج لاہور۔ کی زیر ادارت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

مختلف طریقہائے علاج سے تعلق رکھنے والے معالجین اور عام تعلیم یافتہ اشخاص کے لیے نو بہ نو مضامین پیش کرتا ہے۔

بدل اشتراک سالانہ — تین روپے — قیمت فی پرچہ — ۲۵ نئے پیسے — نمونے کے لیے ۳۷ پیسے کے ڈاک کے ٹکٹ ارسال کریں — بھارت میں زر سالانہ جمع کرانے کا پتہ :۔ پندرہ روزہ مسیحا ۱۷۰۔ بائیکلہ روڈ بمبئی ۳۔ بھارت

اشتہارات، ترسیل زر اور جملہ امور کے لیے پتہ
منیجر : ماہنامہ "طبی ڈائجسٹ" مارکیٹ روڈ حیدرآباد پاک

حسرت کی رومانیت

سعادت نظیر ایم، اے

انسانی نفسیات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا اتھاہ سمندر ہے جس میں چھوٹی بڑی طرح طرح کی وقت بے وقت ذرا ذرا سے تغیر سے ان گنت کیفیات کی موجیں جو احساسات و جذبات کے امتزاج کا نتیجہ ہیں، پیدا ہوتی ہیں، جن کا مکمل نفسیاتی تجزیہ قریب قریب ناممکن ہے، انہی کیفیات میں رومانیت بھی ایک ممتاز کیفیت ہے، جو مختلف اور متعدد عناصر سے مرکب ہے جس کی فضا میں عقل و شعور کے اجزا بہت کم پائے جاتے ہیں۔ البتہ ماضی پرستی، تجسس حسن، مرکز گریزی، جذبات کا ہجوم، احساس و وجدان پر اعتماد، تخیل کی خود کفالتی، ولولۂ مہم جوئی اور انقلاب حیات کا جوش داخلی طور پر محسوس ہوتا ہے تو صحت و صفائی اور بیان کی وضاحت و تشریح سے زیادہ موسیقیت، اشاریت اور معنی و مفہوم کی تہیں اور ان کی وسعتیں بھی خارجی حیثیت سے ملتی ہیں۔ بغرض رومانیت بھی ایک عجیب کیفیت کا نام ہے جو دل میں ایک عجیب و غریب اضطراب سا پیدا کر دیتی ہے، جس کی تسکین کے لیے فطری طور پر خارجی ماحول میں دل بستگی و دلنوازی کی جستجو، جاذب نگاہ مناظر کی تلاش، ہم خیالی کا تجسس، یکدلی، یک جہتی، اور ہم آہنگی کی تمنا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ یقینی سامانی کے ساتھ حسینوں کے ارتباط یا تذکرۂ حسن میں محسوس ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ترقی کرتے کرتے عشق و محبت کا روپ دھار لیتی ہے اور رفتہ رفتہ ہر شعبۂ نفسیات پر چھا جاتی ہے، رومانیت کا یہی بدلا ہوا روپ شعر و شاعری کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہے، جیسے جیسے شاعر کو حسن کا گہرا احساس ہوتا ہے، ویسے ویسے وہ نامعلوم طور پر عام سطح سے بلند ہو کر صرف حسن کے جلووں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہی ہوتا ہے بلکہ اپنے اس خصوصی احساس کو مترنم آہنگ کے ساتھ زبان و بیان کا خوش وضع لباس بھی عطا کرتا ہے، احساس کی اس پیش کش میں عموماً شاعر کی طبعی افتاد، عملی صلاحیت، عہد گزشتہ کے واقعات، ماحول کے اثرات اور اشارتی انداز قابل لحاظ حد تک دخیل ہوتے ہیں اور یہ چیزیں اگر مناسب حیثیت سے ممد و معاون ہوں تو یہی رومانیت اس کو ایک معیاری مقام پر پہنچا دیتی ہے، اور اس کی شخصیت کو قابل قدر بھی بنا دیتی ہے اور شاعر اپنے جادو اثر نغموں سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو محظوظ کر کر کے مسحور کر لیتا ہے اردو شاعری کے افق پر کچھ ایسے آفتاب اثر شاعر بھی نمودار ہوئے ہیں، جن کے احساسات کی شعاعوں نے غمِ حیات کے طوفانِ باد و باراں کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک نظر فریب قوسِ قزح کی تشکیل کی انھیں ممتاز رومانی شاعروں میں حسرت موہانی بھی ایک شخصیت ہیں، جنھوں نے "چکی کی مشقت" کے دوران میں بھی رومانی غزل نگاری کو نظر انداز نہیں کیا۔

حسرت کے کلام میں حسن کی جلوہ سامانی، نشاط کی کیفیت، حواس کی آسودگی اور احساسِ جمال کی ندرت پائی جاتی ہے، ان کے یہاں ایک صحت مند باذوق اور جمال پرست کی جگر تشنگی ہے، وہ حسن کے ہر جلوے کے پرستار تو ہیں مگر چونکہ بہارِ باغِ کائنات "صنف نازک" کا حسن ہی شعور و احساس پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لیے وہ بھی اسی بتِ ہزار شیوہ پر جان دیتے ہیں، ان کا مرکز دل اوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک مشرقی خاتون ہے، جو ہرجائی نہیں اور داشتہ بھی نہیں، پاک باز ہے، سادگی کا پیکر اور شرم و حیا کا مجسمہ ہے ؎

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی　　اے حسنِ حیا پرور! شوخی بھی، شرارت بھی

حسرت اپنی بیقراریٔ دل کا اظہار کرتے ہیں مگر زبان سے نہیں، آنکھوں سے کیوں کہ محبوب کے خاطرِ نازک کا انھیں پورا پورا لحاظ ہے ؎

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر　　نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے

کبھی تو رعبِ حسن اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسرتِ اظہارِ دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے ؎

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی　　روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

حسرت ایک صداقت پسند اور راست گو کی طرح دورِ ارتقا میں عہدِ ہوس کا ایک واقعہ جو غالباً ان کی رومانیت کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے

بڑی ہی سادگی سے بے جھجک جرأتِ رندانہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ نہایت اضطراب و اشتیاق کے ساتھ محبوب سے دل بستگی کے باعث بار بار اُن کی مشتاق نگاہیں، بے اختیار اس کی جانب اٹھ جاتی ہیں، وہ عاشق نواز بھی اپنے غرفے سے تاک جھانک کرتی ہے، اس سے کبھی وہ مل کر دورِ شوق سے کچھ بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو وہ شرم و حیا کی ماری دانتوں میں انگلی دبا لیتی ہے، کبھی دراز دستی سے پردہ گرا دیتے ہیں تو وہ دوپٹے سے منھ چھپا لیتی ہے، سوتے میں پاؤں چومنا چاہتے ہیں تو وہ شوخی سے ٹھکرا کر مسکرا دیتی ہے، ابتدائی زمانہ یاد دلاتے ہیں اور جستہ جستہ واقعات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ چوری چھپے رات غیروں کی نظریں بچا کر آجایا کرتی تھی اور دورانِ ملاقات میں کبھی ذکرِ فراق آجاتا تھا تو روتی بھی اور رُلاتی بھی تھی، دوپہر کی سی دھوپ میں ان کے بلانے کو ننگے پاؤں چلی آتی تھی، اس کی پھولوں میں بسی زلفیں مشامِ جان کو طبلۂ عطار بنا دیتیں اور اس کے مہندی میں رچے ہوئے دست و پا رنگینی کا نظر میں جچنے والا معیار پیش کرتے تھے، چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہوتیں اور وہ دشمن کے ذکر کو باتوں میں اڑا دیا کرتی تھی، مختصر یہ کہ صحبتِ راز و نیاز گرم رہتی تھی، انھیں برگشتگی پر سو سو ناز سے منایا جاتا اور وہ جب من جاتے تو وہ خود روٹھ جاتی، وہ چھیڑتے، گدگداتے، وہ بگڑ بگڑ کر منتی اور من کر بگڑ جاتی ہے

اے شوق کی بے باکی! وہ کیا تری خواہش تھی؟
جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

اُس نازنیں سے لڑائی بھی ہوتی ہے اور صفائی بھی، تقاضائے محبت کے ہاتھوں وہ وفا پر مجبور بھی ہے، لیکن دنیا کا خیال مانع ہے اور بدنامی و رسوائی کا خوف عناں گیر، حسرت کی اس ابتدائی سادگی و سپردگی کی جگہ آخر میں ربودگی و سنجیدگی لے لیتی ہے جس میں تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی گہرائی سے ایک وزن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ باتوں سے وصل کی تدبیر بنتی ہے نہ آرزو سے تقدیر پھرتی ہے، التفاتِ یار کو وہ آغاز دنیا کا ایک ایسا خواب تصور کرتے ہیں جس کی تعبیر سچ نہیں ہوا کرتی، قیدی غم ہو کر انھیں عظمتِ عشق محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی عالی جنابی اور گردوں رکابی پہ ناز کرنے لگے ہیں، عشق و محبت کے ابتدائی دور کی حسین یادیں ہی ان کی رومانی زندگی کے مایہ ناز سرمائے سے کچھ کم نہیں گویا آغازِ الفت کے عیشِ بافراغت اور بیگانۂ رسمِ جفا محبوب کے لطفِ بے نہایت کے مزوں کی یاد ہی تا دمِ مرگ اُن کی حیاتِ عشق کا آسرا بنی رہی:

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

اک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود
اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی
پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

حالانکہ جیسا ان کے کلام سے پتا چلتا ہے، محبوب کی اور ان کی ملاقاتوں کی زندگی کبھی کی ختم ہو چکی ہے، باہمی چھیڑ چھاڑ کا واسطہ باقی نہیں رہا، سلسلۂ راز و نیاز منقطع ہو چکا ہے، نہ وہ ہمنشینی ہے، نہ وہ بادہ پیمائی، بایں ہمہ قنوطیت، جو منجملۂ لوازماتِ فراق ہے۔ حسرت کے دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو سکی اور وہ کہیں ناامید و مایوس نظر نہیں آتے، اور انھیں یادوں کے سہارے اپنے رنگین ماضی کی دنیا خیالوں میں بساتے اور متکیف ہو کر ایسے نغمہ ریز ہوتے ہیں کہ رودادِ حال کا شبہ گزرتا ہے:

اے یادِ یار! دیکھ! کہ باوصفِ رنجِ ہجر
مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم

شب وہی شب ہے، دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائیں

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد
وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

دنیائے محبت میں حسرت پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ گزری، اسی کی سرگزشت تو ان کی رومانی شاعری کی جان ہے، جدائی کے عالم میں وہ کبھی روئے دل آرا کے تصور سے کھیلتے ہیں تو کبھی خیالِ یار سے باتیں کرتے ہیں، کبھی یادِ جاناں کی رنگینیوں سے بہلتے ہیں تو کبھی غمِ ہجراں سے گھبرا کر بے اختیار وصالِ یار کی دعا کر بیٹھتے ہیں مگر پچھتاتے بھی ہیں کہ کہیں ان کی التجا قبول ہو گئی تو انھیں کشمکشِ انتظار کی لذتوں سے محروم ہونا پڑے گا، لبوں پر شکوۂ بے اعتنائی ہوگا اور نہ خلشِ فرقت ہی رہے گی کہ دل لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن حقیقت ہے کہ محبوب کی غفلت شعاری عشق کا سخت ترین مرحلہ ہے۔

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی   حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اس منزل پر بھی آرزو بر نہیں آتی تو ان کے جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے اب پھر کبھی نہ ملیں اور بے وفا ہو جائیں، عشق کے حسین زمانے کو ایک خوابِ فراموش سمجھیں اور تمنائے شوق سے ہاتھ اٹھا لیں، کاوشِ دردِ جگر کو بھول جائیں، مائل آرام ہوں اور مشتاقِ شفا بھی، انھیں کوئی ارماں ہو نہ کوئی حسرت بلکہ بے نیازئ مدعا ہو، عہدِ وفا سے وہ اس قدر بیگانہ ہو جائیں کہ دل میں اُس حسنِ ستم پرور کی یاد بھولے سے بھی کبھی چٹکیاں لینے نہ لگے مگر کس کے بس کا روگ ہے؟

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر   اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل! اے دلِ مبتلا   مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اٹھا

حسرت نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حسن و عشق کے ہر پہلو کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کی اکثر کامیاب کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ کہیں انھوں نے ابتذال اور فحاشی کی بھی پروا نہیں کی، ان کے یہاں مذاقِ سلیم اور سنجیدگی پر گراں گزرنے والے شعر بھی ہیں، لیکن ان جواہر پاروں کی بھی کمی نہیں جو ان کی نمایاں انفرادیت کے آئینہ دار ہیں، جن میں انھوں نے باتوں باتوں میں شاعری کا ذوق جگایا ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی   مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ان کے سحر آگیں شعروں میں ایک شاہ پارہ یہ بھی ہے جس میں انھیں بیک وقت حسن کرشمہ ساز کے اعجاز کا اعتراف بھی ہے اور اس پر طنز بھی ؎

خرد کا نام "جنوں" پڑ گیا جنوں کا "خرد"   جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

قادرانہ رمز کاری شعر کو سرکش بنا دیتی ہے، تشبیہیں، استعارے اور کنائے معنی آفرینی اور جدت طرازی کے موثر ذرائع ہیں، ان سے معنوں اور برمحل لفظوں کے مفہوم و مطالب کا خوش رنگ دامن وسیع تر ہو جاتا ہے، مگر ان شعری وسیلوں کا استعمال شاعر کے سلیقے پر موقوف ہے کیوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انھیں جس حسن سے برتے گا، شعر اتنا ہی جاندار ہو جائے گا اور یہ خوبی بھی حسرت کے یہاں مناسب صورت میں پائی جاتی ہے، ان کی تشبیہات استعارات اور کنایات میں فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ رومانی قدروں کی دل آویزیاں بھی سمٹ آئی ہیں:

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں   یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی
روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام   دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
چمنِ جاں میں نسیمِ ہوس انگیز چلی   کشتِ امید پر ابرِ طرب آثار آیا
اسی سے چھپتے ہیں، ہوتی ہے جس پہ اُن کی نظر   اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نفسیات کی یہ بالکل روندی ہوئی پیش پا افتادہ بات ہے کہ بات پر بات یاد آتی ہے، چنانچہ اسی بات سے حسرت نے ایک بات بنائی ہے:

نہ چھیڑ اے ہمنشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے   شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی ذہین و نابغہ کے حرف و حکایات کو کشف و کرامات سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے حسرت کی طباعی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے:

نگہِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں   شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے

سیدھے سادے انداز کے ساتھ موثر اسلوبِ اظہار سے حیرت آفرینی بھی شاعر کا ایک کمال ہے:

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت   نگہِ شوق نے، کیا جانیے! کیا دیکھا ہے؟

یوں تو ہر انسان حسن و محبت کے رنگا رنگ پہلوؤں سے کم و بیش آشنا ہوتا ہے اور نت نئے مشاہدات و معاملات اور تجربات سے نشاط اندوز بھی، نشاط و سرور کے علاوہ کچھ اس کے ناگوار پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ہر دل فطری طور پر متاثر و مغموم ہو جاتا ہے، مگر عوام کو یہ سارے جذبات گونگے کے گڑ کھانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہ شاعر ہی کا حصہ ہے کہ بقدرِ قدرتِ کلام اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات اور ان کے اثرات کو ایسے موثر پیرائے میں اپنے ماحول تک بھی پہنچاتا ہے کہ ہر اک سامع اس کی ہر کہی ہوئی بات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے اور مزہ لیتا ہے، شاعر اپنے جذبات ہی کی

ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اوروں کے دل کی گرہیں بھی کھولتا ہے، اور اس خوبی کے ساتھ اپنی تقریر میں لذت پیدا کرتا ہے کہ ہر سننے والا بے ساختہ اٹھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور یہی حسنِ اظہار و قدرتِ کمال ہے، ان باتوں کا دارومدار داخلی نوعیت سے احساسات کی قوت اور رومانیت کی شدت پر ہے اور خارجی حیثیت سے ماحول، معاملات و تجربات کی اثر اندازی پر۔ جس شاعر میں رومانیت جس شدت کی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی بلیغ، موثر اور پسندیدہ ہوں گے،

حسرت کے احساس اور جذبات میں بھی ایک معیاری رومانیت سموئی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری میں ایک دل کشی اور پسندیدگی آ گئی ہے جو حسنِ قبول کی ضامن ہے:

اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

لایا ہے دل پر کتنی خرابی!
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے مرا شہرۂ عشق
دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے؟
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

حسرت کے کلام میں احساسِ جمال، صحت مندیٔ ذوق، معاملاتِ حسن و عشق کی بصیرت اور اس کے اظہار؛ ابلاغ میں سادگی، شگفتگی اور لطافت و بے باکی مثالی ہے، ان کا نقطۂ نظر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے لیکن ان کے یہاں جذبات میں تندی نہیں، اعتدال ہے، اور احساسات میں کیف آگینی و نشاط انگیزی:

تجدیدِ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں؟　　شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی　　یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے

مختصر یہ کہ حسرت مروجہ فلسفیانہ اصطلاحوں سے نہیں الجھتے نام نہاد تہذیب و تمدن کے اصولی قیود و بند سے آزاد ہو کر انبساطِ احساس کی دنیا میں جس کا دوسرا نام "رومانیت" ہے، گامزن ہوتے ہیں۔ جہاں ان کے خیال اور جذبے کے پر کشش نقوش کہیں ہلکے، کہیں گہرے رنگ میں ابھر آتے ہیں، لب و لہجہ خوش گوار ہو جاتا ہے، اضطراب و حشر سامانی، بے کرانی و لامحدودیت کے ساتھ لطیف اشاریت جھلکنے لگتی ہے اور وہ اپنے اندرونی و بیرونی تجربات کو ایک دوسرے میں سمو کر لطیف پیرایۂ بیان میں اپنی طرب آفریں "رومانیت" کی جلوہ گری

کرتے ہیں:

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں
جلد، اے حوصلۂ دید! مجھے تھام کہیں
دامِ گیسو میں ترے اک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

بقیہ سن انیس سو باسٹھ کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

نمکدان، پاک پنچ، پھلجھڑی، بھوپال پنچ، بیسویں صدی، شمع، بانو، کھلونا، بھائی جان، امروز، جنگ، کوہستان، داستان گو، نصرت، لیل و نہار، قومی آواز، پنچ، انجام، سیاست، انقلاب اور ملاپ میں خبر لیتے نظر آتے ہیں۔

اردو کارٹون کی تاریخ اودھ پنچ کی طرح نمکدان کے سیاسی اور سماجی کارٹونوں کا ایک الگ باب تیار کرے گی۔ نجمی اور جمیل کے قلم میں اودھ پنچ والی تیزی اور شوخی ہے۔ جنگ میں نجمی کا مستقل کارٹون "آپ سے ملیے" امروز کے لیے "بڑے میاں" اور "وقت کی بات" قومی آواز میں پرکاش کی "ایک ہی" اور "زمانے کی رفتار" کوہستان میں حمید کا "میر صاحب" "پیچ کا حلقی دنیا" انجام میں محمود بٹ کے "منشی جی" سیاست حیدرآباد میں احمد کے مستقل کارٹون، انقلاب میں دہاب حیدر کی "سنی سنائی"، ملاپ میں پران کی "آج کی بات" شمع میں سدھیر کے "ہنستے گیت"، پاک پنچ میں عزیز کے کارٹون، پھلجھڑی میں شہاب کے کارٹون اور ان کے علاوہ داستان گو، نصرت اور اردو کے بیشتر رسائل و اخبارات میں شنکر اور دوسری زبانوں کے کارٹونوں کے چربے اس بات کے ضامن ہیں کہ کارٹون کے فن پر ہمارے ادب میں خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے اور اس فن کا مستقبل خاصہ روشن ہے۔ خاص طور پر بچوں کے رسائل کارٹون کے بغیر ادھورے رہتے ہیں اور اخبارات کا یہ روز بروز لازمی جزو بنتے جا رہے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی طنزیہ و مزاحیہ ادب خاصہ آگے بڑھا ہے اچھی کتابیں اچھے مضامین اور اچھے لکھنے والے اچھے مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں، ہر چند کہ بہترین ادب معیار و مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں پیدا ہوا مگر پھر بھی رفتارِ ادب حوصلہ شکن نہیں بلکہ خاصی حوصلہ افزا رہی، اور مستقبل میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی نئی وسعتوں اور بلندیوں کے امکانات زیادہ واضح اور روشن

ذوق — ایک مطالعہ

محمد انصار اللہ نظر

تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ عہد آفریں صرف وہی شخصیتیں ہوتی ہیں جو ماضی کی روایات کو اچھی طرح جانتی سمجھتی اور برت سکتی ہوں ساتھ ہی ان میں یہ صلاحیت بھی ہونی لازم ہے کہ وہ ماضی سے مستقبل کے لیے صحیح نتائج بھی اخذ کر سکیں، ہر زمانے کے لیے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور یہ تقاضے ہر حال میں پورے ہو کر رہتے ہیں البتہ کچھ ذہین اور با استعداد اشخاص ان تقاضوں کو سمجھ کر ان کے لیے مناسب ذرائع پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں ایک انقلاب پیدا ہوا، زبان و ادب کو بھی ایک نیا انداز اختیار کرنا تھا۔ سرسید اور حالی، شبلی اور آزاد نے زمانے کے ان تقاضوں کو سمجھ کر مناسب اقدامات کیے اور اس طرح زبان و ادب بہت جلد صحیح نہج پر لگ گئے اگر ہمارے یہ بزرگ اس وقت نہ ہوتے تو بھی یہ کچھ ہو کر رہتا البتہ ممکن تھا کہ اس تبدیلی میں کچھ عرصہ اور لگ جاتا، سائنسی اصطلاح میں ان عہد آفریں شخصیتوں کی حیثیت (CATELYTIC AGENT) کی ہوتی ہے جو عمل کو تیز تر بنا دیتا ہے۔ وہ اس عمل میں خود کو فنا نہیں کرتا بلکہ اپنی انفرادیت کو قایم رکھتے ہوئے عمل کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جدید طرز کے مشاعرے کی بنیاد رکھی یہ اس وقت کا تقاضا تھا، آزاد کے ذریعہ یہ کام ہوا، آزاد نہ ہوتے تو بھی یہ ہو کر رہتا دیر یا جلد لیکن یہی کام ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ممکن نہ تھا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ذوق کی تربیت میں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا لیکن آزاد کے اس کارنامے کو صرف ذوق کی تربیت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ ان کے ایک شاگرد سید ممتاز علی نے لکھا ہے:

"میں نے ابتدا سے ان میں یہی دھن پائی کہ وہ نظم اردو کے دوسرے ولی بن جائیں اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کر دیں کہ یہ زبان بھی روئے زمین کی اور معزز زبانوں کی طرح تمام مطالب علمی کے لیے کارآمد ہو سکے اور جس کے الفاظ اور بندشوں میں ہمارا دل اپنی پوری حسرتیں اور ارمان نکال سکے۔ اس منصوبے کا ظہور اگرچہ ۱۸۷۴ء میں ہوا لیکن یہ وہ منصوبہ تھا جس نے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دامن تربیت میں نشو و نما حاصل کیا تھا۔" (مجموعۂ نظم آزاد۔ دیباچہ صہ ۳)

کچھ شک نہیں کہ ذوق کی شخصیت نہایت اہم تھی، ان کا علم و فضل، ان کی قادر الکلامی، تلامذہ کو اصلاح دینے کا انداز، مسلم ہے اس میں شک نہیں کہ ذوق اپنے دور کے شاعرانہ ماحول کے صحیح نمائندہ تھے، ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے دور میں پسندیدہ تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے دور میں نہایت مقبول اور ہر دل عزیز رہے، تمام تذکرہ نویس ان کی خوبیٔ کلام کے قایل اور معترف ہیں۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے افراد ان کے دامن تلمذ سے فیض اٹھانا فخر سمجھتے تھے، حالت یہاں تک پہنچی کہ:

"صبح سے شام تک تربیت طلاب کمال اور حک و اصلاح سخن سے خواب و خور کی مہلت نصیب اعدا تھی۔" (گلستان سخن)

قبول عام کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب انتقال ہوا تو سیکڑوں تاریخیں کہی گئی تھیں:

"مسموع ہوا کہ ایک خوش مذاق نے سعی اور تجسس کو کام فرما کر ان قطعات سے کچھ کچھ بہم پہنچائے بعد شمار کے دریافت ہوا کہ تین سو سے زیادہ فراہم ہو گئے تھے۔" (گلستان سخن)

شیخ ذوق ایک صاحب علم ذہین شخص تھے انھوں نے اپنے زمانے کا بغور مطالعہ کیا تھا اور بدلتے ہوئے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:

ذوق گل اور کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے　　　کہ ہوا باغ جہاں میں ہے دگر گوں چلتی

غزل کا مقطع ہے اور یہ غزل بقول آزاد "ابتدائے شباب کی ہے اور نظر ثانی نہیں ہوئی۔" (دیوان ذوق صہ ۱۹۹) لیکن اس کو سنتے ہی ذہن میں یہ خیال

پیدا ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کسی آنے والے انقلاب کو محسوس کر لیا ہے۔ مشہور ہے کہ ذوق نے اپنے عہد کی روایات کو بڑی خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے نباہا، لیکن یہاں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا اگر ساتھ دیا تو کس طرح؟ کیونکہ یہیں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔

ذوق سترہ سال کی عمر سے پہلے ہی شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہو چکے تھے (مجموعہ نغز) شاہ نصیر استاد وقت تھے کچھ عرصہ کے لیے شاہزادہ مرزا ابو ظفر کو اصلاح دینے پر بھی مامور ہوئے تھے، یہ بڑے قادر الکلام، بلکہ زور آور استاد تھے۔ "تیلیاں" کی ردیف میں مشہور معرکہ ہوا:

"شاہ نصیر کی تلاش پر ہزار آفریں ہے کہ ہر بار دو غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتا تھا اور ہر شاگرد کی غزل انیس بیس سے کم نہ ہوتی تھی طرفہ یہ کہ وہ سب غزلیں بھی ایسی بکہ تاز عرصہ سخن کی طبع زاد ہوتی تھیں۔"

(گلستان سخن)

اور یہ مشاعرہ "کئی مہینے تک" جاری رہا۔ ایسے زور آور اور کہنہ سال اور کہنہ مشق استاد کی شاگردی کا اثر یہ ہوا کہ خود ذوق بھی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے لگے۔ اس دور کی بعض غزلوں کے ردیف و قافیہ کو دیکھیے:

اب / غضب　ہے کہ نہیں　　آب / حساب　تو دے　　اب / نسب　آوے کہ نہ آوے　　گردن / پرفن　کو لگے

ذوق نے ابتداءً اپنے عہد کے انداز غزل خوانی کو اپنایا اور اس میں خوب کامیاب رہے، سرکار شاہی سے خطاب پایا، بادشاہ اور ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے، اپنے منصب کی خاطر روایات کو برابر آخر عمر تک نباہتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء کے ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھی جس کا یہ شعر مشہور ہے

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی　　دنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے　(چراغ دہلی از حیرت)

آزاد نے بھی اس سلسلہ میں جا بجا استاد کے اقوال لکھے ہیں بعض یہ ہیں:

"۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا..... فرمایا ہم لمبی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں زمین ٹھنڈی ہو تو ہو کلام بے اصول نہ ہو۔"

(دیوان ذوق صفحہ ۱۰۵)

"۱۸۵۰ء میں .... مشاعرہ کیا..... میں نے کہا حضرت ضرور کہنی چاہیے لوگ ہمیں کہیں گے انھیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا، استاد کا ارادہ پھر مستقل ہو گیا اور غزل تمام کی۔"

(ایضاً صفحہ ۱۹۲)

یہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ ذوق آخر عمر میں بھی مشاعرہ کی سخت سے سخت زمین میں شعر کہنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن اگر ان کی غزلوں کا بہ غور مطالعہ کریں اور آخر عمر کی وہ غزلیں الگ کر لیں جو انھوں نے اپنے شوق سے لکھیں تو معلوم ہوگا کہ اب وہ عام بحروں، مختصر ردیفوں اور سہل قافیوں میں غزلیں کہنے لگے تھے، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ غزلوں کے ردیف و قوافی درج ہیں:

مرجھا / دکھلا　گئے　　رفو / بہ ضو　کرتے　　خدا / جفا　سمجھے

سہل زمینوں کا انتخاب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر اب یہ سمجھ چکا ہے کہ محض سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے میں کوئی افادیت نہیں، چنانچہ اس نے اس سلسلہ کو خود ترک کر دیا۔

"شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے، ان دنوں کی غزلوں میں (ذوق) نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔" (دیوان ذوق صفحہ ۸۲)

ایک موقع پر آزاد نے ان قطعوں کو "شاگردی کا تمغہ" بھی کہا ہے۔

شاہ نصیر کے بعض مقطعوں میں "گرمی" کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

نصیر اور بھی ایسی کوئی غزل پڑھ گرم

ذوق کی ابتدائی غزلوں میں بالکل اسی مضمون کے مقطع مل سکتے ہیں:

عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

شاہ نصیر مرحوم نے انشا اور مصحفی کے ساتھ بھی بزم شعر میں شرکت کی تھی، ان کے اثر سے ذوق بھی اپنا دامن بچا نہ سکے تھے۔ چنانچہ مصحفی اور شاہ نصیر کی مشہور معرکہ کی زمین میں ذوق سے بھی ایک غزل منسوب کی جاتی ہے:

مثل خورشید ہے سیب ذقن سرخ ترا　　معدن لعل و گہر ہے دہن سرخ ترا　　(نگارستان سخن)

سید انشا نے دوغزلہ اور سہ غزلہ بہت لکھے اور ان میں درمیانی مقطع لکھنے کا ایک نیا انداز اختیار کیا، شاہ نصیر نے بھی اس طرز کو اختیار کیا اور ذوق کے یہاں بھی یہی انداز ملتا ہے۔ مثلاً:

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل　　بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس پر غم کے ساتھ　　(دیوان مرتبہ آزاد)

لیکن آخر دور میں ذوق کے یہاں نہ دوغزلہ سہ غزلہ کا شوق ملتا ہے نہ اس انداز کے مقطعے ہیں اور نہ غزلوں میں قطعات ہیں، اب شاعر کا رجحان معنویت کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے اشعار ایک زمین میں بہت زیادہ نہیں کہے جاتے، ذوق کی آخر عمر کی غزلیں بہ لحاظ تعداد اشعار مختصر بھی ہیں، طویل ردیفوں کی بجائے مختصر ردیفوں کا استعمال اور "گریہ" اور "گرمی" کے روایتی مضامین کا ترک، کرنا اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے بعد ہی وہ دور آئے گا جب ردیف اور قافیہ بلکہ وزن کے خلاف بھی ایک احتجاج ہوگا، رسمی مضامین کو نہ صرف واجب الترک سمجھا جائے گا بلکہ ان کو شاعری کا عیب جانیں گے۔

(۲)

مصحفی اور انشا کے بعد لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کی دھوم تھی، آتش نے اپنے نظریہ کا اظہار ایک مقطع میں کر دیا ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے انداز میں جو اختلافات ملتے ہیں ان کے باوجود "تلاش الفاظ" پر زور دینا دونوں کے یہاں مشترک ہے۔ اس موقع پر ناسخ کے ایک شاگرد نواب کلب حسین خاں نادر کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ نادر نے اپنی تصنیف تلخیص معلّی میں ناسخ اور رشک کے ان اصولوں کو بھی بیان کیا ہے جو بالخصوص شعرا کے لیے اہم ہیں، یہ کتاب زبان کی صحت کے متعلق لکھی گئی ہے مگر اس کے موضوعات یہ ہیں:

"مقدمہ سبب تالیف کتاب میں

پہلی فصل امور واجب الترک و مستحسن الترک محاورات اردوئے قدیم و جدید میں

دوسری فصل حد یافت تذکیر و تانیث اور بعض قواعد جمع بنانے کے با دیگر فوائد و زوائد میں

تیسری فصل اختلاف روزمرہ گفتگوئے ساکنان مغرب و شرق لکھنؤ میں

چوتھی فصل بعض مصطلحات و مرکبات علم عروض و قوافی میں

خاتمہ بعض فوائد و زوائد و امور قابل ترک و اختیار و محاورات و الفاظ وغیرہ"　　(تلخیص معلّی دیباچہ)

ناسخ کے تلامذہ میں شعر کہنے کا جو طریقہ رائج معلوم ہوتا ہے یہ ہے:

"جس طرح پر شعر کہنا منظور ہو اس کے سب قوافی پہلے لکھ ان میں سے غور کرے کہ کتنے قوافی خاص لائق گنجائش مضامین ہیں انھیں کو سہل زمینوں میں موزوں کرے اول مصرعہ ثانی لکھے بعد اس کے مصرعہ لگا دے۔" (تلخیص معلّی)

اس عہد کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ان سے ہمیں زبان، قواعد عروض کے اصولوں کی اس دور میں اہمیت معلوم ہوگی لیکن معنی، مطالب اور مضمون کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو۔ اس کو ہمیشہ ضمنی اور ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

ذوق نے ناسخ سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، انھوں نے ناسخ کی کئی غزلوں پر غزلیں کہیں، اور زبان کے اصول و قواعد کے سختی سے پابند ہوئے اس موقع پر ان کے دو مقطع پیش کرنا مناسب ہوگا۔

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق　　ترے زبان کا مزہ تیری شعر خوانی میں

بے تمیزوں کو ہو نقصان لطف ذوق　　لیں ہیں نام طفل کو دھا پیارے

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق اپنے اشعار میں لطفِ زبان کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر داد نہ ملنے کی شکایت بھی کرتے ہیں، ان کو بچوں کا ادھورا نام لینا بھی اس حد تک ناگوار تھا کہ اسے بھی بے تمیزوں کا شعار سمجھتے تھے، یہ سب صحیح ہے لیکن انسان کی ذاتی افتادِ طبع بھی بڑی چیز ہے، اس دور میں جب بندشِ الفاظ کی وہ اہمیت ہو جو بیان ہوئی ذوق نے ایک مقطع کہا (سترہ سال سے بھی کم عمر میں)

ٹک دیکھ اب تو چشمِ حقیقت سے اے ذوق   ہر طرف جلوہ گر ہے اسی کا ظہورِ حسن   (مجموعہ نغز)

اس مقطع کے مضمون سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی اہم ہے کہ لفظ "طرف" جو متحرک الاوسط ہے ساکن الاوسط نظم ہوا ہے۔ ناسخ اور ان کے تلامذہ کے یہاں اس کی مثالیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ البتہ میر تقی میر کے متعلق آزاد نے ایک حکایت نقل کی ہے کہ لکھنؤ میں چند عمائد نے میر صاحب سے شعر کی فرمائش کی میر صاحب نے یہ مطلع پڑھا۔

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا   دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور فرمایا "آپ کہیں گے خیال کی "ی" ظاہر کرو مگر جواب یہ ہے کہ محاورہ یہی ہے"! (آبِ حیات) ـــــ ذوق کے بچپن میں میر صاحب زندہ تھے (اگرچہ لکھنؤ میں تھے) ان کے واقعات ذوق نے بچپن میں سنے ہوں گے، میر کے سودا اور قائم کے کلام میں بھی متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک نظم کرنے کی مثالیں کافی ملتی ہیں، ذوق نے بھی اپنے لئے دہلوی شعرا کی روایات کو زیادہ قابلِ عمل پایا، چنانچہ وہ حسبِ ضرورت اصول و ضوابط سے انحراف بھی جائز رکھتے ہیں اس سلسلہ میں وہ ناسخ کے مقلد بالکل نہیں ہیں، چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر

اور: دوپہر ہے سایہ بھی بیٹھے ہے دب کر زیرِ پا

ایک ہی لفظ "پہر" کو ایک موقع پر ساکن الاوسط اور دوسرے پر متحرک الاوسط نظم کیا۔

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو

فراق گورکھپوری صاحب کو بھی ذوق کی یہ ترکیب کھٹکی ہے لیکن انھوں یہ کہہ کر کہ شاید ذوق کے زمانے میں ایسا ہی بولتے ہوں اسے اہمیت نہیں دی ہے، اصول کے مطابق تنگیٔ زمانہ بھی صحیح ہے۔ لیکن شاعر نے قافیہ کی رعایت برتی، اسے ضرورتِ شعری کہہ سکتے ہیں۔

ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

یہاں بھی آل کی "ہونا چاہیے تھا مگر ردیف یہی تھی ـــــ اس موقع پر تلخیصِ معلی کا ایک اقتباس اہم ہے۔

"از انجملہ ہے کہ اکثر اشعار میں مصرعہ اول اس طرح موزوں کرتے ہیں کہ جب تک دو ایک لفظ مصرعہ ثانی میں شامل کرکے نہ پڑھے جائیں تب تک مطلب واضح نہیں ہوتا اور یہ بے لطفِ محض ہے چاہیے کہ ہر مصرعہ کا مطلب جداگانہ ہو۔ (ذوق)

بند آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے   ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا"

اسی طرح ایک اور موقع پر نادر لکھتے ہیں:

"اور یہ دو حرف بڑے چھپے ہوئے دشمن ہیں ایک نون غنہ اور دوسرے ہائے ہوز کہ یہ اکثر وقت موزونی دھوکہ دے کر وزن سے خارج ہو کر شاعر کو ذلیل کرتے ہیں۔ بڑے بڑے استادوں نے دھوکا کھایا ہے"

گر فضول ہووے جلوریز بہ دشتِ قبچاق

خود آزاد نے بھی اصولوں سے ذوق کے اس انحراف کو محسوس کیا تھا چنانچہ دیوانِ ذوق میں جابجا اس کی مثالیں خود انھوں نے پیش کی ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴، صفحہ ۱۲۳، صفحہ ۱۴۵ وغیرہ) آزاد نے کبھی کبھی اس مسئلہ پر استاد سے گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً ذوق کا مصرعہ ہے۔

صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

محاورہ ہے "سحر کا ہونا" ذوق نے اس کے خلاف نظم کیا ہے۔ آزاد نے پوچھا تو ذوق نے جواب دیا۔

"یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی

پیدا ہوا بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا قباحت کیا ہوئی۔" (دیباچہ دیوان ذوق ص ۳۴)

اس شعر کے متعلق ذوق کہہ سکتے تھے کہ یہ بچپن کا کلام ہے بحافظ شوق کے دور تلمذ کی یادگار رہے (عمدۂ منتخبہ) لیکن آزاد کے مذکورہ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذوق محاورہ میں اس تصرف سے شرمندہ بالکل نہیں تھے بلکہ وہ اسے زبان میں "وسعت کا ایک قدم" سمجھتے تھے اور اس پر وہ آخر تک قایم رہے۔ اس زمانہ میں جب کہ معمولی سی لغزش پر بھی بر سر مشاعرہ لوگ ٹوک دیتے تھے۔ ادنیٰ ادنیٰ بات کے لیے سند طلب کی جاتی تھی۔ ذوق کا اقدام بلا شبہ جرأت مندانہ ہے اس سلسلے میں شاہ نصیر کے دو شعر نقل کرتا ہوں جن میں ذوق پر گرفت کی گئی ہے۔

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے　　قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہر خدا　　یار کی چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں

(انتخاب کلیات شاہ نصیر مطبوعہ علی پریس میرٹھ)

تعجب ہے کہ ان اشعار کو پنڈت کیفی نے لالہ گھنشیام داس عاصی کے نام سے شایع کیا ہے اور ایک شعر کا اضافہ بھی کیا ہے۔

شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ　　باندھیے گر ہو سکیں تار نفس کی تیلیاں (خمخانۂ جاوید ۵/۵۴۳)

ان معرکہ آرائیوں کے باوجود ذوق نے محاورات اور روزمرہ میں بھی تصرف کیا اور اس طرح یہ بتا دیا کہ قدیم روایات کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن ہر زمانے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ صرف قدامت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جو شخصیتیں عہد آفریں ہوتی ہیں وہ نئے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں، زبان و ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان تبدیلیوں سے چشم پوشی کرنا تنگ نظری کی دلیل ہے اور ان سے دامن بچا کر چلنے والا اپنے دور سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔ ذوق کے زمانہ میں یہی بڑی بات تھی کہ انھوں نے نئے محاوروں، نئے الفاظ کو اختیار کیا، شاعری کے نئے مزاج کو پہچانا جو مضمون وہ نظم کرنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے اگر اصول کی پابندی کو حارج پایا تو دیکھا تو اس قید کو توڑ دینے میں کوئی تکلف نہ کیا، ان کے نزدیک اصل چیز وہ خیال تھا جو نظم کیا جاتا تھا نہ کہ وہ اصول جن کے مطابق نظم ہوتا تھا، اصول کا مقصد خود یہی ہے کہ وہ مضمون کو زیادہ دلکش اور پراثر بنا دیں نہ یہ کہ اس کی تاثیر اور کشش کو نقصان پہنچائے۔ ذوق کا شاعری کے متعلق جو نظریہ تھا وہ اس مقطع سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

نہ ہو لفظ متعلق نہ تعقید مطلق جو فی الجملہ کچھ ہو تو مضمون ادق ہو

(۳)

ذوق آنکہ مدام ہمچو مردان خدا　　برداشتہ بود دل ازیں جائے دنی　　(صہبائی)

ذوق ایک خدا پرست شخص تھے ان کے نزدیک تمام انسان "انسان" تھے وہ ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے تھے کہتے ہیں:

مت بھول بندگی پہ غرہ میں آ کے بندے　　زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

مذہبی فرقوں کے متعلق وہ صرف اتنا ہی کہتے تھے کہ:

جو اس کے نزدیک رہبری ہے　　وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

ان کے سامنے انسانیت کا ایک تصور تھا شرافت اور اخلاق کا ایک معیار تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا مطالعہ کیا تو ہر طرف ادبار اور پستی نظر آئی، اس نے ان کو بہت متاثر کیا تھا چنانچہ مختلف انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں مثلاً:

رباعی

ان آنکھوں سے روتے لالہ گوں بھی دیکھا　　اور ان کو پہ از اشک خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھا نہ رنگ ہم نے اے ذوق　　یوں بھی دیکھا جہاں کو یوں بھی دیکھا

اپنے زمانے کے وضعداروں کو بگڑتے دیکھا اور ان کی تباہی سے متاثر ہو کے ایک رباعی میں اس قسم کا تاثر بیان کیا ہے۔

رباعی

جب تلک گرہ میں احمقوں کے پیسے — سب کہتے تھے ان کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق — پوچھا نہ کہ تھے کون وہ ایسے تیسے

ذوق مسلمان تھے اور اس دور میں خصوصاً مسلمانوں کی تباہ حالی دیکھ کر بہت کڑھتے تھے دیکھیے اس کیفیت کو کس قدر دردناک انداز سے بیان کرتے ہیں:

قطعہ

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال — دیکھتا ہوں یہ اب اے ذوق میں انکا احوال
جس طرح سے کہ ہنسا دیوے کو بے دینوں کے — نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی بعض تحریروں کا عکس شایع کیا ہے۔ اس میں یہ قطعہ بھی ہے۔ اسی صفحہ پر نواب زینت محل بیگم کے مکان کی تاریخ کے کئی مادے ذوق نے لکھے ہیں جو ۱۲۶۲ھ کا واقعہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطعہ مذکور ۱۲۶۲ھ میں کہا ہوگا۔ مذکورہ رباعیات سے ذوق کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے، انھوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب محض ہجر و وصال کی روایتی کیفیات کے بیان کا موقع نہیں ہے بلکہ اب ضرورت ہے کہ اخلاقی اور اصلاحی حقائق بیان کیے جائیں، چنانچہ ان کی غزلوں میں زندگی کی حقیقتوں اور نصیحتوں کا مختلف تمثیلوں کے ذریعے بیان ملتا ہے اور اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہت ہیں:

دیدۂ آبلہ پا کا ہے یہی اب رونا — کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا — چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جرأت اور حب الوطنی کے مضامین بھی ملتے ہیں نمونہ یہ ہے:

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب — تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑے گا بدلا لیکر
یوں اسیران قفس تک کوئی پہنچا گلبرگ — جیسے غربت میں شقیقان وطن کا کاغذ
فراق خلد میں گندم ہے سینہ چاک اب تک — الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

ذوق نے غزلیں کہی ہیں اور غزلوں میں انھوں نے اس قسم کے مضامین نظم کیے ہیں، ان سے پہلے ہی غزل کا مزاج مخصوص ہو چکا تھا اس کی اپنی زبان ہے اپنی اصطلاحات ہیں اور اپنا انداز بیان ہے اس کا بہترین نمونہ ہمیں ذوق کے دوسرے استاد بھائی حکیم مومن کے یہاں ملتا ہے غزل کو غزل کے صحیح معنوں میں استعمال کرنے میں مومن سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے غزل کا مروجہ انداز بہت تنگ تھا۔ ذوق کا عقیدہ تھا کہ:

کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

اور وہ کائنات کے ہر ذرہ سے فائدہ اٹھا لینا اپنا منصب اور اپنا حق سمجھتے تھے اس میں شک نہیں کہ ان کی غزلوں میں بھی روایتی اشعار ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اصلاحی اور اخلاقی مضامین بھی بہت نظم کیے ہیں، اس کے لیے غزل کی رمزیہ زبان ناکافی ثابت ہوئی۔ انھوں نے اشاروں، کنایوں کو چھوڑ کر صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو — زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز — کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
دین ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں — اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

بعض اوقات تو ان مضامین کو اس قدر کھل کر نظم کر جاتے ہیں کہ وہ غزل میں کھٹکنے لگتے ہیں مثلاً:

نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا — پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

مضمون کی افادیت سے انکار نہیں لیکن اس میں وہ کیفیت ہرگز نہیں جو غزل کے شعر کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ذوق کو ان تمثیلوں کے

استعمال میں بھی تکلف نہیں جن کو ساتذہ نے بتذل کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا مثلاً:

جس کے سبب لڑائی ہو وہ آدمی نہیں　　کانٹا ہے گھر میں سیہ کا یا گل کنیر کا

سگ دنیا پس از مردن بھی دامن گیر دنیا ہو　　کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

بد خصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک　　اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بار حرص　　رہ گیا یہ تو گدھا دلدل میں پھنس کے بوجھ سے

وہ کان جو بلبل، طوطی اور قمری کا تذکرہ سننے کے عادی تھے زاغ و زغن اور سیہ کا ذکر یقیناً پسند نہیں کر سکتے، وہ طبائع جن کے سامنے ہمیشہ گل و نسترن، نرگس و یاسمن کی بہاریں رہیں کنیر کے پھول اور کتا گھاس کو یقیناً حقیر ہی سمجھیں گے۔ چنانچہ ذوق کے یہ اشعار یقیناً پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے گئے ہوں گے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کسی قدیم تذکرہ میں ایسے اشعار نقل نہیں کیے گئے، لیکن ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کی ناپسندیدگی سے متاثر ہو کر اپنے مقصد کو پس پشت نہیں ڈال سکتے تھے۔ چنانچہ آخر تک وہ اپنی اسی روش پر قائم رہے۔ ذوق سے انتہائی سختی برتنے کے باوجود ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں ایک انقلاب پیدا کر دیا یعنی یہ کہ ناسخ اور ان کے معتقدین کے کلام کو سن کر ذہن صنایع بدایع کی تلاش کرتا ہے اور ذوق کا شعر سن کر ہم اس کے مفہوم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، غزل کے مزاج میں یہ تبدیلی نہایت اہم ہے۔

شاہ نصیر اور ناسخ کا اثر یہ تھا کہ سامعین قافیہ پیمائی اور لفظی صنعت گری کے دلدادہ ہو رہے تھے چنانچہ اس دور کے مشاعروں کی طرحیں دیکھیے ایسی ہی ملیں گی مثلاً:

کب کے مشتاق تھے زخموں کے دہن پتھر کے

کیا غمزہ ترا برسرِ بیداد غضب ہے

ہے صفائی سے سزاوار شکن کا کاغذ

اس میں شک نہیں کہ ذوق نے اخلاقی مضامین کو آسان زمینوں میں عام فہم تمثیلوں کے ذریعے نہایت سادگی کے ساتھ نظم کیا ہے لیکن اگر وہ صرف یہی کرتے تو یقیناً ناکام ہوتے، انھوں نے زمانے کا ساتھ بھی دیا اور سخت سے سخت زمینوں میں بھی غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھیں اور اس طرح اپنی قدرت کلام کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا، لیکن مقصد ہمیشہ پیش نظر رہا ابتدائی غزلوں میں ایک دو شعر ایسے ضرور کہتے تھے جو زندگی کے لیے مفید ہوں اور آخر عمر کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ سامعین کے مزاج کو بتدریج متاثر کر کے ایک دوسرے نہج پر لے آنا بڑی بات تھی، ہم بھی دیکھتے ہیں کہ وہی سامعین جو کبھی ایسی غزلوں کو پسند کرتے تھے کہ:

آفریں معنی باریک سے کیا خوب نصیر　　تو نے پیدا کیے ہیں سر بسر اشعار میں بال

ذوق کی آخری عمر تک ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اب ان شعروں کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے لگے تھے اور یہی ان کی پسند ہو کر رہ گئی تھی کہ:

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو　　آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز　　کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

پہلا شعر گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ) گلستان سخن (۱۲۷۱ھ)، چمن بے نظیر (۱۲۶۴ھ) وغیرہ میں اور دوسرا گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ) گلستان سخن (۱۲۷۱ھ)، سخن شعراء (۱۲۹۱ھ) ترجمہ حدائق البلاغت (۱۲۵۵ھ) وغیرہ میں ملتا ہے اور ایسے ہی اشعار کو ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ مقبولیت کا حال یہ تھا کہ ایک مدت تک لوگوں کی تحریر و تقریر میں بیشتر ذوق ہی کے اشعار نقل کیے جاتے تھے۔

(۴)

مولانا محمد حسین آزاد نے زبان کی تنگی کا شکوہ ایک موقع پر اس طرح کیا ہے:

"غرض اول جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اردو کی بدولت ہوا اور یہی سبب ہوا کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لیے درکار ہوتے اس سے یہ زبان مفلس رہی کیوں کہ اس عہد میں علوم و فنون تاریخ و فلسفہ، ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لیے بھی الفاظ ہو جاتے جن جن

باتوں کا چرچا تھا انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے۔" (آب حیات ص۱۲۱)

شمالی ہند میں سودا اور ان کے بعد انشاء نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا تھا مگر ان کے بعد شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ ذوق نے اس بدلے ہوئے ماحول میں پھر سودا اور انشاء کی یاد تازہ کی، انھوں نے قصیدوں میں علمی مسائل کو نظم کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا اور غزل جیسی لطیف صنف کو بھی اس کے لیے استعمال کیا، ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بہیں اکثر ملتے ہیں جن کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف کسی خاص مسئلہ کو نظم کرنے کے لیے یہ شعر کہہ دیا ہے مثلاً:

نخل گل مہندی نہ بو نصف سبو میں لے نگار　　ڈوگھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیر پا

شاعر کو نخل گل مہندی کی یہ تاثیر معلوم ہوگی کہ یہ بہار کا پھول ہے اس کا ذائقہ قدرے تلخ ہوتا ہے؛ پورے پودے کا عرق سوزش اعضا کے لیے مفید ہے خصوصاً جب وہ آگ یا گرم پانی سے جلنے کے سبب ہو۔

عدو نے نیش زن کے گھر سے میرا مہ جبیں نکلے　　الٰہی برج عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

برج عقرب دوازدہ بروج فلکی میں سے آٹھواں ہے، اس کی شکل بچھو سے مشابہ ہے، بہ لحاظ تاثیر آبی ہے، رنگ سیاہ ہے، اس برج میں قمر کا ہونا نحوست کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے ـــــ ان خواص کو ذہن میں رکھیے، یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر کا مقصد ان ہی کو نظم کرنا تھا اس قسم کی متعدد مثالیں دیوان ذوق میں ملیں گی۔

یہیں تصوف کے متعلق بھی اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ تصوف اردو شاعری کے حاوی رجحانات میں سے ایک ہے اور ذوق کے زمانے میں تو اس کا زور اور بھی زیادہ تھا خود مرزا غالب بھی "مسائل تصوف" بیان کر کے "ولی" بننا چاہتے تھے اس دور میں مسئلہ وحدت الوجود کو زیادہ اہمیت حاصل تھی خواجہ میر درد بھی اسی کے قائل تھے لیکن اقبال نے آخر اس کی تردید کی اور اس کے مضر اور مہلک اثرات کو ظاہر و ثابت کیا، ذوق کے تصوف کے متعلق کوئی تحقیقی کام ابھی نہیں ہوا اس لیے کوئی قطعی بات کہنا قبل از وقت ہے البتہ ایک شعر میں انھوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ پر نہایت عمدہ طنز کیا ہے:

لکھتا ہے شیخ مسئلہ وحدت الوجود　　لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

فلسفہ کی بحثوں کے متعلق بھی ذوق نے نہایت عمدہ بات کہی ہے:

کیا جانیں ہے زمانے کو حادث، یا قدیم　　کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

مولوی نذیر احمد مرحوم نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے:

"اگر تم میری صلاح مانو تو علم الکلام کی کتاب تو بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا ایک بڑا نقصان جو طالبگار دین کو اس فن کی کتابوں سے پہنچتا ہے یہ ہے کہ اس کی طبیعت دینیات سے متنفر ہو جاتی ہے جس ترتیب سے میں نے تم کو دینیات میں غور کرنے کو بتایا ہے اس کا لحاظ بھی حیرت اختلاف سے بچنے کے لیے مفید ہے جب انسان اس بات کو نصب العین کرے گا کہ میں فانی اور بے حقیقت مخلوق ہوں اور معلوم نہیں کہ بعد مرگ کیا پیش آئے میں نہیں سمجھتا کہ ایسا آدمی ان جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اپنی طبیعت کو حاضر پائے بعض باتوں سے تو وہ بایں خیال اعراض کرے گا کہ میں ان سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں۔" (ابن الوقت ص۱۴۵)

غرض یہ کہ ذوق نے مختلف علوم و فنون کے مسائل کو غزل میں داخل کر کے غزل کو ایک نئی وسعت دینے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی مختلف اختلافات اور منفی انداز فکر سے ذہنوں کو آزاد بھی کرنا چاہا ہے لیکن یہ کام ان کے زمانے میں ممکن نہ ہو سکا۔ آزاد، حالی اور نذیر احمد وغیرہ کے دور میں زمانے نے خود ذہنوں کو صحیح راہ پر لگا دیا۔

(۵)

ذوق کے ابتدائی اور آخری دور کے انداز فکر میں فرق کو سمجھنے کے لیے ہی ہم ایک غزل نقل کرتے ہیں یہ غزل انھوں نے آغاز شباب میں کہی تھی، صرف یہی چند شعر ادھورا اسی حالت میں حمدہ منتخبہ میں مل سکے۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا　　کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

ہے آتش دل سینہ میں مثل منقل   — داغ سے انبار ہے انگاروں کا
آرزو ہے کہ جو خورشید قیامت —   سایہ اس کشتۂ ابرو پہ ہو تلواروں کا
ہائے وہ عاشق جانباز کہ — تک   ہدف تیر رہا تجھ سے کمانداروں کا
کیا تعجب ہے پس از مرگ بھی رہوے تو وہ   دل میں پیکان کا اور سینہ میں سوفاروں کا
ذوقؔ بے چیدہ کہاں برلعت ہے اس کافر کی   ہے مگر نامۂ اعمال سیہ کاروں کا

آزاد لکھتے ہیں کہ عالم شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی سنہ ۱۲۶۹ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی" (دیوان ذوق صفحہ ۶۴) چنانچہ کسی قدیم تذکرے میں مطلع کے سوا کوئی شعر نہیں ملا، دیوان ذوق میں بھی اس مطلع کے سوا مذکورہ بالا کوئی شعر نہیں ملتا البتہ جو غزل دیوان ذوق میں ہے مطلع مذکور کے علاوہ اس میں یہ اشعار ملتے ہیں:

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا   دیجیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا
اتنا تو سوز فغاں ہو کہ چمن میں بلبل   خرمن گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا
چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ   ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا
ہوں، نگیں حلق بریدہ کی ہمارے خونبار   گر تماشا تجھے منظور ہو فوّاروں کا
ہیں کماندار ترے تیر مژہ تشنۂ خوں   منھ کھلا رہتا ہے اس واسطے سوفاروں کا
کیوں نہ ہر تار میں سو دل ہوں گرفتار زلف   جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا
دیں گے جاں بوسۂ لعل نمکیں پہ ہم بھی   جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا
بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوقؔ   رو سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا   (دیوان ذوق)

پہلی غزل کے مطلع میں واقعی ایک کیفیت ہے ایک وارفتہ پن ہے، چنانچہ ذوق نے اسے قائم رکھا اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسے پسند کیا (دیکھیے عمدۂ منتخبہ، گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، گلستان سخن، سخن شعرا وغیرہ) باقی تمام اشعار محض روایتی سوز و گداز پر مشتمل ہیں کوئی کیفیت نہیں چنانچہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ غزل دوبارہ پوری کرتے وقت شاعر نے ان کو قلم زد کر دیا تھا۔

تازہ غزل کے متعلق آزاد کا یہ قول کہ سنہ ۱۲۶۹ھ میں کہی گئی تحقیق طلب ہے البتہ آخر عمر کی تخلیق ضرور کہہ سکتے ہیں، اس کے مطلع پر غور کریں محتسب میخواروں کی دل آزاری ادائیگی فرض کے طور پر نہیں کرتا بلکہ اس کی نیت یہ ہے کہ اسے بھی ایک جام مل جائے اس کا ثبوت دوسرے مصرعے سے فراہم کیا کہ اسے ایک جام دیدیجے تو وہ یاروں کا یار ہوگا۔ مضمون اس دور کی رسم رشوت خوری اور خیانت منصبی کی غمازی کرتا ہے اور سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ ذوق کا اپنا مشاہدہ بلکہ متاثر ہوگا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی تحریروں کا جو عکس شایع کیا ہے اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

الٰہی مدعا نکلے یہ رشوت خوار اڑ جائے

یہ بھی اس دور کی رشوت ستانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے شعر کو بھی ذوق کا ذاتی تاثر کہہ سکتے ہیں، دلی میں اس وقت جو انتشار عام تھا اس نے ہر فرد کو بیقرار کر رکھا ذوق اسی بیقراری میں افادیت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ فغاں میں اتنا سوز پیدا ہو جائے کہ خرمن گل کو بھی پھونک ڈالے، ذوق کی زندگی میں تو یہ ممکن نہ ہوا البتہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ آگ بھڑک اٹھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات ہمارے سامنے ہیں، غزل کے مقطع کو دیکھیے وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں اس میں بھی ایک پیغام ملتا ہے، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب ذوق کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس میں ایک حد تک اصلیت کو بھی دخل ہے بیشک اس دور کی غزلوں میں بھی بعض شعر روایتی اور اشعار کی تعداد بوجھ ڈالنے والے ہیں لیکن اگر غور کریں تو ذوق کے یہاں ہمیں ایسے نکات معلوم ہوں گے جو واقعی مفید اور قابل قدر ہوں گے، ذوق کے کلام میں ہمیں قدیم انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئے دور کی جھلکیاں بھی مل سکتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کلام کا مطالعہ کافی اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

سن اُنیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ مزاحیہ ادب

احمد جمال پاشا

مجھے نہیں یاد پڑتا کہ برہمن نے کبھی کسی سال کو خراب بھی بتایا ہو لہٰذا اصل یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر شیخ و برہمن ہمیشہ متفق پائے گئے لہٰذا میرے لیے بھی یہی بہتر ہوگا کہ میں بھی ان سے متفق ہو کر اس قرآن السعدین کو ساعت منحوس میں تبدیل ہونے سے بچا لوں۔

سن انیس سو باسٹھ کے بہترین ادب کے محض ایک پہلو یعنی طنز و مزاح کے وسیع اور عریض احاطے میں صحافتی کالم، مضامین، افسانے، خاکے، ناول، ناولٹ، مستقل مزاحیہ کردار، ڈرامے، فیچر، پیروڈی، انشائیے، تراجم، ڈائری، رپورتاژ، سفر نامے، خطوط، باقیات الصالحات، فکاہیات، لطیفے، کارٹون، غزلیں، نظمیں، آزاد نظمیں، مثنویاں، شہر آشوب، بنجارہ نامے، قصائد، ہجویات، واسوخت، مراثی، ریختی، قطعات اور رباعیات وغیرہ آتی ہیں ان کے علاوہ نئے نئے رسالے، نئی کتابیں، نئے انتخابات، نئی آوازیں، نئے رجحانات نئی تحریکیں اور نئی روشیں سامنے آتی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ہمیں پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا ہے کارواں طنز و ظرافت کا کوئی راہی ہم سے بچھڑ تو نہیں گیا، ہماری متاع عزیز کے گرانمایہ سرمایے میں سے کچھ کم تو نہیں ہو گیا۔ اور بہ حیثیت مجموعی سال بھر میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

سال بھر کے جائزے میں پہلی چیز سب سے زیادہ نمایاں یہ ہے کہ اس وقت ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں صحافت کا بول بالا ہے ہمارے بیشتر طنز و مزاح نگار محنت و مشقت کے ذریعے حیات و کائنات کے آفاقی مسائل سلجھانے کے بجائے روزمرہ کے ہنگامی واقعات اور سطحی موضوعات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

کالم نویسی کی روایت کو سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ لکھنؤ میں جنم دیا تھا مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اسے وزن و وقار بخشا اور مجید لاہوری نے اسے مقبول عام کیا۔

ہمارے موجودہ صحافتی مزاح نگاروں کے میر کارواں مولانا عبدالماجد دریابادی، شوکت تھانوی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، طفیل احمد جمالی، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، خوشتر گرامی اور عبدالمجیب سہالوی ہیں۔ ان سب کے یہاں گہرا سیاسی و سماجی شعور بالغ نظری، گہرائی و گیرائی ہے ان کے ہاتھوں میں وقت کی نبضیں ہیں، ان کی آوازوں میں مسایل کی گونج اور قلم میں تلواروں کی کاٹ ہے۔ یہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر بین الاقوامی مسایل تک کی ناہمواری پر شدید طنز کر کے ہماری زندگی میں توازن پیدا کرنے کے مقدس فرض کو بڑی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

یہ عہد مولانا عبدالماجد دریابادی کا عہد ہے ضروری نہیں کہ آپ ان کے مسلک سے بھی متفق ہوں مگر ان کے طنز میں جو شدت اور زہرناکی ہے وہ آپ بھی تسلیم کر لیں گے۔ ہر ہفتے صدق جدید لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی سچی باتیں شایع ہوتی ہیں جن کو ہندوستان اور پاکستان کے بیشمار اخبار اور رسالے بڑے فخر اور پابندی کے ساتھ اپنے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت اور عظمت ہمارے دلوں میں ظفر علی خاں، سالک اور حسرت کی یاد تازہ کر دیتی ہے اس عہد کی امامت کا سہرا انہی کے سر ہے۔

پندرہ روزہ نمکدان کراچی میں "گر تو برا نہ مانے" سے "بت شکنی" کمان پر رکھ کر قلم نکلے، پہلے مختار زمن لکھتے تھے اور اب نصر اللہ خاں لکھتے ہیں، نمکدان کے تیر اندازوں میں اودھ پنچ کے فدائیوں کی سی تیزی، شوخی اور طراری ہے، ان کی دوربین نظروں سے کسی بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بدعنوانی اور بے اعتدالی سے بچ نکلنا محال ہے طفیل احمد جمالی کی بت شکنی، صحافتی مزاح کی تاریخ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی اردو کا سب سے کثیرالاشاعت اور مقبول عام روزنامہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبار طنز و مزاح پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس میں شوکت تھانوی کا "پہاڑ تلے" ابراہیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ" رئیس امروہوی کا مزاحیہ کردار "نواب مرزا اچھے صاحب قبلہ کا خاکہ" اور طنزیہ قطعہ، اور

شفیع عقیل کا گرد و پیش شایع ہوتا ہے۔ جنگ کا مزاحیہ کالم بہت سے اخبار، رسالے بغیر کسی حوالے یا ادارے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ یا کثر اشاعتی ادارے ان تراشوں کی مدد سے مزاحیہ افسانچوں کے مجموعے تیار کر کے شایع کر دیتے ہیں جیسے شوکت تھانوی کا مارشل لا۔ نمک مرچ، کارٹون اور جوکر وغیرہ۔ شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، رئیس امروہوی اور شفیع عقیل کے کالم عوام اور خواص میں یکساں بے حد مقبول و معروف ہیں خاص طور پر رئیس امروہوی کا "قطعہ" جو ہمیشہ دو دھاری تلوار ہونے کے علاوہ اپنے اندر ایک عجب کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔

روزنامہ امروز لاہور میں عنقا کے نام سے احمد ندیم قاسمی روزانہ "حرف و حکایت" کا کالم لکھتے ہیں۔ عنقا کے بیشتر موضوعات سماجی کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہوتے ہیں ادب کی یہ چاشنی ان کو عوام کے علاوہ خواص میں بھی مقبول بنائے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے "حرف و حکایت" کا یہ باغ و بہار کالم اردو کے صحافتی مزاح میں ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔

روزنامہ قومی آواز لکھنؤ گزشتہ ۱۸ سال سے اپنے پڑھنے والوں کو "گلوریاں" پیش کر رہا ہے۔ اس کے میزبان حیات اللہ انصاری اور عبد حبیب سہالوی کا ایک مخصوص لہجہ، انداز، تہذیب، رکھ رکھاؤ اور معیار ہے بہت رچا بسا گہرا سیاسی و سماجی شعور اور سوجھ بوجھ ہے ان کی ظرافت میں مقصدیت اور توازن کا خوشگوار آہنگ بہت عام ہے۔

روزنامہ ملاپ دہلی میں فکر تونسوی "پیاز کے چھلکے" لکھتے ہیں۔ فکر تونسوی صحیح معنوں میں صحافتی اور عوامی مزاح نگار ہیں ان کے پیاز کے چھلکے عوام میں بے حد مقبول ہیں، کوئی مسئلہ، کوئی گتھی غرض کوئی بات بھی ہو فکر تونسوی دم بھر میں اس کے چھلکے اتار کر رکھ دیتے ہیں ان کا سیاسی شعور ان کی ادبیت اور ان کی صحافت ان کی ظرافت پر حاوی ہے۔

خوشتر گرامی برسوں سے نہایت خاموشی کے ساتھ بیسویں صدی دہلی میں "تیر و نشتر" لکھ رہے ہیں ان کے ہر فقرے میں ایک مخصوص ادبی نشتریت پنہاں ہوتی ہے۔ ان کے یہ فقرے اور حاشیے ہماری سیاست، ادب، اور زندگی کی مختلف بے اعتدالیوں پر بڑا تیکھا طنز کرتے ہیں ان کے طنز میں مزاح کی نرمی اور گرمی کے ساتھ ساتھ توازن اور اعتدال بھی ملتا ہے جو فی زمانہ نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہے۔

ہفتہ وار بھوپال پنچ میں "اور بزم ابیتی رہی" علامہ ڈھیر کے نام سے تخلص بھوپالی لکھتے ہیں۔ تخلص کے قلم میں بجلی کی دھمک ضرور ہے مگر یہ زخموں پر پھائے رکھنے کے فن سے ناواقف ہے۔ زخموں کو کریدنا کوئی ان سے سیکھے ان کی شوخی نے بڑھ کر بے باکی اور بے حجابی کی صورت اختیار کر لی ہے۔

صدق جدید لکھنؤ، جنگ کراچی، نمکدان کراچی، امروز لاہور، قومی آواز لکھنؤ، ملاپ دہلی، بیسویں صدی دہلی، اور بھوپال پنچ بھوپال، کے علاوہ اس میدان میں روزنامہ نوائے وقت لاہور کا "سر راہے"، روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن میں کوہکن کا "شیشہ و تیشہ"، روزنامہ پاسبان ڈھاکہ میں پروفیسر ارشد کاکوی کا "شیشہ و تیشہ"، روزنامہ انجام کراچی میں رمضانی کا "برسبیل تذکرہ"، روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی میں علامہ ہر فن کا "قطعہ اور پیر مغاں نے کہا"، روزنامہ آبشار کلکتہ میں فرہاد کا "سنگ و خشت" اور ہفتہ وار آگ لکھنؤ میں علامہ نابنائی کا "تندور" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پچھلے دنوں ہماری محفل سے ریاض جرولی اور شاہد صدیقی اٹھ گئے۔ ریاض جرولی اودھ پنچ کے آخری دور کے پرانے لکھنے والوں میں سے تھے انھوں نے منشی سجاد حسین کی آنکھیں بھی دیکھی تھیں یہ ہمارے لیے اپنا قلمی دیوان "تفریحات ریاض" چھوڑ گئے ہیں۔ ریاض جرولی کا نام اودھ اکمہ اور مرثیہ اسپ ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھے گا۔ شاہد صدیقی کوہکن کے قلمی نام سے روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن میں شیشہ و تیشہ کا مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ شاہد قلم کے دھنی تھے، ان کے رنگ میں بڑی شوخی اور پرکاری تھی۔ ان کو شباب ہی میں موت نے آ لیا۔ دنیائے طنز و ظرافت کے لیے یہ دونوں حادثے ناقابل تلافی ہیں—— ان کے علاوہ اودھ پنچ لکھنؤ اور بھوپال پنچ بھوپال اس درمیان بند ہو گئے، پاک پنچ اور پھلجڑی بھی اس دوران نظر نہیں آئے ان رسائل کے بند ہونے پر ہمارے طنزیہ و مزاحیہ شعرا نے مرثیے نہیں کہے مگر پھر بھی ان حالات کا ماتم ضروری ہے جو اس کا ذمہ دار رہے۔

صحافت کے بعد ادب کا وسیع و عریض میدان شروع ہو جاتا ہے اردو کے مزاحیہ ادب میں مضمون نگاری کا وہی درجہ ہے جو شاعری میں غزل کا ہے سال بھر کے جائزے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے پرانے مزاح نگار رفتہ رفتہ میدان چھوڑ رہے ہیں۔ پرانی نسل میں گرمی، لگن اور فن پر ریاض کے مقابلے میں اطمینان، سہل پسندی اور خاموشی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ نئی نسل زیادہ دم خم کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ غزلوں کی طرح مضامین بھی بے تحاشہ لکھے جا رہے ہیں۔ مگر قابل ذکر مضامین بہ آسانی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، اچھے مضامین کی یہ افسوس ناک کمی خاصی تشویشناک ہے۔ مضمون نگاری (مزاح نگاری) دراصل ایک ایسی ریل گاڑی ہے جس میں صرف فرسٹ کلاس ہوتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے مسافروں کا اس میں گذر و سفر ممکن نہیں۔

اس سناٹے کو چراغ تلے اور اندیشۂ شہر نے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شوکت تھانوی کی "[illegible]" اور فرقت کاکوروی کی "مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں"، سال رواں کے مزاحیہ ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضامین رشید عرصہ سے نایاب تھی مگر اس سال اس کا بھی نیا ایڈیشن آگیا ہے۔

افسانے اس سال نہ لکھے جانے کے برابر لکھے گئے۔ شوکت تھانوی، شفیق الرحمان اور فکر تونسوی ہمارے قابل ذکر افسانہ نگار ہیں۔ ان میں شوکت تھانوی نے کچھ قابل توجہ افسانے اس دوران لکھے ہیں مگر شفیق الرحمن بالکل خاموش ہیں اور فکر تونسوی کالم نویسی کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔

ناولوں میں کرشن چندر کے گدھے کی واپسی، فکر تونسوی کا "پروفیسر بدھو"، سید ضمیر جعفری کی "تین لڑکیاں تین داماد"، محمد خالد اختر کی "شیخ قربان علی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیل جالبی نے منشی سجاد حسین کے ناول "حاجی بغلول" کو ایڈیٹ کیا ہے مگر انھوں نے اس کام کو محنت اور توجہ سے انجام نہیں دیا۔ "حاجی بغلول" کا سنہ تصنیف اور منشی صاحب کے حالات اس میں تقریباً ندارد ہیں۔ آخر میں انھوں نے کتاب کی جو فرہنگ تیار کی ہے وہ افسوسناک اغلاط سے پر عبارت ہے۔ مگر پھر بھی یہ اچھی کوشش ہے۔ منشی سجاد حسین کے دوسرے ناولوں (میٹھی چھری، طرحدار لونڈی، اور پیاری دنیا) کے نئے ایڈیشن بھی اس عرصہ میں سامنے آئے ہیں، سرشار کا "جام سرشار" اور ڈپٹی نذیر احمد کا ابن الوقت بھی شایع کیے گئے ہیں۔ ان سب کا تعلق ہماری کلاسکی ظرافت سے ہے۔

مرزا ظاہر دار بیگ، ابن الوقت، خوجی، چچا چھکن، خانم، مرزا جی، منشی جی اور قاضی جی کے علاوہ اس سال ہمارے مزاحیہ ادب میں دو نئے کرداروں کا خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا "مرزا ودود بیگ" اور عطیہ پروین کی "چچی"۔ مشتاق احمد یوسفی نئے مزاح نگاروں میں سب سے ممتاز اور محترم ہیں۔ چراغ تلے کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشید احمد صدیقی اور پطرس سے کہیں زیادہ خون خرابے کریں گے۔ ان کا مرزا ودود بیگ ہر وقت ان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مرزا کا کردار بہت جاندار اور جیتا جاگتا ہے۔ خوجی کی طرح اس کے کوئی جسمانی کوڑھ نہیں ہے۔ نہ یہ خوجی اور بغلول کی طرح منہ زور ہے عظمت کا احساس بھی ایک خاص انداز اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مرزا کے یہاں ملتا ہے غرض اردو کے ابتک کے تمام مزاحیہ کرداروں میں ظاہر دار بیگ، چچا چھکن اور شیطان کے بعد اتنا متوازن کردار ہمارے ادب میں یوسفی ہی نے پیش کیا ہے۔ عطیہ پروین کا چچی کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ چچی کی بوکھلاہٹ اور سٹرپٹا پن اپنے اندر ایک عظمت کا احساس لیے ہوئے ہے ان کا یہ مستقل کردار اپنے اندر بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ تخلص بھوپالی کی پاندان والی خالہ اور فکر تونسوی کے پروفیسر بدھو میں بھی مزاحیہ کردار کی ایک جھلک ملتی ہے۔ مگر ان میں ابھی وہ وسعت اور لچک نہیں پیدا ہو سکی ہے جو مزاحیہ کردار کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

ریڈیو اور اسٹیج کے لیے اس دوران برابر ڈرامے اور فیچر لکھے اور خاکے اڑائے گئے مگر اس درمیان ہمارے سامنے آنے والی چیزوں میں سلمان الارشد کا "سو سال بعد" ٹیڈی گرل کے لیے ضرورت رشتہ اور ڈاکٹر محمد حسن کا فٹ پاتھ کے شہزادے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاری کی صنعت پر خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی "ہم نفسان رفتہ"، شاہد احمد دہلوی کی "گنجینۂ گوہر"، سید ضمیر جعفری کے "اڑتے ہوئے خاکے" اور تخلص بھوپالی کا "پوسٹ مارٹم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہ منیر خاں صرف خاکے ہی لکھتے ہیں لیکن اگر وہ متفرق کرداروں کے خاکے اڑاتے رہنے کے کسی ایک کردار کے تخلیق کرنے پر اپنی ساری توجہ صرف کردیں تو اس بہانے اردو ادب میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہو جائے گا ویسے ان کے میر صاحب کے کردار میں بڑی صلاحیت ہے۔

پیروڈی کے میدان میں کنھیا لال کپور، شفیق الرحمان، غلام عباس، محمد خالد اختر، م۔ نسیم، ضیاء الحسن موسوی، نسیم درانی، تخلص بھوپالی اور اے آر ممتاز پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سال رواں کا اہم ترین کارنامہ کنھیا لال کپور کی پیروڈی "انارکلی" ہے۔

اردو ادب میں جدید انشائیہ کی تحریک کے قاید ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ "خیال پارے" ہمارے جدید انشائیہ ادب میں حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت سے اب تک ہمارے بیشتر انشائیہ نگاروں کے نئے انشائیے خیال پارے کی بازگشت اور انشائیہ پر مقالے خیال پارے کے مقدمے کا ناقص چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس میدان میں وزیر آغا اور مشکور حسین یاد کے علاوہ کم و بیش سب ہی "انشائیہ نگار" اس وقت انشائیہ نگاری کے نام پر مضمون نگاری اور مزاح نگاری میں مصروف ہیں۔ لطیف صدیقی کے مجموعے "شہرت کی خاطر" کو کسی طرح سے بھی انشائیوں کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ سیدھے سادھے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہیں۔ لطیف صدیقی دراصل ہمارے اچھے طنز و مزاح نگار ہیں نہ کہ انشائیہ نگار۔ اس دوران

انشائیہ کے نام سے جو مختلف انتخابات شایع ہوئے ہیں ان مجموعوں میں بھی ہم کو سوائے انشائیہ نگاری کے سب ہی کچھ مل جاتا ہے۔ دراصل یہ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کے شگفتہ انتخابات ہیں جن کو مضمون تو بآسانی قرار دیا جا سکتا ہے مگر انشائیہ ہرگز نہیں۔

اس سال تراجم کی رفتار بہت اطمینان بخش رہی۔ اسٹی فین لی کاک، مارک ٹوئن، وڈ ہاؤس، ہیز لٹ، اسو مُفیٹ اور ولیم سرویان وغیرہ کے مضامین کے تراجم خاصی تعداد میں پیش کیے گئے۔ ترجمے کے باب میں ل احمد، شاہد احمد دہلوی، عثمان غنی، ابن انشا، ابراہیم رضوی، ضیاء الحسن موسوی، ممتاز مفتی، افضل صدیقی، الطیف صدیقی، سریندر کمار اور اسرار عارفی کی کوششیں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈائری، رپورتاژ اور خطوط دراصل پیروڈی کی صورت میں زیادہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں شوکت تھانوی اور فرقت کاکوروی خاصے نمایاں رہے۔

نثر کے مقابلے میں دراصل شعروشاعری کے میدان میں زیادہ گرمی، جوش اور چہل پہل رہی۔ جوش، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، کوکبن، شاد عارفی، دلاور فگار، ابو المجاہد زاہد، قاضی غلام محمد، اے ڈی اظہر، نذیر احمد شیخ، ماچس لکھنوی، مسٹر دہلوی، ش ق بہرائچی، ظریف جبلپوری، شہباز امروہوی، رئیس امروہوی، مرزا محمود سرحدی، اور علامہ پاکٹ مار وغیرہ برابر اچھی تخلیقات پیش کرتے رہے۔ راجا مہدی علی خاں اور قاضی غلام محمد کے نئے مجموعۂ کلام کے علاوہ دلاور فگار کی ستم ظریفیاں، اے ڈی اظہر کی لذت آوارگی، ظریف جبلپوری کا فرمان ظرافت، ابو المجاہد زاہد کا رنگ و تاز، ناشاد کا کلام بے لگام، کلام لق لق (حاجی لق لق کے کلام کا نیا ایڈیشن) اس سال شایع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ سودا، غالب، اکبر اور شاد عارفی وغیرہ کے شعری مجموعے پاکٹ بکس کی شکل میں شایع ہوئے ہیں۔ پاکٹ بک والوں نے طنزیہ غزلیں اور نظمیں اور مزاحیہ غزلیں اور نظمیں کے عنوان سے دو انتخابی مجموعے بھی پیش کیے ہیں مگر ان دونوں مجموعوں میں ایک تو سنجیدہ نگارشات اور مروت کا دخل ہے دوسرے تاریخ اور معیار کا احساس ناپید ہے۔

طنز و مزاح پر ادھر تنقید و تحقیق کا خاصا کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی (اکبر اور نئی علامات) ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ نگاری، پطرس اور حاجی بغلول) ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو ادب میں طنز و مزاح) اسلوب احمد انصاری (ہمنفسان رفتہ) منظفر علی سید (اردو مزاح میں ایک نئی آواز) ممتاز حسین (ایک نیا مزاح نگار) طفیل احمد جمالی، بشیر بدر، منظر سلیم، رام لعل (اندیشۂ شہر کی ظرافت) احمد جمال پاشا بہ حیثیت مزاح نگار۔ ایک نیا طنز نگار) ڈاکٹر اعجاز نقوی (اردو کی مزاحیہ صحافت، اردو کے مزاحیہ کردار، ایک نیا طنز و مزاح نگار) آفتاب اختر (اردو ظرافت کے خالص نمونے) کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ نے طنز و مزاح سے متعلق موضوعات پر بہت جاندار مقالے لکھے ہیں۔

ہمارے بیشتر ناقدین کی کمزوری ہے کہ وہ طنز و مزاح پر توجہ نہیں دیتے، چبائے ہوئے نوالے کھاتے اور کہی ہوئی باتیں دہراتے رہتے ہیں۔ دوسرے ان کے یہاں مطالعے کی کمی کا افسوس ناک حد تک شدید احساس ہوتا ہے۔

لطیفے ہمارے رسائل اور اخبارات میں برابر شایع ہوتے رہے ان میں نئے لطائف کی پھلجڑیوں کے ساتھ پرانے اور گھسے پٹے لطائف بھی برابر دہرائے جاتے رہے۔ نمکدان، بھوپال پنچ، پھلجڑی، جائزہ، کھلونا، بھائی جان، کلیاں، داستان گو، سرپنچ، نصرت اور دوسرے رسائل میں اکثر اچھے اور معیاری لطائف بھی دل کو فرحت بخشتے رہے۔ ریڈیو سے ملا نصر الدین کے لطائف نشر کیے گئے ان کے علاوہ تبسم از تبسم، قہقہے اور نرم گرم جیسے مجموعے بھی شایع ہوئے اس درمیان انگریزی اور دوسری زبانوں کے اچھے لطیفے بھی بہ کثرت ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچے۔

کارٹون بنانے والے کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر دنیا کے عظیم ترین مسائل کی ناہمواری کو اس رخ سے پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کا مضحک پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ایسی ہنسی آتی ہے جو ہماری فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جمیل، حمید برہان، انجم، شنکر، سدھیر، عزیز، احمد، پرکاش، محمود وہاب اور شہاب جیسے ممتاز کارٹون کاروں نے اپنے نرم گرم خطوط کے ذریعہ سیاست ادب، فلم اور زندگی کے ہر گوشے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ قیامت کی پیشگوئی کرنے والے نجومیوں، لیڈر ساربان، ٹیڈی ازم، سیاست، لیڈری، عشق، بے ٹکٹ مسافر، تیز رفتار سواریاں، عالمی، مرکزی، صوبائی اور مقامی ارباب حل و عقد، ادیب، شاعر، فلسفی، فیشن کے مارے، بوہیمی، قومی یکجہتی، امن عالم، اتحاد و انسانیت کے نعرے لگانے والے، غذا میں آمیزش کرنے والے اور ٹیکس پر ٹیکس لگانے والوں کی

(باقی صفحہ ۱۱۰)

مخمور سعیدی

اجنبیت بہم اس درجہ کہاں تھی پہلے
تھی وہاں بھی یہی صورت جو یہاں تھی پہلے

اب اک آنسو بھی نہیں ہے سرِ مژگاں لیکن
چشمِ تر تھی کہ جواہر کی دکاں تھی پہلے

وہ فسونِ نگہِ ناز، ارے کیا کہنا
ٹھہری ٹھہری سی عمرِ گزراں تھی پہلے

بن گئی کلفتِ دل تلخئ جاں کیا کہیے
جو نظر راحتِ دل عشرتِ جاں تھی پہلے

کردیا آبلہ پایانِ جنوں نے سیراب
خاکِ ہر دشت و چمن، تشنہ دہاں تھی پہلے

یہ نتیجہ ہے ترے غم سے سبکدوشی کا
زندگی اتنی گراں بار کہاں تھی پہلے

اب بھنور بن کے ڈبونے کو جو بیتاب ہوئیں
کشتئ دل انھیں موجوں پہ رواں تھی پہلے

زندگی بھر کے لیے روگ بنی جاتی ہے
اک خلش سی جو قریبِ رگِ جاں تھی پہلے

کتنی محجوب سی دنیا کی طرف اُٹھتی ہے
وہ نظر جو تری جانب نگراں تھی پہلے

ہم اک امید پہ بڑھ آئے ہیں آگے مخمور
ورنہ دنیا وہیں اب تک ہے جہاں تھی پہلے

	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	جدید اڈیشن میں صفحہ	جدید اڈیشن میں سطر
۱	۲۱	۳	سکا تھا	چکا تھا	۱۲۶	۴
۲	۲۴	۴	کوہ طور	فرطور	۱۳۴	۴
۳	۳۱	۱۳	محنت	مشقت		
۴	۳۵	۱۵	مند	بند		
۵	۳۷	۱	اپنے مال	اپنے بال	۱۶۱	۶
۶	۵۰	آخری	انتظار	انتظام	۱۸۵	۸
۷	۵۱	″	یہ بڑی	ہے تری	۱۸۷	۹
۸	۵۴	″	نام کی	قوم کی	۱۹۱	۱۳
۹	۷۹	نوٹ سطر ۲	خوف	خون	۲۳۲	۰
۱۰	۹۱	۱۵	کس جال	کس حال	۲۶۰	۳
۱۱	۹۲	۹	یاد ہو	یاد ہیں	۲۶۲	۳
۱۲	۹۳	۱۳	بہادر	بہادر مرحوم	۲۶۴	۲

اس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہ جدید اڈیشن میں، بعض غلطیاں درست کردی گئی ہیں، اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا ہے، نیز قدیم اڈیشن کے، اس "صحت نامے" میں بھی، بعض غلطیوں کی جو نشان دہی کی گئی ہے، وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔ شمار کے ہندسے، صحت نامے کے مطابق ہیں۔

(۱) جدید اڈیشن میں یہ غلطی نہیں ہے۔

باب الانتقاد

جذباتِ نادر (ترقی اردو بورڈ ایڈیشن) پر ایک نظر

رشید حسن خاں

نادر علی خاں نادر کاکوروی (متوفی اکتوبر ۱۹۱۲ء) اپنے زمانے کے معروف شاعر اور نظم نگاری کی تحریکِ جدید کے قابلِ ذکر نمایندے تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، اور اُس طرز کی طبع زاد نظمیں بھی کہیں۔ ان کا ایک ترجمہ "گزرے ہوئے زمانے کی یاد" آج بھی تاثیر و دلکشی کا اعلا نمونہ ہے۔ خیال کو زیادہ سے زیادہ سادگی کے ساتھ پیش کرنا، بھاری بھرکم الفاظ اور پرشور اندازِ بیان سے دامن بچانا، اور لفظوں کے انتخاب میں، مرصع سازی کے بجائے محض خیال کی ضرورت کا خیال رکھنا، اُن کا خاص انداز تھا۔ اُن کی نظموں میں ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ شاعر کے پیشِ نظر طرزِ ادا میں پیچ و خم پیدا کرنے، چونکا دینے والا اندازِ بیان اختیار کرنے، اور مرصع شعر گوئی کے بجائے، کسی خیال کو پُر وضاحت انداز سے نظم کر دینے کا اصول رہتا تھا۔ اُن کی کچھ نظمیں یقیناً ایسی ہیں، جن کو پڑھ کر آج کے بہت سے نوجوان نظم نگار (جو ابہام و ژولیدہ بیانی کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور اپنے ساتھ دوسروں کے صبر و ضبط کا بھی جا و بے جا امتحان لیتے رہتے ہیں) بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

[illegible] آزاد کے بعد جن لوگوں نے نظمِ جدید کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، اور اُردو نظم کو مغربی خیالات و اندازِ بیان سے آشنا کیا، اور اِس طرح اُس میں [illegible]

طنز و مزاح پر ادھر تنقید و تحقیق [illegible] نادر کا نام بھی ہے۔ اُن کے ذکر کے بغیر [illegible] رکھی جائزہ مکمل نہیں [illegible]

شوکت سبزواری (اردو ادب میں طنز و مزاح) [illegible] منظفر علی سید (اردو مزاح میں ایک نئی آواز) [illegible]

نیا مزاح نگار) طفیل احمد جمالی، بشیر بدر، منظر سلیم، رام لعل (اندیشۂ شہر کی ظرافت) احمد جمال پاشا بہ حیثیت مزاح نگار - ایک نیا طنز نگار)

ڈاکٹر اعجاز نقوی (اردو کی مزاحیہ صحافت، اردو کے مزاحیہ کردار، ایک نیا طنز و مزاح نگار) آفتاب اختر (اردو ظرافت کے خالص نمونے)

کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ نے طنز و مزاح سے متعلق موضوعات پر بہت جاندار مقالے لکھے ہیں۔

ہمارے بیشتر ناقدین کی کمزوری ہے کہ وہ طنز و مزاح پر توجہ نہیں دیتے، چبائے ہوئے نوالے کھاتے اور کہی ہوئی باتیں دہراتے رہتے ہیں۔ دوسرے ان سب کے یہاں مطالعے کی کمی کا افسوس ناک حد تک شدید احساس ہوتا ہے۔

لطیفے ہمارے رسائل اور اخبارات میں برابر شایع ہوتے رہے ان میں نئے لطائف کی پھلجھڑیوں کے ساتھ پرانے اور گھسے پٹے لطائف بھی برابر دہرائے جاتے رہے۔ نمکدان، بھوپال پنچ، پھلجھڑی، جائزہ، کھلونا، بھائی جان، کلیاں، داستان گو، سرپنچ، نصرت اور دوسرے رسائل میں اکثر اچھے اور معیاری لطائف بھی دل کو فرحت بخشتے رہے۔ ریڈیو سے ملا نصر الدین کے لطائف نشر کیے گئے ان کے علاوہ تبسم، زیرِ تبسم، قہقہے اور نرم گرم جیسے مجموعے بھی شایع ہوئے اس درمیان انگریزی اور دوسری زبانوں کے اچھے لطیفے بھی بہ کثرت ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچے۔

کارٹون بنانے والے کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر دنیا کے عظیم ترین مسائل کی ناہمواری کو اس رخ سے پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کا مضحک پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ایسی ہنسی آتی ہے جو ہماری فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جمیل، حمید، پران، انجم، شنکر، سدابہار، عزیز، احمد، پرکاش، محمود وہاب اور شہاب جیسے ممتاز کارٹون نگاروں نے اپنے نرم گرم خطوط کے ذریعہ سیاست، ادب، فلم اور زندگی کے ہر گوشے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ قیامت کی پیشگوئی کرنے والے نجومیوں، لیڈر، ساربان، ٹیڈی ازم، سیاست، لیڈری، عشق، بے ٹکٹ مسافر، تیز رفتار سواریاں، عالمی، مرکزی، صوبائی اور مقامی اربابِ حل و عقد، ادیب، شاعر، فلسفی، فیشن کے مارے، بوہیمیا، قومی یک جہتی، امنِ عالم، اتحاد و انسانیت کے نعرے لگانے والے، غذا میں آمیزش کرنے والے اور ٹیکس پر ٹیکس لگانے والوں کی

(باقی صفحہ ۱۱۰)

اس سے نئے اڈیشن کی تصحیح کریں، اور پھر پڑھیں. پرانا اڈیشن بقولِ مرتب، نایاب کی حد تک کم یاب ہے، اس لیے نتیجہ معلوم !!

اسی طرح جو لوگ یہ چاہتے ہیں، کہ نادر کا مکمل کلام پڑھیں، وہ اس مجموعے کو خریدنے کے بعد مختلف لائبریریوں میں جاکر پرانے رسائل کی ورق گردانی کریں، اور اُن نکلوں کو نقل کریں، جو اس مجموعے میں نہیں ہیں، یہ کوئی میر و سودا کا کلیات تو تھا نہیں، جن کو ہر شخص مرتب نہیں کر سکتا. معمولی تلاش اور ضروری اہتمام سے کام لیا جاتا، تو مکمل مجموعہ بہ آسانی مرتب ہو سکتا تھا. اگر اتنی مشکل پسندی بھی بارِ خاطر ہو، تو اس پھیر میں پڑنے ہی کی کیا ضرورت ہے !! معمولی پبلشر یہ کاروبار ضرور کرتے ہیں کہ کسی کتاب کو ردی میں سے ڈھونڈ نکالا، یا کسی لائبریری سے لے آئے، اور اُس کو حوالۂ کاتب کر دیا، نیا اڈیشن بہ آسانی تیار ہو گیا۔

ذیل میں کچھ فرو گذاشتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اِس توقع کے ساتھ کہ آئندہ جو کتابیں شائع ہوں وہ اِس آلودگی سے پاک رہیں. تاکہ ایسے ادارہ کے معیار و اعتبار پر حرف نہ آئے۔

"جذباتِ نادر" حصہ، دوم کے قدیم اڈیشن میں، حمد، منظومات کے بعد اور مثنوی سے پہلے، ایک صفحے کا "صحت نامہ" ہے. جس میں بارہ غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے. نئے اڈیشن میں وہ غائب ہے، اور غلطیوں کی تصحیح بھی نہیں کی گئی ہے. حالانکہ اصولاً. اِس اڈیشن میں اُن غلطیوں کی تصحیح کرنا چاہیے تھی. اور اگر نقل مطابقِ اصل کا لحاظ رکھتے ہوئے، اُن غلطیوں کو بھی بعینہٖ رکھنا ضروری تھا، تو صحت نامے کو بھی نقل کرنا ضروری تھا. ذیل میں قدیم اڈیشن سے اُس صحت نامے کو نقل کیا جاتا ہے. آسانی کے لیے، صحت نامے میں بائیں طرف نئے اڈیشن کے صفحات اور سطروں کو بھی درج کر دیا گیا ہے. نیز شروع میں نمبر شمار کا بھی اضافہ کیا گیا ہے:

صحت نامہ جذباتِ نادر					جدید اڈیشن میں	
نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر
۱	۲۱	۳	سکا تھا	چکا تھا	۱۲۶	۴
۲	۲۴	۴	کوہ طور	فرطور	۱۳۴	۴
۳	۳۱	۱۳	محنت	مشقت		
۴	۳۵	۱۵	مند	بند		
۵	۳۷	۱	اپنے مال	اپنے بال	۱۶۱	۶
۶	۵۰	(آخری)	انتکار	انتظام	۱۸۵	۸
۷	۵۱	؍؍	یہ بڑی	ہے تری	۱۸۷	۹
۸	۵۴	؍؍	نام کی	قوم کی	۱۹۱	۱۳
۹	۷۹	فٹ نوٹ سطر ۲	خوف	خون	۲۳۲	۰
۱۰	۹۱	۱۵	کس جال	کس حال	۲۶۰	۳
۱۱	۹۲	۹	یاد ہو	یاد میں	۲۶۲	۳
۱۲	۹۳	۱۳	بہادر	بہادر مرحوم	۲۶۴	۲

اس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہ جدید اڈیشن میں، بعض غلطیاں درست کر دی گئی ہیں، اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا ہے، نیز قدیم اڈیشن کے اس "صحت نامے" میں بھی، بعض غلطیوں کی جو نشان دہی کی گئی ہے، وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے. تفصیل درج ذیل ہے. شمار کے ہندسے، صحت نامے کے مطابق ہیں۔

(۱) جدید اڈیشن میں یہ غلطی نہیں ہے۔

(۲) قدیم اڈیشن میں "کوہ نور" ہے۔ یہی جدید اڈیشن میں ہے۔ اور صحیح بھی یہی ہے۔ "صحت نامہ" میں اس کو غلط لکھا گیا ہے۔ پہلے مصرع میں "کوہ طور" ہے اور یہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۳) یہ تصحیح بھی "صحت نامہ" میں غلط کی گئی ہے۔ قدیم و جدید میں یہاں "محنت" ہے اور ٹھیک ہے۔

(۴) "صحت نامہ" میں یہ تصحیح بھی بے محل ہے۔ شعر میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

(۵) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۶) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔ مرتب نے جگہ جگہ اس کا التزام کیا ہے کہ اگر کوئی لفظ غلط نظم کیا گیا ہے یا قافیہ کہیں غلط ہے، تو حاشیے میں نوٹ دے دیا ہے۔ لیکن یہاں قافیے میں "انتقام" کے بجائے "انتظار" لکھا ہوا ہے (قدیم اڈیشن کے مطابق) اور اس کو علی حالہٖ چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۷) "صحت نامہ" کے لحاظ سے، قدیم اڈیشن میں "یہ بڑی" ہونا چاہیے۔ لیکن متن میں "یہ تری آب و ہوا میں گونہ تاثیر نشاط" درج ہے۔ یہی جدید میں ہے۔ اس لحاظ سے "غلط" کے خانے میں "یہ بڑی" صحیح نہیں ہے۔ البتہ تصحیح ٹھیک کی گئی ہے۔ یعنی "ہے تری آب و ہوا میں" ہونا چاہیے۔ جدید میں۔ نقل مطابق اصل سے کام لیا گیا ہے۔

(۸) یہ غلطی جدید اڈیشن میں بعینہٖ موجود ہے۔ تعجب ہے کہ مرتب صاحب کو اس مصرع میں کوئی عیب نظر نہیں آیا ع نام کی خدمت سے اپنے کو بچا جاتا تھا میں۔

(۹) یہاں جدید میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۱۰) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۱۱) صحت نامے میں "یا دہو" کے بجائے، "یا دہیں" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جدید اڈیشن میں، اس کی صحت نامے کے مطابق تو تصحیح نہیں کی گئی ہے۔ البتہ تصحیح مزید سے کام لے کر، یہاں، "یا دہوں" لکھا گیا ہے۔

(۱۲) جدید میں تصحیح نہیں کی گئی ہے۔

سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے، کہ جدید اڈیشن میں جگہ جگہ متن غلط ہے۔ اور اس سلسلے میں بے حد بے احتیاطی یا بے پروائی سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے کچھ مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

جدید اڈیشن میں	قدیم اڈیشن میں
یہ جس میں ہو آب دار (ص ۲۴۰)	جس میں ہے
میں آپ کی لگائے رہوں (ص ۲۵۰)	میں آپ ہی
اب خبط یادہ گوئی دور و دراز (ص ۲۵۰)	یادہ گردی دور و دراز
شب غم نیند بھی اول تو (ص ۲۵۵)	نیند ہی اول تو
آہ بھی تیر ہے گر آہ ہو تاخیر کے ساتھ (ص ۲۵۷)	گر آہ ہے
گویا ندیا بہتی جاتی ہے (ص ۱۸۲)	گویا دنیا (یہ نظم رسالۂ زمانہ مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں دنیا کے بجائے کشتی ہے)
سارنگی کی تال وہ سریلی (ص ۲۹۱)	تان وہ سریلی
بگولوں میں ہوا کے اڑتی ہیں اور پھڑ پھڑاتی ہیں (۲۰۰)	پھر پھر اتی ہیں۔
ابھی اک کھیپ آئی ہے ابھی اک آنے والی ہے (ص ۱۷۶)	ابھی اک کھیپ آئی اور ابھی اک آنے والی ہے
اور اک کھنڈلا کہ تھا وہ گنبد افراسیاب (ص ۲۴۱)	اور اک کھنڈ ہل کہ تھا وہ

اتناکہ اس میں سوز ہے (اور) اس میں ساز ہے (ص ۲۵۱) — قدیم میں لفظ "اور" موجود ہے پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو قوسین میں کیوں لکھا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا قدیم میں "اور" نہیں تھا مرتب نے اضافہ کیا ہے۔

اچھا ہے بہت ہندو مسلماں کا اتفاق — قدیم میں۔ لفظ "بہت" نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اس کو قوسین میں لکھنا چاہیے تھا۔

ص ۲۳۹ پر حاشیے میں یہ عبارت بھی موجود ہے: "۲ حاشیہ از نادر، رنجی والملیک"۔ یہ عبارت قدیم اڈیشن میں نہیں ہے۔ البتہ ۱ کے تحت جو عبارت درج کی گئی ہے، وہ قدیم میں موجود ہے (یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ نظم جولائی ۱۸۸۸ء کے زمانہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پہلا حاشیہ بھی نہیں ہے۔)

مرتب نے یہ اہتمام کیا ہے، کہ جہاں کوئی لفظ غلط نظم ہوا ہے، یا اور کوئی فروگذاشت ہوگئی ہے، اُس کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن متعدد مقامات ایسے ہیں، جہاں یہ التزام قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اِس سے عجیب صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ گویا مرتب کی رائے میں ان مقامات پر کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے! ایسے چند مقامات درج ذیل ہیں۔

ص ۲۴۳ پر رباعی کا ایک مصرع ہے۔ "ٹوٹی ہوئی شیشہ کی رہی ہے جھنکار"۔ قدیم میں بھی "ٹوٹی ہوئی" لکھا ہے۔ نقل مطابقِ اصل، کی دھن میں یہ نہیں دیکھا گیا، کہ یہاں "ٹوٹے ہوئے" کا محل ہے۔ اگر قدیم کتابت میں تصرف شاملِ گستاخی تھا، تو "کذا" ہی لکھ دیا جاتا۔

ص ۲۷۷ پر ایک شعر ہے ؎ خم و مینا میں تلچھٹ کیا کہ اک آخور باقی ہے ؎ مگر مستوں کے دل میں شوق ابھی بے طور باقی ہے۔ اس شعر میں لفظ "بے طور" پر یہ حاشیہ لکھا گیا ہے۔

"آخور میں واو مجہول ہے۔ دور، طور میں معروف۔ مرتب۔ م"

مجھ کو اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے کہ میں یہاں "بے طور" میں "طور" کو بہ فتحِ اول سمجھتا تھا، اب معلوم ہوا کہ یہ بہ ضمِ اول ہے اور بہ واوِ معروف! سبحان اللہ!! اِس سے قطع نظر کرکے یہ عرض کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ حاشیے کی عبارت مفہوم سے بے نیاز ہے۔

ص ۲۷۵ پر یہ مصرع ع یہ رفتگانِ خاک جن کی تمام عمر — صریحاً ساقط الوزن ہے۔ اور اس پر کوئی نوٹ نہیں ہے۔

ص ۲۷۷ پر مندرجہ ذیل بند بھی ہے۔

کیا ہے بشر ایک خوشنما طائر ہے — مجبور کبھی کبھی یہ زور آور ہے
نالاں ہے کبھی بارِ زمیں کے نیچے — اور زمزمہ ساز یہ کبھی اس پر ہے

مرتب نے کسی جگہ حاشیے میں یہ لکھا ہے کہ یہاں قافیہ صحیح نہیں ہے۔ حرکات بدل گئی ہیں، لیکن طائر، اور زور آور میں اُن کو کوئی غلطی محسوس نہیں ہوئی۔

ص ۳۰۲ پر ایک مصرع ہے، ع افسوس اک بات وہ بھی جزبات۔ مرتب نے لفظ "جز" سے متعلق حاشیے میں لکھا ہے "کذا"۔ گویا یہ لفظ "جز" ان کی رائے میں صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں "جزبات" "جزوی بات" کے مفہوم میں ہے اور صحیح ہے۔

اِسی صفحے پر ایک مصرعہ ہے ع ایک شکوہ ایک بے اصل بات — اس پر مرتب نے نوٹ دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ نادر نے یہاں قافیے میں لفظ "اصل" کو تلفظِ عام کے مطابق نظم کیا ہے لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ابتدائے مصرع میں لفظ "ایک" نے مصرع کو ساقط الوزن بنا دیا ہے "اک" کا محل ہے۔

• صحت املا اور یکسانیت املا کا حال سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں میں، اس کا بھی اہتمام نہیں کیا جا سکتا! چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

املا میں یکسانیت کی نام کی کوئی چیز نہیں ہے ایک لفظ چار جگہ ایک طرح ہے، دس جگہ دوسری طرح، مثلاً۔

مجکو ص - ۱۰۱، ۱۲۹، نیز ۱۳۴، ۱۳۵ — مجھکو ص - ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۳۳ — مجھ کو ص ۱۳۴، ۱۵۵

مجکو ص ۱۳۵　تجکو ص ۱۲۷، ۱۳۳، بجھ کو ص ۹۱، ۱۴۵

اسکو ص ۲۲۰　اس کو ص ۲۳۳

ڈھونڈھتا ص ۱۲۶، ۱۲۸،　ڈھونڈتا ص ۱۴۰

غلط املا کی بھی کمی نہیں ہے۔ میں صرف ایسے الفاظ کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن کے آخر میں ایک ھ زائد ہے۔

آنکھہ ص ۸۹، ۱۴۵ — دیکھہ ص ۹۰، ۱۳۰ — ساتھہ ص ۱۲۷ — تجھہ ص ۱۲۸، ۱۳۲

مجھہ ص ۱۳۱، ۱۳۲ — بیٹھہ ص ۱۲۹ — کچھہ ص ۱۳۳ — تجھھی ص ۱۴۰ — ہاتھہ ص ۱۴۵

مندرجۂ بالا دونوں طرح کی مثالیں، محض مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں اتنی ہی بہتات ہے، جتنی امانت کے یہاں ضلع جگت کی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف ھ کے اضافے ہی تک یہ غلطی محدود ہے۔ ایسے بھی مقامات ہیں، جہاں ھ ہونا چاہیئے، اور غائب ہے مثلاً ڈیوڑھی ڈیوڑی بن گئی ہے (ص ۱۰۸) اور صرف ھ کی کمی زیادتی تک بھی یہ محدود نہیں ہے۔ وہ ساری غلطی ہائے املا موجود ہیں، جو معمولی معمولی ناشروں کی شائع کی ہوئی کتابوں میں ہوتی ہیں۔

منشی فخرالدین سفیر کاکوروی، نادر کے ہم عصر بھی تھے اور ہم وطن بھی۔ انھوں نے نادر کی وفات پر، رسالۂ زمانہ کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کو جدید اڈیشن کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن کئی بوالعجبیوں کے ساتھ۔ مضمون سے پہلے مرتب صاحب نے بطور تعارف لکھا ہے:

"نادر کاکوروی کی وفات پر صفیر بلگرامی کا اظہار تعزیت"

ملاحظہ فرمایا! مرتب صاحب کی رائے میں سفیر کاکوروی[1]، اور صفیر بلگرامی[2] میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھا ہوا ہے "صفیر از کاکوری" مقدمے کے آخر میں مرتب نے لکھا ہے: "اس مجموعے میں صفیر کاکوروی مرحوم کا ایک مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے"۔ یہاں وہ "بلگرامی" تو نہیں بنے، البتہ صفیر (بہ صاد) بدستور بنے رہے۔

مرتب نے کئی جگہ دعوا کیا ہے، کہ نقل مطابقِ اصل کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ دعوا صحیح نہیں ہے۔ دو، تین مثالیں، محض اثباتِ مدعا کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

مثنوی لالہ رخ کے آغاز میں ص ۱۲۷ پر پہلی سطر میں لکھا ہوا ہے (نقل سرورق) گویا اس صفحے پر قدیم اڈیشن کے صفحۂ اول کی مکمل نقل ہے۔ (۱) شروع میں لکھا ہوا ہے: "مثنوی لائٹ آف دی حرم"۔ جب کہ قدیم میں صرف "مثنوی لائٹ آف حرم" ہے (۲) اسی طرح چھٹی سطر میں "مثنوی لالہ رخ" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں صرف "لالہ رخ" ہے۔ (۳) اسی طرح ص ۲۰۲ پر مرتب نے آخری سطر میں لکھا ہے (منقول از نسخۂ اول بجز شمار صفحات) اگر نقل مطابق اصل کا پورا پورا حساب کتاب کیا جائے، تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قدیم فہرست میں عنوانات ۱۹ ہیں، جب کہ اس میں ۲۱ ہیں۔ بات یہ ہے کہ دو عنوان "اسبابِ ملال" اور "نور محل کی خوش الحانی" فہرست میں شامل نہیں تھے، اصل کتاب میں موجود تھے۔ اگر مرتب کی مراد یہ ہے کہ یہ صفحہ بالکل قدیم اڈیشن کے صفحے کی نقل

---

[1] سفیر کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے، خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۱۹۔

[2] صفیر بلگرامی کا انتقال ۱۳۰۷ھ میں ہوا ہے (۱۸۸۹ء) تاریخ لطیف (قلمی، کتاب خانہ رام پور) میں جلال کے صاحبزادے، میر مہدی کمال کا قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:

کلک نے لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال　　لو ہوئے جا کے اب صفیر، روح الامیں کے ہم صفیر

ہے، تو اس کا اظہار ضروری تھا کہ یہاں یہ عنوانات اضافہ مرتب ہیں۔ اس کے علاوہ سطر اول میں "لائٹ آف دی حرم" میں لفظ "دی" زائد ہے۔ قدیم میں "لائٹ آف حرم" ہے۔

قدیم اڈیشن میں رباعی "خمخانہ میں میرے جشنِ احباب رہے" "نغمۂ تمہید" کے بعد ہے۔ جدید میں "نغمۂ تمہید" سے پہلے علاحدہ ایک صفحے پر درج ہے۔

جدید اڈیشن میں ص ۷، پر فہرست مضامین حصۂ دوم ہے۔ ص ۷، کے آخر میں قوسین میں لکھا ہوا ہے (علاوہ شمارۂ صفحات اصل نسخے سے منقول ا[ہے]) کا عالم یہ ہے کہ جدید اڈیشن میں شمارۂ ۳۳ کے آگے صرف "غزلیات" لکھا ہوا ہے، جب کہ قدیم میں "غزلیات عاشقانہ فارسی و اردو" لکھا ہوا ہے۔ شمارہ ۳۴ کے آگے، جدید اڈیشن میں "متفرقات" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں، اس کے بجائے یہ عبارت ہے: "تاریخ دیوان ملک الشعرا امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں صاحب بہادر ممتاز جنگ مرحوم"

قدیم رسائل کی ورق گردانی کی جاتی، تو نادر کی منتشر نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تصریحات یا ان سے متعلق باتیں بھی مل جاتیں، جن کو مقدمے یا حواشی میں [پ]یش کیا جاتا تو بعض اعتبارات سے افادیت میں خاصا اضافہ ہو جاتا، ایسے چند حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نادر کی نظم "دو تصویریں" قدیم و جدید اڈیشن میں موجود ہے۔ یہ نظم زمانہ بابتہ اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر نادر کا یہ نوٹ تھا جو مجموعے میں نہیں ہے۔ کلام نادر کا حصۂ دوم، ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے دانستہ اس نوٹ کو چھوڑ دیا، یا غلطی سے شامل ہونے سے رہ گیا۔ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اور نظموں پر ایسے نوٹ موجود ہیں۔ یہ نوٹ درج ذیل ہے:

"انسان بطنِ قدرت سے ایک خوبصورت معصوم اور پاک جسم لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر آلایشات دنیا سے ملوث ہوتا، اور ترقی معکوس کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتہائے عمر کو پہنچ کر وہ انتہا درجہ کا بدصورت، گناہگار اور ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور ہرگز اس قابل نہیں رہتا، کہ ایک منٹ کے لیے دنیا میں زندہ چھوڑ دیا جائے۔

یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مذہب اس قانون قدرت کو رد کرنے میں کہاں تک قادر اور کہاں تک مجبور ہے۔ اور کہاں تک اس منطقی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن ایک انگریزی شاعر نے اس ہیبت ناک تصویر کے دو رخ جس سادگی سے دکھائے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین کو ایک نظر دکھائے جائیں۔ اور ان کو اس مسئلے پر غور کرنے کا ایک بار موقع دیا جائے۔ (نادر)

۱۹۲۸ء میں زمانہ کا جبلی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں منشی دیا نرائن نگم نے "یاد رفتگاں" کے عنوان کے تحت متعدد لوگوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں نادر بھی ہیں، متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے:

"جن اصحاب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستان ربیع" "نادر بہار" "دعوت گل" "شعاع امید" "نغمۂ شاعری" ملاحظہ فرمائی ہیں، ان کے دلوں سے اس محب وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہو سکتی ہے۔ افسوس نادر کاکوروی صرف ۲۵ برس کی عمر میں اکتوبر ۱۹۱۲ء میں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ موجزن تھا اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے، اور طرز جدید میں خوب خوب نظمیں کہتے تھے، جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں جب سے زمانہ کا سلسلۂ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرنے لگے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں بھی کہہ کر، اپنے زور طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے۔ ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خورد مسٹر رام نرائن نگم کی شادی ہوئی، تو آپ نے ایک مرقع سہرا کہہ کر بھیجا تھا جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔"

لے زمانہ میں یہاں ۱۹۱۳ء لکھا ہوا ہے، جو غلطی کتابت ہے۔ نادر کی وفات پر سفیر کاکوروی کا تعزیتی خط اکتوبر ۱۹۱۲ء کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اڈیٹر کا بھی ایک نوٹ تھا جس کا پہلا جملہ یہ ہے "پریس جاتے وقت ہم کو یہ افسوس ناک خط ملا۔"

رسالۂ الناظر (لکھنؤ) کے شمارۂ فروری ۱۹۱۳ء میں تین "قطعات تاریخ وفات نادر" شائع ہوئے تھے جن کے تاریخی مصرعے درج ذیل ہیں:۔

شاعرِ بے مثل و دمساز جہاں — (مولوی احسین اختر جلال آبادی)

اب سدھارے سوئے جنت نادرِ کاکوروی ۱۳۳۰ھ — (الٰہی بخش ناشر)

رو رو کے لکھ رہے ہیں تاریخ موت نادر ۱۳۳۰ھ — (محمد صدیق خاں رعد جونپوری)

ص ۱۷۲ پر ایک نظم ہے بہ عنوان "آہ یہ ہوگا" ۱۹۱۲ء۔ یہ نظم مخزن کے شمارۂ اگست ۱۹۰۷ء میں "فنا" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

نادر کے کلام کا دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا، اُن کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے، دو ڈھائی سال کی مدت میں اُنھوں نے جو نظمیں کہیں وہ مختلف رسالوں میں محفوظ ہیں۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اس جدید اڈیشن میں اُن کو شامل کر لیا جاتا۔ کیونکہ قدیم رسالوں کے فائل اب ہر جگہ بہ آسانی نہیں ملتے ہیں۔ اور کچھ دنوں کے بعد، یہ بہ مشکل بھی نہیں ملیں گے۔ ذیل میں ایسی نظموں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے، جو میری نظر سے مختلف رسائل میں گزری ہیں۔ میں یہ تو قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ ان نظموں کے علاوہ، ان کی کوئی نظم اور نہیں ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص بالاستیعاب رسائل کا جائزہ لے، تو ایک دو نظموں سے زیادہ کا اضافہ شاید نہیں ہو سکے گا۔ میری نظر میں بہر حال ان نظموں کے علاوہ، اُن کی کوئی نظم نہیں ہے۔

(۱) صحیفۂ فطرت — زمانہ، فروری ۱۳ء
(۲) سوزِ عشق — زمانہ، شمارۂ ستمبر و اکتوبر ۱۲ء
(۳) سیرِ دریا — ادیب، جنوری ۱۱ء
(۴) سہ مصرعی — مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء
(۵) امامباڑۂ لکھنؤ — زمانہ، جولائی ۱۲ء
(۶) پروانۂ جاں سوز — زمانہ، جون ۱۵ء
(۷) سوزِ پروانہ — زمانہ، جولائی ۱۵ء
(۸) جلوۂ امید — زمانہ، اگست ۱۲ء
(۹) نپولین اور کمسن جہازی — زمانہ، جنوری ۱۱ء
(۱۰) غزل — زمانہ، اکتوبر ۱۲ء
(۱۱) سالِ گذشتہ — زمانہ، جنوری ۱۲ء
(۱۲) غزل — الناظر، مئی ۱۱ء
(۱۳) سہرا — زمانہ، فروری ۱۲ء
(۱۴) یاد دہانی بہ طرز احسن — زمانہ، اپریل ۱۳ء
(۱۵) تحفۂ تہنیت — زمانہ، فروری ۱۳ء
(۱۶) قصیدۂ تہنیت در بار شاہی — زمانہ، دسمبر ۱۱ء
(۱۷) دلی دربار — ادیب، دسمبر ۱۱ء

اس خیال سے کہ یہ نظمیں یکجا ہو کر محفوظ ہو جائیں اور اگر کوئی شخص نادر کے مکمل کلام کو دیکھنا چاہے، تو اس کو دقت نہ ہو۔ یہ نظمیں نقل کی جاتی ہیں۔ اُن کے دورِ آخر کی اِن نظموں میں، بعض نظمیں چستیِ بندش اور حسنِ اظہار کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں مثلاً صحیفۂ فطرت کے یہ شعر دیکھیے:۔

یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری — چپّے چپّے پہ یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے

خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں — مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے
اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی — جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

صحیفۂ فطرت

"برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقِ دفتریست معرفتِ کردگار"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

یہ جو حسن و عشق کے طومار ہیں لکھے ہوئے — کیا یہ سب مہمل ہیں، سب بیکار ہیں لکھے ہوئے
یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری — چپے چپے پر یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے
شاعری ہے وہ متاعِ کلیاتِ کائنات — جس پہ اہل الرائے کے اقرار ہیں لکھے ہوئے
دفترِ عالم کی نظم آرائیوں پر کر نظر — صاف حسن و عشق کے اسرار ہیں لکھے ہوئے
دیکھ چشمِ غور سے نقش و نگارِ کاہ کاہ — برگِ گل مثلِ خطِ گلزار ہیں لکھے ہوئے
خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں — مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
آسماں کی لوح پر خطِ شعاعِ شمس سے — کیسے کیسے مطلعِ انوار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر، دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
یہ گھٹائیں اودی کالی کیا ہیں سائن بورڈ ہیں — جو پئے ترغیبِ بادہ خوار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جا بہ جا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

(زمانہ، فروری ۱۹۱۳ء)

سوزِ عشق

آہ اے عشق، اے محبت کے شرارِ بے قرار — آتشِ پنہاں کے اُف اے شعلۂ سیماب وار
اے خدنگِ عشق اور اے نشترِ سینہ فگار — تیری کاوش سے گل افشاں دیدۂ خوننا بہ بار
کشتہ کر کے زندۂ جاوید تو نے کر دیا
ذرّۂ پامال کو خورشید تو نے کر دیا

ہستیِ فانی مری، میرا وجودِ درد مند — تھے اسی قابل کہ ہوں تیرے جدا سب بند بند
شکر ہے یہ التجائے معنوی آئی پسند — باعثِ راحت ہے مجھ کو تیرے ہاتھوں نے گزند

بی قطعاتِ تاریخِ وفات (نادر)

آہ اے بزمِ جہاں کے شمعِ شب افروزِ عشق
اے شرارِ برق تاب اے شعلۂ جاں سوزِ عشق

اک مرقع ہے عدم کا جلوۂ ہستی مرا
مٹ گیا جب، اپنی اصلیت سے جا کر مل گیا

یعنی جب تکمیل کو پہنچا تو میں کچھ بھی نہ تھا
میری ہستی اک دھواں ہے شعلۂ جوالہ کا

نغمہ زا ہے اب صدا میرے شکستِ رنگ کی
وسعتِ ہستی ہے وسعت میرے قلبِ تنگ کی

(زمانہ، شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۷ء)

سیرِ دریا

سیرِ دریا، لطفِ کشتی اور گھٹا چھائی ہوئی
بڑھ چلی حد سے، جوانی جوش پر آئی ہوئی

دستہ ہائے گل سے، کشتی کو بنا کر مہدِ گل
لے چلا تفریح کو عہدِ شباب اور عہدِ گل

عاشق و معشوق باہم سیر کرنے کو چلے
آشنایانِ محبت ڈوب مرنے کو چلے

کیا سرور افزا نشاط انگیز چھائی ہے گھٹا
بوندیاں پڑتی ہیں یا کیوڑا چھڑکتی ہے گھٹا

بوئے گل کے مختلف کپڑے بدلتی ہے نسیم
پنکھیاں پھولوں کے گویا منہ پہ جھلتی ہے نسیم

لیتی ہے نظارۂ ہر برگ میں لذت نگاہ
چاٹتی ہے سبزۂ شاداب پر امرت نگاہ

جس طرح دریا میں موجوں سے کوئی کشتی نشیں
کھیلتا ہو ڈال کر پانی میں دستِ نازنیں

کشتیٔ چشم طراوت آشنا سے کود کر
تیرتی ہے سبزۂ مواجِ ساحل پر نظر

دور، کوسوں دور، جاتی ہے فضائے آب میں
ڈبکیاں کھاتی ہوئی امواج اور گرداب میں

تیرتی ہیں وہ بطیں، گرتی ہیں مرغابیاں
اور وہ کشتی میں بیٹھا جا رہا ہے اک جواں

خوب اک مہ پارۂ نو خیز بھی پہلو میں ہے
آدمی کے ایک دریائی پری پہلو میں ہے

ہائے وہ مستانہ انداز اور وہ رغبت کی نگاہ
وہ گلابی آنکھ، وہ نشے میں متوالی نگاہ

بے خودی میں زانوئے عاشق دبائے پیار سے
اور وہ سینے پر اُس کے سر جھکائے پیار سے

عالمِ خلوت ہے اور معشوق در آغوش ہے
لطفِ سیر و لطفِ وصل و لطفِ ناؤ نوش ہے

اے ہوس آلودہ، اے لذت کشِ آغوشِ یار
چین ہی چین اب تو لکھتا ہے ترا نامہ نگار

چین ہے کیا! درحقیقت چین اسی کا نام ہے!!
کیا شباب چند روزہ کا یہی اک کام ہے!!

عیش کہتا ہے اسے!! سمجھا نہ تو مفہومِ عیش
تیرتی ہے بحرِ غم پر کشتیٔ موہومِ عیش

تیری کشتی گرچہ او کشتی نشیں جاتی ہے تیز
کشتیٔ عمرِ رواں، اس سے کہیں جاتی ہے تیز

بس ہوا و حرص کی موجوں کو اپنے ساتھ روک
ٹھہر کشتی پھیر، ہتے چھوڑ، اپنے ہاتھ روک

زورِ طوفاں ہے، کہیں گرداب میں تو آ نہ جائے　　دیکھ ساحل سے کہیں کشتی تری ٹکرا نہ جائے
ہے حبابِ بحر کے مانند انجامِ حیات　　ایک غوطہ کھاتے ہی لبریز ہے جامِ حیات
اے حبابِ بحر اے پروردۂ آغوشِ موج　　تیری ہستی اک جنازہ ہے رواں بردوشِ موج
لذتِ گہوارہ ہے جس کی تجھے ہر لہر میں
ایک تختہ بھی نہ ابھرا ڈوب کر اس بحر میں

دیکھ ہوتی جا رہی ہے اب گھٹا تاریک تر　　اور جھونکے آمدِ طوفاں کی دیتے ہیں خبر
روک ہمت، پھیر رُخ کشتی کا، ناداں لوٹ آ　　جان دینے کو نہ جا، اے دشمنِ جاں لوٹ آ
دیکھ تیرے ساتھ خطرے میں ہے تیرا ہم نشیں　　آہ تو اس نازنیں کو بھی نہ لے ڈوبے کہیں
تو نہیں سنتا کسی کی، خیر، جاتا ہے تو جا　　اپنی بربادی کی کرنے سیر جاتا ہے تو جا
جا، پر اس آغازِ الفت کا بخیر انجام ہو
تیرا بیڑا پار ہو، ساحل پہ تجھ کو شام ہو　　(ادیب، جنوری ۱۹۱۱ء)

سہ مصرعی[1]

خوشی سے خوشی کا نہ ہونا ہی اچھا　　جہاں جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رلانا ہی اچھا ہے، رونا ہی اچھا

یہ قصر اور یہ گھر ہے سب چار دن کا　　یہ فرشِ معطر ہے سب چار دن کا
تو خاکِ لحد کا بچھونا ہی اچھا

بھری تلخیوں سے ہے یہ جانِ شیریں　　سم آلودہ ہے پارۂ نانِ شیریں
غذا سے یہاں ہاتھ دھونا ہی اچھا

تماشے جہاں کے کبھی کم نہ ہوں گے　　زمانہ رہے گا مگر ہم نہ ہوں گے
نہ ہوں ہم، ہمارا نہ ہونا ہی اچھا

کہے جا اسی طرح اشعار نادر　　نہ اشکوں کا ٹوٹے ترے تار نادر
یہ لڑیوں میں موتی پرونا ہی اچھا

(مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء)

---

[1] سب اڈیٹر مخزن (لاہور) غلام محمد طور نے، نادر کی موت پر ایک مضمون مخزن شمارہ نومبر ۱۲ء میں لکھا تھا، اس کے آخر میں یہ سطریں بھی ہیں:-

"دنیا کے مصائب اور زمانے کے حوادث سے، جو پے در پے آپ کو پیش آئے، آپ کی طبیعت زندگی سے اچاٹ ہو گئی تھی چنانچہ حالتِ بیماری میں فیل کی سہ مصرعی سے، جو ستمبر کے پرچہ میں کلامِ نادر، کے عنوان کے نیچے درج ہو چکی ہے، اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔" اس کے بعد مندرجہ بالا سہ مصرعی نقل کی گئی ہے۔

بڑا امام باڑہ لکھنؤ

اے صنادید اودھ! اے یادگارِ لکھنؤ — اے گُلِ پژمردۂ رفتہ بہارِ لکھنؤ
تیرے گنبد کا کلس ہے طرّۂ تاجِ اودھ — اور ترا گنبد ہے چترِ زرنگارِ لکھنؤ

ہر عمارت کو اودھ کی تجھ سے لڑا کر توڑ دے — ہر محل کو تیری اک ہلکی سی ٹھوکر توڑ دے
فاتحِ اقلیمِ تعمیرات ہے لاریب تو — ایک آئینہ ترا سدِّ سکندر توڑ دے

رومی دروازے کی رفعت پر یہ ہے چکر میں عقل — سر اُٹھا کر جس نے دیکھا، اس کو چکر آ گیا
اس طرح ہے سر اٹھائے تیری مسجد کا کلس — آسماں کا چتر ہے گویا تجھی پر گھومتا

آہ یہ طوطے نہیں، روحیں ہیں بہرِ بازدید — آئی ہیں جنت سے پہنے حلّہ ہائے سبز فام
اور طے کر کے مسافت عالمِ ارواح کی — تیرے میناروں پہ دم لینے کو کرتی ہیں قیام

آ کے گرتے ہیں ترے گنبد پہ جب غولِ طیور — اور جب وہ چہچہاتے ہیں ترے مینار پر
آہ! کس حسرت سے گھنٹوں دیکھتا ہوں میں انھیں — اور مجھے اس محویت میں تب یہ آتا ہے نظر

صحنِ مے خانہ میں کی آراستہ ساقی نے میز — چُن کے کچھ کنٹرِ سنہرے اور کچھ جامِ بلور
ناگہاں پریاں فضائے نیلگوں سے آ گریں — اور ہو کر مست، نغمہ زن ہوئیں مثلِ طیور

پھر شفق نے پھوٹ کر برسا دیا جب سرخ رنگ — لے کے بیٹھا گود میں پھولوں کی کشتی آسماں
چاندنی میں پھول مہکے اور تارے کھل گئے — پھر پھرا کر آ گریں لاکھوں سنہری تتلیاں

صبح دم کی فتحِ جاپاں نے جو روشن ماہتاب — اور دنیا جگمگا کر بن گئی ارژنگِ چیں!
میں نے دیکھی پھوٹتے گردوں پہ فواروں کی طرح — ہر کلس سے تیرے برجوں کے شعاعِ آتشیں

دن کو کچھ ہے لطف تیرا، شام کو کچھ، شب کو کچھ — تیرے ہر انداز میں آہ اک ادائے تازہ ہے
کیا تری آرائش، اپنے آپ مشاطہ ہے تو — صبح گلگونہ ہے تیرا، شام تیرا غازہ ہے

اے اودھ کی جان اے روحِ روانِ لکھنؤ — یادگارِ آصفِ جنت آشیانِ لکھنؤ
سو بناؤ کا مرقعِ کش ہے اک تیرا بگاڑ — ہے تری اک بے تناقی سو نشانِ لکھنؤ

آہ کب تک حسرتِ نظارۂ چشمِ بلیور
کاش اک شب ایسی ہم کو بھی دکھائے آسماں
میری آنکھوں کی سپیدی پھیل جائے اور تجھے
لے بغل میں، مثلِ آغوشِ فضائے آسماں

(زمانہ، جولائی سنہ ۱۹۱۲ء)

پروانۂ جاں سوز

شعلہ زن ہے میرے دل میں الفتِ پنہاں کی آگ
اور ہے اس آگ کو اِس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دولھن کا سہاگ
جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

بجھ گیا دل میرا شمعِ دل فروزِ عشق سے
آشیانہ جل اٹھا بلبل کا سوزِ عشق سے

خلق کہتی ہے مجھے 'یہ ہوش سے بیگانہ ہے
عقل سے خارج ہے یہ، بے ہودہ ہے، دیوانہ ہے'
جانتا ہے مجھ کو لیکن خوب جو فرزانہ ہے
میری ہستی آہ عکسِ جلوۂ جانانہ ہے

رنگ چہرے سے اڑا جب، نکہتِ گل ہو گیا
دم جو نکلا، نالۂ منقارِ بلبل ہو گیا

بھولنا اپنے کو، صورت ہے کسی کی یاد کی
یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے اُفتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی
ہے خوشی منت کشِ غمِ عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے روحِ بلبل کا فشار

جس طرح اک قطرہ، گرد اُس کے محیطِ شش جہات
جس طرح ساغر میں چھلکے قطرۂ آبِ حیات
گرد میرے حلقہ زن ہے کائنات (کذا)
عشق کیا ہے اک متاعِ کلیاتِ بے ثبات

قطرۂ پر جوشِ طوفاں خیز، می ریزد ز عشق
شعلۂ خاموشِ عالم سوز، می خیزد ز عشق

میرے سر میں کیا ہے، بس اک شعلۂ عشقِ جنوں
میرے دل میں کیا ہے، جلنے کے لیے اک قطرہ خوں
میری ہستی کیا ہے، اک ریزہ خسِ آتش دروں
میں انا الحق گو ہوں میں منصور ہوں، میں نور ہوں

ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن میرے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن میرے لیے

جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ
جس طرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوے باغ
تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ
ڈھونڈھتی ہے میری مضطر روح پروازِ فراغ

سبزہ و گل بن کے کاش اِس خاک داں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پر پھیل جاؤں

(زمانہ، جون سنہ ۱۹۱۵ء)

سوزِ پروانہ[1]

سر میں پروانے کے ہے اک شعلۂ جوشِ جنوں — اُس کے دل میں کیا ہے، جلنے کے لیے اک قطرۂ خوں
اُس کی ہستی ہے متاعِ صد طلسمات و فسوں — پھونک دے خرمن، یہ وہ خس ریزہ ہے آتش دروں
اُس کے بال و پر ہیں مثلِ شمع جلنے کے لیے
اور کلیجہ اُس کا شعلوں پر پگھلنے کے لیے

شعلہ زن ہے اُس کے دل میں لذتِ پنہاں کی آگ — اور ہے اُس آگ کو اس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دلہن کا سہاگ — جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ
عشق جل بجھتا ہے خود، سارا زمانہ پھونک کر
خاک ہو جاتی ہے بلبل آشیانہ پھونک کر

بھولنا اپنے کو، صورت ہے کسی کی یاد کی — یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے اُفتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ، موت ہے فرہاد کی — ہے خوشی منت کش غم عالمِ ایجاد کی
نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے، روحِ بلبل کا فشار

زیست کا کیا تذکرہ، پروانہ اس سے سادہ ہے — موت کا عاشق ہے، ہر دم مرگ کا دلدادہ ہے
مرنے کو یوں ہی کمر باندھے ہوئے استادہ ہے — المدد اے آرزوئے مرگ! وہ آمادہ ہے
ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن اس کے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن اس کے لیے

نادر آخر تا کجا یہ صدمۂ سوزِ نہاں — بس کہیں جل بجھ چکے بھی میرا جسمِ ناتواں
سوزِ حسرت سے، مرے دل سے نکلتا ہے دھواں — ہر نفس میرا صدائے صاف دیتا ہے کہ ہاں!
پھونک دے اے عشق تو اِس ہستیِ خاشاک کو
اور اُڑا دے ہاتھ اٹھا کر میری مشتِ خاک کو

ڈھونڈھتی ہے روحِ مضطر میری پروازِ فراغ — تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ
جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ — جس طرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوئے باغ
سبزۂ و گل بن کے، کاش اس خاکداں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پر پھیل جاؤں

(زمانہ، جولائی ۱۹۱۵ء)

---

[1] اس نظم کے تین بند، دوسرا، تیسرا، اور آخری، "پروانۂ جاں سوز" میں بھی موجود ہیں۔ اس اختلاف کے ساتھ، کہ دوسرے بند کے آخری دو مصرع، بدلے ہوئے ہیں، اور آخری بند میں مصرعوں کی ترتیب مختلف ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ نادر کی نظم "شراب العاشقین" کا پہلا بند "مثنوی لالہ رخ" کے "نغمۂ تمہید" میں پہلے بند کی جگہ موجود ہے۔ "نغمۂ تمہید" رسالۂ زمانہ بابتہ فروری سنہ ۱۹۱۰ء میں "سوزِ عشق" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس اختلاف کے ساتھ کہ "نغمۂ تمہید" کا چھٹا بند، اس میں نہیں تھا۔

جلوۂ امید

ہو چکا ہے آہ جس مظلوم پر فتوائے قتل … گاتی ہے کانوں میں امید اُس کے گلبانگِ نوید
اور جب صدموں سے چکنا چور ہو جاتا ہے دل … جوڑتی ہے اپنے دامن میں انھیں رکھ کر امید

منزلِ ہستی میں امید ایک ایسی شمع ہے … راستہ چلتے ہیں جس کو دیکھ کر سب رفتنی
پھیلتی جاتی شبِ غم کی ہے جتنی تیرگی … تیز ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اُس کی روشنی

(زمانہ، اگست ۱۹۱۴ء)

نپولین اور کم سن جہازی

بولن پہ جب چڑھ آیا جرار فوج لے کر … شاہِ نپولین سا جرار حملہ آور
اور ہو گئی مسلح اک بار سب رعایا … کٹ مرنے کو ہر آزاد انگریز مستعد تھا
کتنوں نے جان دے دی مردانہ وار لڑ کر … کتنوں کو لے گیا وہ زندہ پکڑ دھکڑ کر
من جملہ اُن اسیروں کے ایک نوجواں تھا … ظاہر میں بھولا بھالا اور نیک نوجواں تھا
لیکن بھرا تھا سودائے حبِّ وطن کا سر میں … سوزِ غمِ غریبی تھی شعلہ زن جگر میں دکذا)

کیا جانیے سمندر پار اور گھر پہنچ کر … اور اپنے ملک میں با فتح و ظفر پہنچ کر
جب حلقۂ غلامی سب کے گلے میں ڈالا … اس ایک نوجواں کو آزاد کیسے چھوڑا
شاہِ نپولین نے دانستہ درگذر کی … یا یہ کہ کم سنی پر مظلوم کی نظر کی
کوئی سبب ہوا لیکن وہ مطلق العناں تھا … بے روک گھومتا تھا، بے قید و بے مکاں تھا
گھنٹوں سکوت میں وہ ساحل پہ بیٹھ جاتا … سر اپنا پکڑے پہروں منزل پہ بیٹھ جاتا
مرغابیاں جو اُڑ کر سوئے غروب جاتیں … اور نیلگوں فضا میں وہ جا کے ڈوب جاتیں
اُڑنے کا اُن کے پہروں انداز دیکھتا وہ … حسرت سے اُن کی گھنٹوں پرواز دیکھتا وہ
کہتا تھا وہ کہ طوفاں میں نصف شب کا پہرا … آزادیِ غریبی سے لاکھ درجہ اچھا
ممکن ہے کوئی تختہ طوفان میں بہہ آتا … اور صبح ہوتے مجھ کو میرا وطن دکھاتا

بے چین اس تفکر میں ایک شب رہا وہ … اور صبح ہوتے تھک کر غافل سا سو گیا وہ
کیفِ غنودگی میں اُس نے یہ خواب دیکھا … سوئے دیار اپنے گویا در رکاب دیکھا دکذا)
گویا کہ ایک تختہ ساحل پہ آ لگا ہے … اور شاد شاد اپنے گھر کو وہ جا رہا ہے
چونکا تو واقعی اک تختہ رُکا ہوا تھا … اور اس کے خواب کی وہ تعبیر دے رہا تھا
جلدی سے گھس کے پانی میں تختے کو اٹھایا … اور کھینچ کر بعجلت اک کھوہ میں چھپایا

ہر روز یاس کے موقع اُس غار میں وہ جاتا
اور شام کو نکلتا کیا جانے کیا بناتا

اس مشغلے میں اُس کو گذرے کئی مہینے
لیکن نہ بھید اُس کا پایا کبھی کسی نے

آخر کو ہو گیا فاش اک صبح راز اُس کا
جب بن بنا کے نکلا باہر جہاز اُس کا

تیری پناہ یارب، جانوں کی خیر کرنا
دانستہ ڈوب مرنا تھا جس پہ سیر کرنا

کیسا جہاز جس کا اسلوب تھا نہ کینڈا
پتوار تھی نہ جس میں، کپاس تھا نہ پیندا

جس میں نہ بادباں کا مستول کا پتا تھا
مردہ بہانے کی تھی ٹکٹی، جہاز کیا تھا

قسمت میں کیا لکھا ہے یہ کون جانتا تھا
واں اس ذلیل بیڑے کا ناخدا، خدا تھا

اِس شان سے بہادر آمادۂ سفر تھا
اک پاؤں تھا زمیں پر اور اک جہاز پر تھا

آنکلا پہرے والا ناگہ کوئی اُدھر سے
اور دیکھتے ہی کھینچا اس کو جہاز پر سے

رسّی سے باندھ کر اور اچھی طرح جکڑ کر
آگے نپولین کے لایا اسے پکڑ کر

اور ہاتھ جوڑ کر کی عرض، اے حضورِ عالم
جرأت تیرا شاہنشاہوں کے دل پہ قائم

رکھا تھا اس کو تونے آزاد از غلامی
اس کے عوض میں اس نے کی یہ نمک حرامی

بے انتظارِ حکمِ شہ اور اذنِ شاہی
یہ بے تمیز اپنے گھر کو ہوا تھا راہی

گر میں پہنچ نہ جاتا، تو یہ نکل چکا تھا
اِس کا جہاز بولن کی سمت چل چکا تھا

سُن کر نپولین نے حیرت میں آکے پوچھا
"اِس کا جہاز میرے ساحل پہ کیسے آیا

میں پوچھتا ہوں پہرے والے کدھر گئے تھے
کیا اک سرے سے سب کے سب آج مر گئے تھے

ہر چند کام کرتے اِس وقت تھک گیا ہوں
لیکن چلو بتاؤ، میں چل کے دیکھتا ہوں"

بولا سپاہی جی ہاں اس کو ضرور دیکھیں
وہ دیکھنے کے قابل بھی ہے، ضرور دیکھیں

یہ واقعہ حقیقت میں اک عجیب ہی تھا
خود پا پیادہ آیا، ساحل قریب ہی تھا

نزدیک آکے پوچھا لنگر کہاں ہے اُس کا
وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا، وہ بادباں ہے اس کا

چھیچھڑا سا اک ہوا کے جھونکوں میں ہل رہا تھا
اور نیلگوں فضا میں تارا سا کھل رہا تھا

اچھی طرح سے دیکھا اس کو قریب جا کر
اور نوجوان مجرم سے بولا مسکرا کر

بے وجہ کی نہیں ہے اس درجہ بے قراری
بولن میں کوئی بے شک معشوقہ ہے تمہاری

آمادہ خودکشی پر تم کو کیا نہ گھر نے
تم چاہ میں اُسی کی جاتے تھے ڈوب مرنے"

بولا وہ لڑکا شرما کر اور سر جھکا کر
میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری بندہ پرور

معشوقہ ہے نہ میری کوئی نہ یار میرا
مجھ کو نہ کر رہا ہے مضطر دیار میرا

جو اک عزیز اور اک پیارا مرا وہاں ہے
وہ میری اک بوڑھی بے کس ضعیف ماں ہے

میں اس کے دیکھنے کو بے چین ہو رہا ہوں
مردہ بدستِ زندہ، اس ملک میں پڑا ہوں

سُن کر نپولین کا دل رحم سے بھر آیا
اور اُس کی راست بازی کا اُس کو باور آیا

دل میں کہا کہ کتنا ہے یہ بھی نیک لڑکا
ہو ہر شریف ماں کے ایسا ہی ایک لڑکا

خوب اس کی پیٹھ ٹھونکی، خوب اس کو شاباشی دی — گھر جانے کی اجازت اس کو بصد خوشی دی
کچھ نقد اس کو دے کر، اور اک نشان دے کر — پہنچا دیا خود اپنی ہی کشتی پر اسے گھر
کہتے ہیں اکثر اس کو فاقے ہوئے، پر اس نے — بیچے نہ مرتے دم تک سکّے نپولین کے

اس واقعے کو گو اک مدت گزر چکی ہے — یورپ میں اس کی اب تک ویسی ہی تازگی ہے
اس یاد سے ہے لندن کا دل گداز اب تک — پیرس کے میوزیم میں ہے وہ جہاز اب تک

(زمانہ، جنوری سنہ ۱۹۱۱ء)

غزل

شکایت کرکے غم اوران کا تیز کرنا ہے — ابھی تو گفتگوے مصلحت آمیز کرنا ہے
ترے اعمال نامے پر کہاں ہیں دستخط تیرے — وہاں ثابت تجھے جعلی یہ دستاویز کرنا ہے
یہ دنیا جاے آسایش نہیں ہے، آزمایش ہے — یہاں جو سختیاں تجھ پر پڑیں انگیز کرنا ہے
غزلخوانی کو تو آیا نہیں اس بزم میں نادر — تجھے یاں وعظ کہنا، پندِ سود آمیز کرنا ہے

پٹکتا ہوں سر کہ میں دنیا میں رسوا کیوں ہوا — میں نے ایسا کیوں کیا، افسوس ایسا کیوں ہوا

میں سمجھا تھا مرے حق میں دعاے خیر کرتے ہو — مجھے تم کوستے ہو، ہمدمو! اندھیر کرتے ہو

(زمانہ، اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء)

سالِ گذشتہ

آہ بوڑھے، سن رسیدہ اور قریب المرگ سال — اب تو ہوتا جاتا ہے ابتر ترا ہر روز حال
اور اب نزدیک تر ہے تیرا وقتِ واپسیں — آہ تجھ کو ہم سے اب کچھ کہنا سننا بھی نہیں
مختصر سی کچھ وصیت، کچھ نصیحت ہی سہی — اور اگر دل میں ترے شکوے ہیں تو وہ بھی سہی
کچھ تو کہہ حال اپنا او بیمار، لب اپنے تو کھول — مرنے والے تیرے دل میں کیا ہے کچھ منہ سے تو بول
آہ کیا اس عالمِ ظلمات اور انوار میں — اس جہانِ پُر طلسمات اور پُر اسرار میں
اپنی پُر غم زشتیِ تقدیر کا اک حرف بھی — ہم سے کہنا ہی نہیں منظور تجھ کو واقعی
کیا تری غمگیں صدا یہ کان سن سکتے نہیں — کیا یہ مژگاں اشکِ حسرت ترے چن سکتے نہیں

مرنے والے سال! وہ بھی کتنا نازک وقت تھا — جبکہ لیلاے ازل تھی دردِ زہ میں مبتلا
قسمت و تقدیر سے محروم تھی کل کائنات — اور ہر اک چیز بے اندازہ، بے پیمانہ تھی، اور بے ثبات
جب نئے چرخانے میں پیدایش زمانہ کی ہوئی — کیا وہ حالت بھی تری اور سال نے دیکھی ہوئی

کیا ترے کانوں میں پہنچی تھی زچہ کی پہلی چیخ　　یاد ہے تجھ کو کہ تھی کتنی بھیانک وہ بھی چیخ
تو نہ سمجھا ہستیوں کی ابتدا تکلیف ہے　　اور ہر اک زندگی کی انتہا تکلیف ہے

سال، بوڑھے سال، او مرحوم ہونے والے سال　　بلکہ وہ اک روز میں معدوم ہونے والے سال
جب چلی تھی بحرِ ناپیدا کنارِ دہر میں　　ایک پہلی لہر، تو کیا بات تھی اُس لہر میں
پہلے وہ آغوشِ مادر کیوں بنی تیرے لیے　　پھر دہانِ قبر وہ کیوں بن گئی تیرے لیے
مادرِ قدرت نے کیوں شیرِ لبِ موجِ فنا　　لے کے لفظِ موت پیشانی پہ تیری لکھ دیا

مرنے والے سال! اچھا ہم کو اتنا تو بتا　　آخری سورج ترا، کیا بات تھی جو زرد تھا
عشق و الفت کا ترے اس پر اثر تھا ہو نہ ہو　　رحم کر کے تجھ پہ، وہ باچشمِ تر تھا ہو نہ ہو
پر نہیں، تھا وہ تو بے مہری سے آگے کو رواں　　دلدلوں، جھیلوں پہ، باغوں، وادیوں پہ ضوفشاں
اور نہ دیکھا اُس نے مڑ کر بھی تجھے دم توڑتے　　ایک آنسو بھی نہ ٹپکا آہ اس کی آنکھ سے

او ہمیشہ کے لیے معدوم اور مرحوم سال　　کوچ، رحلت کر رہا ہے تجھ پہ اظہارِ ملال
مختصر افسانۂ غم ہو چکا تیرا تمام　　اور تیری زندگی کا ہو چکا اب ختم کام
مر چکا تو، اور اٹھا کر تیری نعشِ بے کفن　　وقت نے کی غرقِ تاریکیِ دریائے محن
مرنے والے کی لحد ہے، اور نہ ہے شمعِ مزار　　نوحہ خواں کوئی ہے اُس پر اور نہ کوئی اشکبار

آہ او سالِ گذشتہ، او او مرحوم سال　　او غریقِ بحر، او معدوم فی المعدوم سال
کس قدر تو پہلے خوش آیند اور خوش لہجہ تھا　　جس قدر اب چُپ نظر آتا ہے ایسا تو نہ تھا
تیری چمکیلی امیدیں کب جھک جاتی نہ تھیں　　دور سے دکھلاتی تھیں جھلکی قریب آتی نہ تھیں
آہ تیرے ساتھ اب، او سال! وہ سب مر گئیں　　اور نئی امیدیں میرے دل میں آکر بجھ گئیں

(زمانہ جنوری ۱۹۱۲ء)

جی بھر آیا پچھلا سامانِ اسیری دیکھ کر　　رو دیا میں اپنا زنداں خالی خالی دیکھ کر
رحم آجائے گا ان کو شکل میری دیکھ کر　　میری حالت دیکھ کر میری غریبی دیکھ کر
ساحلِ جولانگہِ امواج پر شکلِ حباب　　دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھ کر
مفت بھی خواہاں نہیں وہ دل کے، کیونکر آدمی　　بے ضرورت چیز لے لیتا ہے سستی دیکھ کر
اب کہاں وہ نوجوانی اور کہاں جذباتِ عشق　　پیار بھی آتا نہیں اب شکل پیاری دیکھ کر
دشتِ غربت سے چلا ہاتف میں بستی کی طرف　　کون پوچھے گا مجھے میری غریبی دیکھ کر
لاکھ میں اُن کو بھلاتا، ضبط کرتا ہوں مگر　　دل بھر آتا ہے پہلو اپنا خالی دیکھ کر

کھنچ گیا نقشہ نظر میں ہستیِ موہوم کا
بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھ کر
عشق کا نادر کہاں سے تو لگا لایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھ کر
(الناظر، مئی ۱۹۱۱ء)

سہرا[1]

ہے جلوۂ برقِ طور سہرا، ہے ساعدِ صافِ حور سہرا
ہے موجِ دریائے نور سہرا، ہے جوشِ جامِ بلور سہرا

فلک پہ تارے کھلے ہوئے ہیں، شفق میں بجلی چمک رہی ہے
افق میں سورج نکل رہا ہے، ہے مطلعِ صبحِ نور سہرا

نسیم جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہے یہ باقی
بہارِ فردوس ہنس پڑی تھی، اسی ہنسی کا ظہور سہرا

ہوا ہے نوشہ پہ سایہ گستر، اسی نے پھیلا دیے ہیں شہپر
ہے ورنہ عنقائے قافِ اقبال کا نشیمن ضرور سہرا

فلک نچھاور کہیں نہ کرتا ہو سر پہ نوشہ کے عقدِ پرویں
اسی کا پرتو نہ ہو سمجھتے ہیں جس کو اہلِ شعور سہرا

پری نے پیچھے سے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہے اپنا آنچل
جو یہ نہیں ہے تو میں کہوں گا ہے طرۂ زلفِ حور سہرا

عروس نے اپنے نازنیں ہاتھ چشمِ نوشہ پہ رکھ دیے ہیں
اسی کے یہ پنجۂ نگا(ریں) سے بن گیا منہ کا نور سہرا

فلک پہ رحمت برس رہی ہے، زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے
ہے رحمتوں کا نزول سہرا، ہے برکتوں کا وفور سہرا

بہار کی دیوی سر پہ نوشہ کے پھول برسا رہی ہے گویا
کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے لچھمی، یہ ہے مبارک ضرور سہرا

سرودِ عشرت کے تار لڑیاں ہیں اور نرالے ہیں پھول مطرب
ہے مطربِ جشنِ عیشِ نوشہ، ہے سازِ بزمِ سرور سہرا

گلِ[2] مضامینِ فکرِ نادر ہے، ورقِ کاغذ ہے کشتیِ گل
کہ نذرِ نوشہ کے شوق میں بن گئی ہیں سلکِ سطور سہرا
(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

یاددہانی بطرزِ احسن

کسی کافر کا وعدہ کر کے ممکن ہے پلٹ جانا
پلٹ جانا کسی طناز کا ممکن ہے پیماں سے

یہ ممکن ہے کہ گھر آئیں گھٹائیں جھوم کر لیکن
نہ ٹپکے ایک بھی قطرہ محیطِ ابرِ باراں سے

بہار آئے، چمن پھولے پھلے، لیکن یہ ممکن ہے
کہ اک دانہ نہ ہو حاصل امیدِ کشتِ دہقاں سے

یہ ہو سکتا ہے چل جائے ہوا کچھ ایسی عالم میں
کہ رنگ اڑ جائے پھولوں سے چمک لعلِ بدخشاں سے

یہ ممکن ہے کہ ہو جائے دعا کی سلب خاصیت
نکل کر پھر پلٹ آنا ہے ممکن تیرِ پیکاں سے (دکذا)

یہ سب ممکن ہے لیکن وعدہ کرنا اور مکر جانا
نہیں ممکن ہے ہرگز راجۂ شعباں علی خاں سے

دھنی ہیں قول کے اور اپنے وعدے کے وہ سچے ہیں
میں سچ کہتا ہوں پھر راجہ ہیں اور راجہ کے بیٹے ہیں
(زمانہ، اپریل ۱۹۱۳ء)

---

[1] اس سہرے کے آغاز میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے: "ایڈیٹر زمانہ کے برادرِ عزیز منشی رام سرن نگم۔ بی۔ ایس سی، کی شادی خانہ آبادی کی یادگار میں لکھا گیا۔"
[2] بسکونِ حرفِ ثانی، نادر کا تصرف ہے۔

تحفۂ تہنیت

(راجہ سید شعبان علی خاں صاحب بہادر تعلقہ دار سلیم پور کو خطاب کے سی، آئی، ای، عطا ہونے پر لکھا گیا)

بڑھا دے دے رہا ہوں اپنی طبعِ گرم جولاں کو
مبارک باد دینے جائے گی شعبان علی خاں کو

کہ تجھ سے سادگی ہائے جہاں کو حسنِ آرایش
تری رامشگری سے دلفریبی بزمِ امکاں کو

گھٹا کی طرح اٹھ اور چل نسیمِ صبحدم بن کر
چل اور لہکا دے باغوں کھیتیوں کو اور بستاں کو

ہلا دے شاخِ گل کو اور اڑا دے تو عنادل کو
ہنسا دے غم زدوں کو چھیڑ دے زلفِ پریشاں کو

یہی موقع ہے شوخی کا یہی موقع مسرت کا
لٹا دے تملا دے ہر سخنور، ہر سخنداں کو

چلی جا شوخیوں سے اور پہنچ جا آستانے پر
ادب سے دے مبارکباد اس ممدوحِ ذی شاں کو

مگر میری زباں بھی کیوں نہ اپنے ساتھ لیتی جا
ادا کیا کر سکے گی تو مرے جذباتِ پنہاں کو

مرا دل بھی لیے جا تو، یہ وہ شے ہے کہ کہتا ہوں
خدا دل دے تو دے تیرا ہی ایسا ہر مسلماں کو

مگر اس دل میں کیا ہے، صرف سچی بے ریا الفت
رفیقِ سرخ جو شیریں کرے تلخیِ دوراں کو

لیے جا ہاں وہ بے پایاں خوشی بھی میری خاطر سے
جو اس تقریب پر حاصل ہوئی اس تہنیت خواں کو

جب اس سامان سے اس ٹھاٹھ سے عرضِ ستائش ہو
تو کیوں مقبولیت حاصل نہ ہو فکرِ سخنداں کو

کسی کی ذات میں جب اس قدر ہوں خوبیاں یکجا
کہ ہو مدِ نظر اعزاز اس کا شاہِ شاہاں کو

کسی ذرے میں جب یہ کیفیت کسبِ ضیا کی ہو
کہ وہ اپنی طرف کھینچے شعاعِ مہرِ تاباں کو

تو یہ کہنا بجا ہے کہ شاہنشاہ لندن سے
خطاب آئے عطا دینے کے لیے شعبان علی خاں کو

حقیقت میں یہ عزت باعثِ صد فخر و نازش ہے
یہ عزت مایۂ صد ناز ہے امثال و اقراں کو

تمامی خوبیاں یکجا ہوں جب انساں میں، خالق نے
دکھایا اپنی قدرت کو، بنا کر ایسے انساں کو

الٰہی ان کو عمرِ خضر دے، جاہِ سکندر دے
کہ پہنچے مدتوں تک فیض خدام و عزیزاں کو

اٹھائیں فائدہ جس سے ہزاروں بے سر و ساماں
خدا وسعت دے ایسی زندگیِ عیش ساماں کو

خطابِ کے، سی، آئی، ای، ملا دربارِ دلی سے
مبارک ہو یہ عزت راجۂ شعبان علی خاں کو

(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

قصیدۂ تہنیتِ دربارِ شاہنشاہی

پھر کھلا صبحدم دریچۂ نور
ظلمتِ شامِ غم ہوئی کافور

پھر چلا ہے کے جامِ آتش رنگ
ساقیِ سرخ فام نشے میں چور

بن گیا پھر سوادِ ہندستاں
اک محیطِ فضائے عالمِ نور

وندھیاچل کی اونچی چوٹیاں پھر
ہوئیں چشمک زنِ تجلیِ طور

یعنی بھارت کی راجدھانی میں
پھر ہے جشن کا ہے ظہور

یعنی شاہنشہ معظم ہند
جارج پنجم دمیری غیور

تاج ہندوستان و انگلستان
رشک خاقان و قیصر و فغفور

آنکھیں جن کے جمال سے روشن
دل ہے جن کے خیال سے مسرور

عہد میں جن کے ہے رعیت شاد
دور میں جن کے ملک ہے معمور

جلوہ آرا ہیں خود بہ نفسِ نفیس
زیب دربار ہیں نظام حضور

لشکر آرائے صف شکن بہ جلو
راجگان، شاہزادگان بہ حضور

یعنی سب والیانِ ہندستان
جموں، کشمیر، اودے پور

شاہِ آسام و لامۂ تبت
راجگانِ بڑودہ و میسور

والیِ مسقط اور خانِ قلات
راجۂ گوالیار اور اندور

سب سورج بنسی اور چندر بنسی
راجۂ جودھپور اور جے پور

جس کے دربار میں ہیں یوں روشن
جیسے سورج سے ذرّے ہوں پرنور

یادگارانِ پرتھی و جے چند
جانشینانِ تغلق و تیمور

وارثانِ سپاہِ درّانی
سرآوردگانِ غزنی و غور

سورمایانِ راجپوت و سکھ
غازیانِ قبائلِ مشہور

غولِ دیوانِ راون و اندر
فوجِ بھیلانِ والیِ چتّور

تیغ باندھے کمر میں خون آشام
تیر کھینچے لگائے زخموں میں چور

جملہ شیرانِ بیشۂ پیکار!
سب نہنگانِ بحرِ خوں مغرور

جس کے آگے ادب سے حاضر ہیں
جس کی تعمیلِ حکم پر مجبور

عہد کی جس کے برکتیں بے حد
عقلِ اوّل شمار سے مجبور

جس کے الطاف لاتعدّ و شمار
اور جس کے فیوض لامحصور

ہند میں اس طرح کا جشنِ عظیم
ایسا دربار، دیدۂ بد کور

کسی تاریخ سے نہیں ثابت
اور کسی عہد میں نہیں مشہور

خاکِ دہلی ترے نصیب کہ تو
بادشاہوں سے پھر ہوئی معمور

کامرانی کی ہر طرف ہے بہار
شادمانی کا ہر جگہ ہے وفور

کیا نصیبہ ہے ہند کا چمکا
کرے عیش سے ہیں سب مخمور

اے شہنشاہِ آسمان اورنگ
اے جہاندارِ معدلت دستور

تیرے خادم خدیو اور خاقان
تیرے محکوم قیصر و فغفور

سلطنت تیری غرب سے تا شرق
ملک آباد شاد اور معمور

ہوئے اجزائے مذہب و ملت
تیرے آئین اور ترے دستور

بادشاہوں پہ واجب التعمیل
تیرے احکام اور ترے منشور

تیری افواج بے حساب و شمار
تیرا اقبال فتحِ و منصور

تو سلامت رہے ہزار برس ہر برس اک صدی بنے بھرپور
اور رہے دور پھر تسلسل کا یوں ہی کرتا رہے زمانہ مرور
میرا منہ تیری مدح خوانی کا بس دعا گوئی تھی مجھے منظور
اس سے زائد تری ستائش میں
نطق ہے کار ناطقہ معذور

(زمانہ، دسمبر ۱۹۱۱ء)

دلّی دربار

فاتحِ اعظم سکندر رومی کے بعد، یہ پہلا موقع ہے کہ ممالکِ یورپ کے جلیل القدر تاجدار نے سات سمندر پار سے آکر، سرزمینِ ہند پر قدم رکھا ہے۔ یعنی حضور پرنور ملک معظم حضرت جارج پنجم شاہنشاہ ہندوستان اور شاہنشاہ بیگم ملکہ میری، ادام اللہ ملکہم و اجلالہم کے قدومِ میمنت لزوم سے خاکِ ہندوستان کو شرفِ افتخار حاصل ہوا۔ اس مسرت خیز موقع پر وفاشعار رعایائے ہند کو جس قدر خوشی و مسرت ہو، کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندوستان کا زمین و آسمان اس کی کثیر التعداد اقوام کی مدح سرائیوں اور مختلف زبانوں کی نغمہ پروری سے گونج رہا ہے۔ چنانچہ مشہور بنگالی شاعر، مسٹر جے، این، مکرجی نے انگریزی نظم میں دہلی کو مخاطب کر کے، جس حسن سے اظہار مسرت کیا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ نظم بطور خلاصہ، ۳۱ اکتوبر کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔ ترجمہ نذر ناظرین ہے۔

اے پرانی دلّی، اے آثارِ دیرینہ شکوہ اے جوانوں بادشاہ ....
تو کبھی گہوارہ تھا، مذہب کا اور تہذیب کا اب شباب اور ....

پانڈوں نے تجھ کو جب دیکھا نگاہِ شوق سے پڑگئی آنکھوں میں اُن کی، بس چکا جو ندھا اک بار
خوب گایا ہے مہا بھارت نے ہریالہ ترا باندھ کر صنعت کا سہرا تیرے اور قدرت کا ہار

تیرے چپے چپے پر انبار ہیں اورنگ و تاج حوصلوں کے، ولولوں کے، جوش کے، جذبات کے
لوگ لیتے اور تجھے کھوتے رہے ہیں بارہا چال سے، تدبیر سے، تلوار سے، اور توپ سے

تو عمارات نفیسہ کا ہے دار السلطنت سات تعمیرات میں دنیا کی ہے تیرا اشمار
آج بھی وہ خوبیاں ہیں تجھ میں جن کو دیکھ کر وجد کر اُٹھتے ہیں تیرے دوست دشمن ایک بار

لے مبارک! بعدِ مدت ہنستی ہے قسمت تری آرہا ہے یعنی شاہنشاہ ہندوستان کا
کالے کوسوں دور سے، ساتوں سمندر پار سے چھوڑ کر پیچھے جزیرہ اپنا انگلستان کا

ہاں مبارک عظمتِ دیرینہ کے سنگِ نشاں ڈال دے گا اپنے ہاتھوں سے ترا اب تاجدار
ایک چادر تیری بوسیدہ شکستہ قبر پر یادگاروں میں تری اور ایک تازہ یادگار

لہ پیش نظر رسالے میں، یہاں پر کاغذ غائب ہے۔ مجھے فی الوقت یہ شمارہ دوسری جگہ نہیں ملا ہے۔

ہو رہی ہے دیکھ وہ صبحِ تجلی کی نمود — اٹھ رہا ہے پردہ بزمِ عظمت واقبال کا
فرش سے تا عرش آرائش ہے، آتا ہے نظر — پھر زمانہ راجۂ اشوک کے اجلال کا

آج تک مطلع ترا ہر چند تھا تاریک و تار — لیکن اب موجودہ شاہی کر رہی ہے ضو فشاں
اور یہ امید ہے فیضِ قدومِ شاہ سے — اور بھی ہو جائے گا وہ صاف تر شفاف تر

مجھ سے سن، تو درحقیقت فخرِ ہندوستان ہے — منتخب ہونے پہ تیرے ہے زمانہ بھر گواہ
اور رہیں گے تیرے مینار و مساجد مدتوں — تیری عظمت اور تیری شان و شوکت پر گواہ

ملک تیرا آسماں کی طرح ناپیدا کنار — خطۂ کشمیر سے، وسعت میں بحرِ ہند تک
اور تیرا عرض بھی ہے طول سے کچھ کم نہیں — برہما کے ملک سے گجرات اور سرہند تک

اس سے پہلے ہند کو تھی اس قدر وسعت کہاں — یعنی اب جتنا ہمالہ کے ادھر ہے ہند ہے
قلۂ ایورسٹ کے مانند کوئی سلطنت — گردشِ ایام سے محفوظ اگر ہے ہند ہے

امن آسایش مسرت کا سبب ہے گو، مگر — ہونا توپوں اور تفنگوں کی گرج بیں فتح مند
واقعی ہے تیری قدرت اور شوکت کی دلیل — آتش افشاں کوہ کے دامن میں رہنا بے گزند

سرزمینِ پانی پت کے آج خاک و خون پر — ہیں جلیل القدر مہماں کے نصب شاہی خیام
ہوں مبارک تجھ کو دلی تاجپوشی کے رسوم — تیرے شاہنشاہوں کی فہرست میں اور ایک نام

یعنی جھرمٹ میں رعایا کے، نظر آئیں گے اب — شاہ و شاہنشاہ بیگم بالباسِ زرنگار
جلوۂ دربار و فرمانِ شہنشاہی سے ہوں — آنکھیں روشن، کان مشتاق اور دل شاد ایک بار

ہم بھی اس موقع پہ، اک پرجوش طوفاں کی طرح — ہیں فلک سر پہ اٹھا شور مبارک باد سے
اور لے کر ساتھ سچی مشرقی تمکین کو — ہم نوا ہو جائیں ہم برطانیہ آزاد سے

(ادیب، دسمبر ۱۹۱۱ء)

رامپور کا ماحول شعر و سخن (راز یزدانی) دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا سب سے اہم دبستان رامپور ہے۔ اسکی آواز شعر و سخن کی بڑی متوازن آواز ہے۔ رامپور کے ماحول شعر و سخن کا مطالعہ کیے بغیر گویا اردو شاعری کا مطالعہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ راز یزدانی ہمارے مشہور اہلِ قلم میں سے ہیں۔ انھوں نے بڑی کاوش فنی مہارت دیانت کے ساتھ اسکی داستان بیان کی ہے جو داستان کے ساتھ تجزیہ بھی ہے — زیر ترتیب : نگار بک ایجنسی رامپور۔ یو۔پی

نورانی تیل

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے، اور درد چوٹ، زخم ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے۔

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یوپی

ایڈیٹر پبلشر نے ناظر پریس میں چھپوا کر دفتر نگار گیر کچی رامپور یوپی سے شایع کیا

نگار

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دور ابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔ اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں سے بھی کئی تراجم ہیں اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر خطبات پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارہ نگار یہی کوشش کریگا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر اور • خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمائیے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے۔

ضروری اعلان: پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں رسالہ جاری کردیا جائے گا نمائندہ نگار ۶۱/۷ این سمن آباد لاہور

نگار

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

جلد ۴۲　　فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۳ء　　شمارہ ۴

ملاحظات		۲
خطبۂ صدارت یوم اقبال	رشید احمد صدیقی	۵
اقبال کا فکری ارتقار	محمد عبدالسلام خاں	۱۲
اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط	ڈاکٹر محمود الٰہی	۲۹
اقبال بحیثیت استاد	مولانا عطاء الرحمٰن مرحوم	۳۱
اکبر راہ اقبال	نور محمد ایم اے	۳۸
شاعر مشرق	سعادت نظیر	۴۷

ملاحظات

اقبال اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس کی شاعری کا شمار مقصدی شاعری میں ہوتا ہے اور جس کے پاس کہنے کے لیے وہ تھا جو اس کے علاوہ اگر کسی شاعر کے پاس ہوتا بھی تو اتنا جاندار پرکشش اور تاثیر سے بھرا ہوا نہ ہوتا جتنا اقبال نے اسے بنا دیا۔

شاعری اور مقصد قریب کی چیزیں نہیں ہیں۔ ان کا ملاپ بہت دور کی بات ہے اتنی دور کی بات کہ اردو شاعری کی تاریخ میں صرف تین مثالیں ملتی ہیں۔ حالی، اکبر اور اقبال، عجیب اتفاق ہے کہ اقبال کے فکر و فن کا ذکر آتے ہی حالی اور اکبر بھی معرض بحث میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ حالی اور اکبر کا ذہن ایک محدود دائرہ روزگار کے لیے تھا اور اب ہم قصہ ماضی کی طرح ان سے کبھی لطف لیتے ہیں اور کبھی عبرت حاصل کرتے ہیں، یہ دونوں اپنی ملت کے مرثیہ خواں بن کر رہ گئے، ایک غم و اندوہ سے رو پڑا اور دوسرے نے دکھ اور درد کی نشتریت سے طنز و مزاح کو تیز کیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا حالی اور اکبر کا ذکر اقبال کے ساتھ لازماً آتا ہے اس لیے کہ اقبال اپنے ابتدائی دور شاعری میں ان دونوں سے متاثر ہوئے ہیں شکوہ و جواب شکوہ اقبال کے ذہن پر حالی کی گرفت اور بانگ درا کا ظریفانہ کلام اکبر کی گرفت کے واضح نشانات ہیں جن کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

حالی اور اکبر سے اقبال کی اثر پذیری کی وجہ وقت کا مطالبہ کہی جا سکتی ہے یا ان کا دل درد مند اس سے زیادہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ اقبال کا ذہن جو مطالبات کرتا ہے اس کو مطمئن کرنے کے لیے آپ ہی سوچیے ان دونوں کے پاس کیا ہے۔ ان کے خلوص کے تو وہ ہمیشہ قایل رہے ہیں لیکن ان کا اثر زیادہ دن قائم نہیں رہا اور وہ ان کی تقلید سے بہت جلد آزاد ہو گئے۔

وہ زبان و بیان میں غالب اور داغ سے بھی متاثر نظر آتے ہیں چنانچہ اقبال کی بالکل ابتدائی غزلوں پر داغ کی زبان کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان کا ذہن بالغ تر ہوتا جاتا ہے غالب کی میدلیت کا جادو چڑھتا نظر آتا ہے۔ اردو کے کلاسیکی شاعروں میں وہ غالب کے علاوہ کسی اور کا ساتھ دے بھی نہیں سکتے۔ یا پھر

کسی قدر عرفی و نظیری کی بلند خیالی کا حسن انھیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کیوں کہ یہ "لوگ تاکتے ہیں تو ثریا کی سنہری بوتل"۔

اقبال کا کلام اپنے مواد، وزن و وقار اور قدرت زبان و بیان کے لحاظ سے اردو شاعری کا نمایاں ترین کارنامہ ہے۔ مواد کے معاملے میں اقبال کہہ سکتے ہیں کہ تمتع زہر گوشہ یافتم اگر جہان کی آخری پناہ گاہ اسلام ہے۔ ان کی رائے میں توازن یا کسی خیال پر اصرار اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے یہاں خیالات کوئی وقتی رد نہیں تھے بلکہ اقبال کا ذہن ہزار بار غور و فکر کی کسوٹی پر کس کر ان خیالوں کو رد و قدح کی منزل سے گزارتا تھا ان کے موضوعات زندگی کے جن سنجیدہ مسائل سے علاقہ رکھتے تھے ان کا لازمی نتیجہ کلام میں وزن و وقار کی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیے تھا۔ زبان و بیان پر وہ خود اثر انداز ہوتے تھے اور اس معاملے میں وہ بھر منفرد ہیں۔ کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی اقبال کی زبان میں کچھ اور ہیں۔ قلندر۔ فقیر۔ مومن۔ خودی جیسے الفاظ کے مفاہیم کو جو وسعت اقبال نے دی اُس کا ہلکا سا بھی تصور کسی دوسرے کے یہاں نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا فقیر اور قلندر اخلاق، علم اور عمل کے لحاظ سے جس بلندی پر فائز ہے وہ ہمارے عام عقائد سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ ایک معمولی کرشمہ ہی اقبال کی زبان کا۔

یہ درست ہے کہ اقبال کے کلام میں تضاد ہے۔ لیکن یہ تضاد ایسا ہے جسے تاریخی نقشے کے طور پر تو ہم استعمال کر سکتے ہیں لیکن اقبال کے خلاف کوئی فرد جرم مرتب نہیں کر سکتے۔ وہ کون شخص ہے جس کے یہاں فکری ارتقا نہیں ہوتا حق کی تلاش و جستجو میں سالک کو مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سفر کا کوئی اثر اس پر مرتب نہ ہو۔ یہ سب تو راستے کی باتیں ہیں منزل پر پہنچ کر اس نے کیا کہا اصل بات تو یہ ہے۔

اقبال کو زمان و مکان کی قیود میں رکھ کر نہ ہم اس کے ساتھ بھلا سلوک کرتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ۔ اس کی آفاقیت کے اپنے تقاضے ہیں۔ حق کو کسی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، حق سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اُسے جغرافیائی حد بندیوں میں بھی نہیں جکڑا جا سکتا۔ اور تنگ و تفضل سے تننے والی دیواریں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اقبال کا کلام بھی فریادی ہے کہ اسے کسی مصنوعی قید و بند میں نہ رکھا جائے۔ اس کا خطاب اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر قدغن نہ لگائی جائے یہ مطالبہ ہمیشہ سے حق کا مطالبہ رہا ہے۔ اگر کبھی حق پر ان حد بندیوں کو جائز کیا گیا تو وہ خود ان بندشوں کے خالقوں کے لیے بھی سود مند نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حق کو اپنانے کے لیے جس وسعت قلب و نگاہ کی ضرورت ہے اگر حق کی ملکیت کے دعوے دار کے پاس ہوتی تو اس تفریق کا امکان ہی کہاں تھا۔

آپ ہی بتائیے کہ اقبال کے مندرجہ ذیل چند اشعار میں وہ کونسی بات ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کا خطاب ہندوستان کے تمام شہریوں سے نہیں کسی مخصوص فرقے سے ہے۔ یا اس کا مطالعہ صرف ایک فرقے کی قوت فکر و عمل میں بیداری اور جوش و خروش کا باعث ہو سکتا ہے باقی میں نہیں

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت آدم کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ہے
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے

اقبال کی فکر نے جو چراغ روشن کیا ہے اس کو تہ داماں رکھنے سے کسی کو راستہ نہ ملے گا۔ برصغیر ہند اپنے اس عظیم فرزند سے اگر اس میں بھی کچھ نہ لے سکا جب کہ یہ دور تعمیر و ترقی کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہے تو کب لے گا۔ جب آنے والا مورخ ہماری کوتاہیاں گنانے وقت بیٹھے گا کہ ہمیں اپنے اچھوں کو پہچاننا نہیں آیا۔ آئندہ نسلیں شرم سے گردن جھکا لیں ... ان نسلوں کی سرخروئی کا سامان ہم آج بھی کر سکتے ہیں جس میں خود ہماری بھی سرخروئی ہے۔

نگار کا زیر نظر شمارہ ہندوستان کے اس قابلِ فخر فرزند کی یاد م... کے لیے شایع کیا جا رہا ہے۔ اس میں جو تحریریں شامل ہیں ان میں سے د... آج سے ۱۰ سال پہلے رامپور رضا انٹر کالج کے یوم اقبال میں پڑھی گئی تھ... یعنی خطبۂ صدارت اور اکبر و اقبال۔ یہ تحریریں ایک خاص حلقے سے آ... نہ پڑھ سکیں اس لیے ان کو اس نمبر میں شریک کر لیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت لازماً ۶۳ء کو سامنے رکھنا چاہیے۔

مولانا عبدالسلام خاں صاحب کا مضمون خصوصیت سے ا... شمارے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ مضمون اپنی موجودہ شکل میں نامکمل ہے ... اس میں اقبال کے فکری رجحانات کی نشاندہی صرف ۱۹۰۵ء تک کی گئی ... آئندہ قسطوں میں اس سلسلے کی مزید کڑیاں سامنے آئیں گی۔ صاحب مقا... اقبال پر اپنے کئی وقیع مضامین کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ... نگار کے اس جدید دور میں موصوف سے دستگیری و تعاون کی بڑی امید... وابستہ ہیں۔

خطبۂ صدارت یوم اقبال

جو گورنمنٹ رضا انٹرمیڈیٹ کالج رامپور میں ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو پڑھا گیا

رشید احمد صدیقی

بزرگان رامپور، دوستو اور عزیزو! آپ نے مجھے یاد فرما کر میری توقیر بڑھائی ہے اسے میں ذاتی منزلت کے ساتھ شعبۂ اردو کی بھی منزلت سمجھتا ہوں جس کے متعد ارکان اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں، سرور صاحب آپ میں ممکن ہے پرانے ہو چلے ہوں لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم، اے ہیں جن کا مقالہ آپ سہ پہر میں سنیں گے، یہ ہمارے ہاں پی ایچ ڈی کے طالب علم اور شعبہ میں معلم بھی ہیں تیسر مسٹر نور محمد ہیں جنھوں نے اردو میں ایم، اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

صاحبو! مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لیے جائیں گے باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں قابل رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں انھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبال کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں ریاست رام پور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے گو مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اس حال میں بھی یوم اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو! اردو تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علیگڑھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا تھلکوں کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعرا شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے۔ حسن عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل سے مشکل بحر قافیہ اور ردیف میں جلد سے جلد سہ غزلہ چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست کی آواز" ملتی ہے دریائے لہ کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعرا پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ ان چوٹوں کو ابنائے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں حسن ظن سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سر کیے ہیں یہ ایک سہی! اردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعرا نے تفریح یا تفرع سے اور کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک سے قطع نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاعری نہیں کی۔

صاحبو! میں اتنا ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض مواقع پر اچھے راستے پر لگایا ہے اس کی پہلی مثال انیس کے ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا جو رنگ ڈھنگ تھا اس کو منقلب کر دینے کا سہرا انیس اور انیس کے

کے خاندان کے سر ہے۔ انھوں نے قوم کے مزاج کو پہچان کے شاعری کا رخ بدلا لیکن اپنے زمانے کے ڈھنگ کو نہ بدل سکے۔ شعر و ادب کو گرمایا کیا۔ مذہبی شاعری میں محسن کاکوروی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محسن کے اس کمال کا اعتراف کم لوگوں نے کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے تنہا شاعر ہیں جنھوں نے لکھنوی شاعری کے کمزور پہلو کو اپنے نعتیہ کلام سے دل کش بنا دیا، دیا شنکر نسیم ان سے پہلے گزرے ہیں جن کی گلزار نسیم کی بے ساختہ صناعی کی نظیر ہماری شاعری میں نہیں ملتی۔ لیکن جس پل صراط پر محسن کو چلنا پڑا نسیم اس سے بالکل محفوظ رہے۔ انیس اور انیس کے کلام نے ہمارے ادبی مزاج کو سدھارا اور سنوارا۔ بالخصوص اس وقت جب ہمارے ہاں سوز مزاج کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

انیس کے بعد حالی نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو موڑا اور اس کو ایسی وادیوں سے گزرنے کا موقع دیا جہاں نہ صرف اس دھارے کی حیات بخشی میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی رو اور روانی میں زور آیا۔ حالی سے پہلے شعر "تلخی" کام و دہن کی آزمائش میں بطور کار خیر شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حالی زہر غم قلب و جگر میں اتار چکے تھے۔ ان کا رنج و الم شخصی یا رسمی نہ تھا۔ ان کے غم سے انسانیت ماتم گسار نظر آنے لگتی تھی۔ حالی کے ماتم میں حرکی و تخلیقی استعداد پائی جاتی ہے۔ حالی نے غالباً سب سے پہلے اس حقیقت کو پیش کیا کہ خلوص درد مندی، علم آرٹ اور انسان سب کی معراج ہے شاعری میں حالی نے سچائی کو آرائش و زیبائش پر ترجیح دی۔ حالی کا لہجہ دھیما ہے لیکن اس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ شور و سکوت دونوں میں یکساں سنائی دیتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حالی کی شاعری نے مسلمانوں میں اضمحلال اور افسردگی پیدا کر دی۔ یہ بات درست نہیں ہے حالی کی مثال اس شخص کی ہے جو سردار کی بے گور و کفن نعش پر جھول میں دبکا نہیں کرتا بلکہ ایک خطبۂ میت دے رہا ہے جس سے تھکی ہاری سپاہ اور ساتھیوں کا عزم نئے سرے سے بیدار ہوتا ہے۔ مسدس سے قطع نظر حالی کی شکوہ ہندی میں بصیرت رکھنے والوں کو وہ چیز نظر آئے گی جو مسلمانوں سے نہیں انسانیت سے اوجھل ہو گئی تھی، حالی نے مسلمانوں کے زوال کو انسانوں کا زوال منوایا ہے۔ حالی نے مسلمانوں کے جن فضائل کے زوال کا ماتم جس خلوص اور سطوت حزیں سے کیا ہے اس نے شکوہ ہند کو دنیائے ادب کی عظیم المرتبت المیہ کے بہت قریب کر دیا ہے۔

حالی اور اکبر کا زمانہ ایک ہے لیکن دونوں کی شاعری کے حدود مختلف ہیں۔ حالی کے مد نظر اسلام اور مسلمان ہیں، اکبر مشرق اور مشرقیت کے نمائندہ ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو مغربیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھتے ہیں اور اپنی جیسی کر گزرتے ہیں۔ اکبر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کو مغرب میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ وہ مغرب سے ناواقف تھے۔ وہ مغرب کی سطحی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ قدیم کو ہر اعتبار سے مقدس و محترم گردانتے تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انگریزی تعلیم پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اکبر جس زمانہ میں تھے اس میں ہمارے بڑے سے بڑے صاحب فکر و نظر یورپ کی اس نصیحت سے مرعوب تھے جو اکبر کو نظر آتی تھی۔ اس زمانہ کی متعدد تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اہل نوادر ہم اپنے مذہب کو بھی اسی حد تک برحق یا قابل اعتبار سمجھتے تھے جس حد تک اس کی سند جواز مغرب کے اعمال و افکار میں ملتی تھی۔ ایسے زمانے میں بھی اکبر مغرب سے مرعوب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی حد تک ان کی بڑائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وہ لوگ جو مغرب سے پورے طور پر آشنا ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جو آج اسی دیار اکبر میں یورپ کی بڑائی ہر شعبۂ حیات میں تسلیم کرتے ہیں۔

اکبر کی مصطلحات شاعری ذرا [illegible] قسم کی ہیں۔ ان کے بدھو میاں تنقید کے برہمنوں کو نہیں بھاتے، اکبر سیدھی بات بہت جلد بغیر کسی پیچ کے کہہ دیتے ہیں۔ اس سے شعر و ادب کے "اشراف و ثقات" گھبراتے ہیں۔ یہ رویہ یا نقطۂ نظر تنقید کی شریعت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر ہر شاعر کو اختیار رہے چاہے وہ کل سے جز کا استنباط کرے چاہے جزو سے کل کا۔ اکبر ہی نہیں کوئی بڑا شخص یا شاعر کو لیشن فیکٹری نہیں بنا سکتا۔ اس کے ہاں [illegible] نہیں ہوتی۔ یعنی یہ بھی درست اور وہ بھی درست نہیں۔ شاعر کا یہ ٹیکنیک نہیں ہوتا۔ یہ کام ہمارا آپ کا ہے کہ ہم شاعر کو جریب اور ترازو سے ناپنے کے بجائے اس کو سمجھنے اور چاہنے کے لیے ذوق و ذہانت سے کام لیں۔

حالی کے زمانے میں ہونے کے باوجود نفسیاتی ترقی کے اعتبار سے اکبر ایک طور پر حالی سے آگے ہیں۔ ہاں سودا کی ہجویات سے قطع نظر اکبر ہماری شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہنسنے ہنسانے میں پہل کی ہے۔ یہ کام حالی کے عہد میں کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

صاحبو! میری یہ گفتگو اب تک آپ کو غیر متعلق معلوم ہوئی ہوگی لیکن اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ان مقامات سے گزرنا ضروری

تھا۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اقبال اب اس درجہ پر فائز ہیں جہاں یہ حکم لگانا بے محل نہ ہوگا کہ جو اقبال کا معتقد نہیں وہ خود بے بہرہ ہے۔ کوئی شاعر یا آرٹسٹ وسیع اور حقیقی معنوں میں شاعر یا آرٹسٹ نہیں ہے، اگر وہ سارے جہان کا شاعر یا آرٹسٹ نہ ہو۔ آپ اور میں اقبال کو مسلمان شاعر مانتے ہیں اور غلط نہیں مانتے۔ اور نہ ایسا سمجھنا اقبال ہی نہیں کسی بڑے شاعر کی شان کے منافی ہے۔ اقبال کو میں انہیں معنوں میں مسلمان شاعر مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہان کا مذہب سمجھتا ہوں۔ اگر رحمۃ اللعٰلمین سارے جہان کے لیے باعث رحمت ہیں تو ان کا نام لیوا، خواہ وہ شاعر ہو یا لیڈر، سارے جہان کے لیے شاعر اور لیڈر ہوگا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہم میں آپ میں جو لوگ اقبال سے نا واقف ہیں یا اقبال کے قائل نہیں ہیں وہ نہ صرف غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ غیر متمدن بھی ہیں۔ وہ شخص یقیناً تعلیم یافتہ یا متمدن نہیں کہا جا سکتا جو آفاق گیر شعرا یا آرٹسٹ کی عظمتوں سے نا آشنا ہو۔

شاعر، مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبال کو ہمارے ادب اور زندگی میں وہ درجہ حاصل ہے جو آج تک مسلمانان ہند میں کسی اور شاعر اور مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا۔ فرداً فرداً ممکن ہے ہمارے بعض شعرا کا پایہ اقبال سے برتر ہو لیکن بحیثیت مجموعی اقبال ہمارے اردو شعرا میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نا معلوم طویل مدت تک اردو شاعری میں اقبال کی حیثیت خاتم الشعرا کی رہے تو تعجب نہیں، مذہب ہی نہیں شاعری میں بھی نبی اکثر گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔ رسول کم ہوئے ہیں۔

صاحبو! جب اقبال نے اپنا کلام و پیام ملک کے سامنے پیش کیا اور یہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھا لیکن ان کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آگیا جب ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اقبال کا قائل نہ ہو۔ ہم ان کے کلام کو صوری و معنوی ہر صورت سے سراہتے ہیں اور ان کو سب سے بڑا شاعر اور مفکر گردانتے ہیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ ابتدا میں ان کی شدید مخالفت کی جائے اور آخر میں ان پر جان نثار کی جائے۔ اردو میں ایک سے ایک بڑا شاعر مانا جاتا ہے مگر ہمارے ذہنوں پر اقبال کی جو عالمگیر گرفت ہے وہ کم تر کسی کے حصے میں آئی۔ یہاں تک کہ ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اقبال کو خاصان خدا کے زمرے میں رکھتے ہیں۔

اردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اردو میں غالب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعرانہ جذبہ میں مفکرانہ گہرائی پیدا کی۔ اس کا اعتراف خود اقبال نے کیا ہے۔ غالب کے عجمی تصورات سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو فلسفیانہ شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا سہرا غالب کے سر ہے۔ بعض غزلوں یا اشعار سے قطع نظر غالب کی زبان جہاں کہیں انھوں نے فکر و فلسفہ کو دخل دیا ہے علمی زبان بن گئی ہے۔ معتقدانہ شاعرانہ انداز میں شاعری کرنے کا امتیاز انیس و محسن کو حاصل ہے گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ مرثیہ نگاروں میں انیس وہ ہیں جنھوں نے مرثیے کے زور سے اپنی شاعری کو نہیں بلکہ اپنی شاعری کے زور سے مرثیے کو چمکایا۔ زبان کے اعتبار سے انیس کو جو درجہ حاصل ہے وہ مسلم ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اردو بیشتر شاعرانہ زبان رہی ہے اس لیے ایسی شاعری میں جہاں خیالات سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہو یہ خوب کام دیتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اس میں ایسے عناصر داخل کیے گئے جو خالص شاعرانہ نہ تھے تو یہ ناہموار نظر آنے لگی ایسی ناہموار کہ اس کے پرستار اس شاعری کے بھی قائل نہ رہے جس نے اس میں اپنا کلام پیش کیا۔ غالب اور حالی کا یہی حشر ہوا۔

صاحبو! اقبال کو بھی اس منزل سے گزرنا پڑا۔ انیس کا یہ کمال تھا اور مرثیہ کی خوش بختی کہ انیس نے مرثیہ میں وہ ساری خوبیاں جمع کر دیں جو دیگر اصناف سخن میں علیحدہ علیحدہ موجود تھیں۔ ان کے کلام میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدس حتیٰ کہ ڈراما اور افسانہ سب کے خصوصی امتیازات بڑے دل کش اسلوب میں سمائے ہوئے ملتے ہیں۔ میر کے بعد انیس کو زبان پر جو قدرت تھی وہ آج تک نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ اقبال کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ میر و مومن کے مقابلے میں آپ اقبال کی زبان کو شاید نا قابل التفات سمجھیں لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرہ اور محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مد نظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں کی بنا پر اختیار کی ہے اور کامیاب یا ناکامیاب رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ اقبال کا موضوع سخن کیا ہے۔ ان کا انداز تخاطب کیا ہے۔ ان کی ذہنی پرداخت کیسی اور ذہنی پرواز کس طرح تھی۔ ان کا مقصد کیا تھا اور ان کے مخاطب کون ہیں تو آپ اقبال کی زبان کے قائل ہو جائیں گے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا ہے کہ جہاں تک مسائل علمیہ و فکریہ کو شعر میں ڈھال کر دل نشین اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے۔ غالب کی زبان سے اقبال کی زبان زیادہ متوازن و شگفتہ ہے گو یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس وادی کے

کے کانٹے نکالنے کا کام غالب ہی نے کیا اور اس طرح اقبال کے لیے زمین ہموار اور صاف ملی۔ روزمرّہ اور عام بول چال کی زبان سے یہاں بحث نہیں۔ اقبال کے ہاں اس زبان کا گزر نہیں، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو جس ماہرانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے اردو کلام میں منتقل کیا ہے اس سے ہندوستان میں اردو اور فارسی دونوں کا وزن و وقار بڑھ گیا۔

صاحبو! اردو شعرا میں ایسے اصحاب بھی نظر آتے ہیں جو شاعری کے علاوہ دوسرے علوم و فنون پر بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس کا اثر ان کی شاعری پر بہت کم نظر آتا ہے۔ بعض شعراء علمی و فنی مصطلحات کی رعایت اپنے کلام میں مدنظر رکھتے ہیں ہم اپنے حسن ظن سے ان کو اس علم و فن کا امام قرار دیتے ہیں، حالانکہ جو لوگ شاعری اور انشاء پردازی کے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی رعایت و مناسبت کا فن جاننے سے دور دور تک علم کا تعلق نہیں یہ سارا کرشمہ ضلع جگت یا رعایات لفظی کا ہے جو ایک زمانے میں ہمارے شعر و ادب اور روزمرہ کی صحبتوں میں بہت مقبول تھے۔ یہی حال بڑی حد تک اردو شاعری میں تصوف کا ہے۔ اردو میں ایسے شعرا بہت کم گزرے ہیں جو واقعتاً تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے یا جنھوں نے تصوف کا مطالعہ کیا ہو، یہی سبب ہے کہ ہم کو اردو شاعری میں زبانی کھیل زیادہ ملتا ہے۔

صاحبو! ہم میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ شاعری میں جذبہ ہی سب کچھ ہے۔ میں ایسے جذباتی شعراء سے واقف ہوں جو جذبہ کو خدا کی سب سے بڑی دین اور اپنا سب سے بڑا سرمایہ افتخار جانتے ہیں، جذبہ کو میں بھی خدا کی سب سے بڑی دین سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ ہمارے شعراء کی شامت بھی بن گیا ہے۔ اگر غور فرمایئے تو معلوم ہو جائے گا کہ جذبہ بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر اس کو حرکت میں لانے اور صحیح راستے پر لگانے کا ملکہ فکر و تجربہ نے شاعر کو نہ عطا کیا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی اقبال شاعر نہیں فلسفی ہیں یا ان کی شاعری پر فلسفہ غالب ہے

میرے نزدیک اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اقبال کا درجہ (اور برگزیدہ شاعر کا درجہ) اس بحث سے کہیں بلند ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں فلسفی بعد میں یا اس کے برعکس بحیثیت مجموعی شاعری میرے نزدیک مخصوص پیرایۂ اظہار ہے نہ موضوع بحث، تمیز ہو تو فلسفہ، سائنس، منطق وغیرہ کو بھی شاعری کا رنگ و آہنگ دیا جا سکتا ہے اور سلیقہ نہ ہو تو حسن و عشق کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک اقبال کا شاعر ہونا ان کے فلسفی ہونے کا منافی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے مفکر یا فلسفی ہونے سے ان کی شاعری کی منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نرا شاعر اور نری شاعری کا چسکا ہم کو غزل سے پڑا۔ یہاں تک کہ اکثر ہم غیر شعوری طور پر بھی یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعری عبارت ہے غزل سے بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری اور تغزل مترادف نہ سہی ان کا چولی دامن کا ضرور ساتھ ہے۔ شاعری کا یہ تصور اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ اس سے ہمارے تمدنی مزاج کی غمازی ہوتی ہے یعنی حسن و عشق تمام تر عبارت ہے عورت کے حسن سے!

اقبال کا حسن و عشق اس سے علیحدہ بھی ہے، بلند بھی ہے اور شاید اس کا منافی بھی۔ لیکن اس بحث کو کسی دوسرے موقع کے لیے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اقبال کی عظمت کی نشانی ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام میں شاعر اور مفکر دونوں نظر آتے ہیں۔ مفکر اگر شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم اس کی بات سمجھ لیں یہ البتہ دشوار ہوگا کہ ہم اس کے کہنے پر عمل بھی کریں اس طرح شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم مشاعرے میں واہ واہ کر لیں تنہائی و تکلیف میں وہ ہمارا مونس یا رہبر نہ بن سکے گا۔ اردو شاعری میں خالص شاعر بھی گزرے ہیں۔ ان کی شاعری کو ہم اچھی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے یہاں اچھے شاعر بہت سے گزرے ہیں بڑے شاعر یقیناً بہت کم ہیں۔

صاحبو! اردو شاعری میں صرف اقبال کی شاعری ایسی ہے جو ہم کو ان علوم و مسائل تجربات و تحریکات کی طرف بے اختیار متوجہ کرتی ہے جو اس وقت عالمگیر ہیں اور جن کی گرفت عام اور تعلیم یافتہ ذہنوں پر ہے انھوں نے دنیا کے اکابر اصحاب فکر و عمل کے خیالات، تعلیمات و جدوجہد کو اپنے کلام کے ذریعے اس شاعرانہ لطف و نزاکت اور عالمانہ بصیرت و سنجیدگی سے پیش کیا کہ ہم ان کو اصحاب فکر سے ایک طرح ذہنی ربط پیدا ہو گیا اور اس طور پر ہم نہایت آسانی کے ساتھ ان تمام عالمگیر ذہنی تحریکوں سے آشنا ہوئے جن سے کسی اور طرح ہمارے عامۃ الناس روشناس نہ ہو سکتے تھے شاعری کا بڑا کمال اور اس کے لیے سب سے مستند سند جواز یہ ہے کہ وہ مشکل گہرے اور نازک تصورات و خیالات کو بہت جلد زیادہ سے زیادہ

دلوں میں اتار دیتی ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے جو شاعری کے علاوہ کسی فن کو نصیب نہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات صرف اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے ان افکار و تحریکات کی خوبی اور خامیوں کو اسلامی افکار و اعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص و عوام دونوں گمراہ ہونے کے بجائے بہرہ مند ہوئے۔

سیاسی لیڈر تو ہم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ذہن و فکر کو طاقت و تازگی بخشنے اور صحیح راستے پر رہنمائی کرنے والا ہم میں عرصے سے نہیں پیدا ہوا تھا۔ آج کل مادی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ہے۔ آجکل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے اتنی ہی ذہنی قیادت مشکل ہے۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہے لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی میں اقبال کو نصیب ہوئی۔ اقبال نے زندگی اور زمانے اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل مہم پر حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اور کچھ ایسے دل کش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں ان مسائل کو سمجھنے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور نہیں کامیاب ہوتا ہے تو کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کے وسیلے سے قوائے علمیہ و عملیہ کس طرح بیدار و بالیدہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی مثال اس متاع یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کے اہل ثروت و اقتدار ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازار مصر میں آ موجود ہوئی تھی۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کی اس کرامت کا عام ذہنی نشوونما اور ذہنی حوصلوں پر کیسا عظیم الشان اثر ہے۔

صاحبو! اسلام نے اپنے پیروؤں کو دین و دنیا کی ان منزلتوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی اور منزلت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن و عمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سراسیمہ یا متحیر کر سکتا۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر مذلت میں جا پڑے اور اس تصور نے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ تھے ان کو شدید نقصان بھی پہنچایا۔ یہ سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں ہم نے ہر طرح کے جتن کیے لیکن شعور کی وہ بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے مدتوں نصیب نہ ہوئی۔ مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم سحور و مرعوب ہوتے رہے۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار تھے۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور بیشتر ادارے اس پر گواہ ہیں اقبال کے کلام کی گرمی اور تازگی ان کی تعلیم کی گیرائی اور گہرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خشک ہوتے ہوئے پتے اور کتنے سوئے ہوئے ساز نغمہ سرا ہو گئے، ہندی مسلمانوں میں جو ہمہ جہت بیداری آج نظر آ رہی ہے اس کو جو نام چاہے دے لیجیے یہ کرامت اقبال ہی کی ہے جس کے لیے زمین غالب، حالی، اکبر، سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔

صاحبو! اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو درکنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا تھا۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی مستند اور مشرق کا ہر تصور و تفویم مردود تھی۔ اقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کر دی۔ اب کسی بحث میں اقبال کا کلام یا ان کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے۔ بعض فروعی باتوں سے قطع نظر اقبال نے وہی چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں موجود تھیں لیکن نیا ذہن ان کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ اقبال کی تعلیم کی بنیاد قرآن و حدیث، ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اقبال نے ان باتوں کو جس قابلیت خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا اس کا نتیجہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں محترم ہو گئے، اور اس طور پر محترم بنے کہ دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں بلکہ کچھ دور تک ایک ساتھ چلی گئی ہیں۔

صاحبو! ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبال کو مفکرین یورپ کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ

آج کل بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ خود اسلام اپنے پیشرو مذاہب سے ماخوذ ہے یا ان کا خوشہ چیں ہے۔ اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اقبال نے جو باتیں کہیں بھی مفید مطلب پائی اختیار کرلی اور باقی کو ترک کردیا یہ سارے اعتراضات تسلیم کرلینے چاہئیں۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک اسلامی تصورات کی تصدیق کرتے ہیں، نہ کہ تکذیب، واقعات صحیح ہیں صرف ان سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اور کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی و تمدنی آثار و کسر انکسار سے یکسر محفوظ و علیحدہ رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہوگیا وہ جملہ دوسرے ادیان کا ناسخ بھی ہے اور تصدیق کرنے والا بھی۔ ناسخ اس لیے کہ اسلام دین کامل قرار دیا گیا اس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مرد کامل ہے اور اس طاقت نے اس کو کامل قرار دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آسکتی اور تصدیق کرنے والا یوں کہ وہ ان ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اس سے پہلے کے ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اس سے اسلام کا درجہ فروتر کیوں کر ہوا؟ کلام الٰہی یا مذہب الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات و حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی حال و مستقبل سے بیگانہ نہیں ہے اس لیے کہ دنیا کی تاریخ تقدیر الٰہی سے باہر نہیں۔

صاحبو! اس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبال نے مفکرین یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے اور اقبال نے مفکرین یورپ کی انہیں باتوں سے سروکار رکھا ہو جو ان کے کلام و پیام کی تائید و تصدیق کرتے ہوں (بقیہ سے نہیں) تو کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ مفکرین یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامیوں کے تصرفات ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے یہ بحث بڑی طولانی ہے اس صحبت میں میں صرف اقبال کو مد نظر رکھنا چاہتا ہوں اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفہ مغرب کا کافی اثر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اقبال نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مطالعہ سے پہلے وہ ان اسلامی تصورات و عقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو کلام پاک کے مطالعہ کا نتیجہ تھے۔ میرے نزدیک ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اقبال مغربی مفکرین سے متاثر ہی اس لیے ہوئے کہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ اسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن و عمل کو انسانی ارتقا کی اس وادی میں لے جاتے ہیں جس کا ایک سرا میلاد آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا معراج آدم میں پوشیدہ۔

صاحبو! اس بحث میں گفتگو کی گنجائش ہے لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے میں اس مسئلہ کو یہاں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور اپنے ان نوجوان دوستوں کو جو اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبال کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلام پاک کا مطالعہ کریں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے اور اقبال کو مغربی مفکرین کے تصورات سے دلچسپی ہی اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے تصورات کلام الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبال ان مفکرین کے اسی حد تک ہمنوا ہیں جس حد تک قرآن پاک سے ان تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے ایک عزیز ذی استعداد طالب علم نے اس پر کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے کچھ تعجب نہیں آئندہ سال یوم اقبال کے موقع پر سرور صاحب کی معرفت آپ اس طالب علم کے اس مقالہ سے اسی ایوان میں آشنا ہوں۔

بعضوں کے نزدیک اقبال کے ہاں جہاں تہاں منطقی الجھنیں ملتی ہیں۔ خودی اور خدائی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارے یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس سے روگرداں ہو جاتے ہیں اور اس قبیل کی دوسری باتیں۔ لیکن یہ امور ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آسکے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا کی قدرت کا سب سے بڑا نمونہ انسان ہے اور انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ رشتہ زندگی کا ہے اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو اوجھل ہوتی رہتی ہے معدوم نہیں ہوتی۔ یہ زندگی خدا سے شروع ہوتی اور خدا پر ہی ختم ہو جاتی ہے انسانی زندگی کبھی اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودی ہمیشہ انسانی خودی رہے گی اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے بلکہ خدا کی صفات سے قریب تر ہو کر مرتفع تر و محکم تر ہوتی رہے۔ انسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک انسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے اس لیے کہ انسان کا خدا بن جانا انسانیت

کے مقاصد میں نہیں ہے۔ اسکا کام خودی سے اقبال کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ختم نہ ہو۔ انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے کسی اور کی ابتدا یا انتہا نہیں۔

صاحبو، یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو ہوں مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ مذہب اس بحث سے بلند بھی ہے اور علیحدہ بھی۔ در اصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام کا مدار چند بنیادی عقائد پر ہے اس کے بعد ان عقائد کے ماتحت تمامتر عمل پر ہے۔ بذاتِ خود میں سمجھتا ہوں کہ عقائد کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اتریں، عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ سائنٹیفک ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ فلسفہ دراصل مذہب کا گورستان ہے۔ دنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفہ کے جراثیم موجود تھے۔ اگر اسلام مذہبِ عمل نہ ہوتا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اس درجہ اہمیت نہ دی جاتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے شجرِ اسلام میں نمی و نمود ہے یہی سبب ہے کہ اسلام پر برے سے برا وقت آیا لیکن اس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہیں ہوئی۔ انسانی جہد و عمل کا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ درسِ خودی میں اقبال اسی جہدِ پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں محبت، فاتحِ عالم، بھی شامل ہوتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اقبال کے بیانات میں تضاد ملتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ اسلام کے خدا کی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر برسرِکار آتی ہیں۔ اسلامی سیرت و شخصیت میں "فولاد" و "پرنیاں" دونوں ملتی ہیں۔ ضربت کاری بھی اور خوئے دلنوازی بھی۔ لیکن اس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہیے۔ بہت ممکن ہے آج کی صحبت میں کسی گوشے سے ان پر تفصیلی گفتگو سننے میں آئے۔

صاحبو! میں نے اقبال کا کلام پڑھا ہے۔ بار بار پڑھا ہے ہر حال میں پڑھا ہے، دکھ میں بھی سرور صاحب سے کم پڑھا ہے، مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اقبال کا کلام اس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے، گرمی، برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس بساط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین، پراسرار، ڈرانے والی، تسکین دینے والی، حوصلہ دلانے والی تصویریں اور تصورات جیسے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے "دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان جن کو جب دیکھیے، جتنا دیکھیے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور محسوس ہوگی جو پہلے نہ ہوئی تھی!

صاحبو! آپ کو یاد ہوگا، میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال کا کلام و پیام ہماری زندگی کی سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے مسلمانانِ ہند میں ایک جدید نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا کونسا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبال کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی۔ ان کے فلسفہ نے نئے علم کلام کا دروازہ کھولا، شعر و ادب میں نئی قدریں سامنے آئیں۔ تعلیمی مسائل میں اقبال کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی ہیں، ہمارے آپ کے پروفیسر سیدین نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف میں اقبال کے ان نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی اساس مانے جاتے ہیں، ہماری موجودہ سیاسی تگ و تاز میں اقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی میں اقبال کی تعلیم نے وہ کام کیا جو ابتک پورا نہ ہوا تھا، اقبال ہی کے تصور سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا اور قومی شعور کی صحیح راستہ پر نشو و نما ہوئی۔ اقبال کے کلام و پیام سے مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور حضرت اسمٰعیل شہید کے کارناموں کو از سر نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اتنا جامع حیثیات شاعر ابتک نہیں پیدا ہوا جو بیک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلم و مفکر تھا۔ اس کی یادگار منانا اور اس کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا سعادت مندی بھی ہے اور اقبال مندی بھی! خدا آپ کی مدد کرے۔

چھیڑ غالب سے چلی جائے

غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بے حد دلچسپ انداز سے پیش کرنے والی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے: قیمت ۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

اقبال کا فکری ارتقاء

محمد عبدالسلام خاں

ظروف اور ذہنی فعالی

واردات انسانی فکر کی صورت میں ہوں یا وجدان کی شکل میں۔ ان میں ماضی کے تجربے، مستقبل کے تقاضے اور موجود ظروف و احوال کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کے فلسفیانہ نظام، سائنسی انکشاف اور جمالیاتی اظہار ہزاروں سال پہلے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہوتے اور ہمارے حصے میں بزرگوں کے ورثے کی حفاظت کے سوا کچھ نہ آتا تاہم یہی سب کچھ نہیں ہے فرد کا شخصی تاثر اور اس کی ذہنی صلاحیت، شخصیت کی ذاتی فعالی اور تاثیر ناگزیر عامل ہیں ان واردات کی آمد، صورت پذیری اور ظہور میں۔ ورنہ یکساں ظروف میں ہر شخص افلاطون و ارسطو ہوتا، ہر فرد ایڈیسن اور اسٹیفینسن بنتا، غالب اور اقبال میں کوئی ندرت نہ ہوتی۔

اقبال کی حکیمانہ فکر اور فلسفیانہ نظام میں بے شبہ دانایان مغرب اور حکمائے مشرق دونوں کے افکار کا نمایاں اثر ہے۔ مغرب کے مادی ارتقا کو بھی دخل ہے اور مشرق کی زوال آمادہ ثقافت سے اثر پذیری کو بھی۔ ان کی فکر میں اسلامی دنیا کے ہر جہتی انحطاط کا عموماً اور ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کا خصوصاً ایک مقام ہے۔ امت مسلمہ کی رفعت کی عام آرزو خود بھی ایک محرک ہے۔

فکر اقبال کے ظروف

اقبال کا گھریلو صوفیانہ مذہبی ماحول اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، مکتبی اور مدرسی مضامین اور اساتذہ کی صحبتیں ان کی فکر کو ایک خاص سمت میں ڈال دینے کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی عصبیتوں اور فرنگی استعمار کی سیاست کاریوں کو بھی ان کی فکری تعمیر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کی صحت بخش آب و ہوا، جمالی طاقتیں اور ان کو بڑھانے کے وسائل سے دل چسپی، قوت کے مظاہرے اور اقبال کی ان سے عملی دل چسپی ان سب کا ایک طرح سے اثر ہے ان کے خیالات کے میلان میں۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں مغرب کی مادی قوتوں کا ہندوستان پر کامل استیلاء اور اس کے افکار و تصورات کی قوت قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذہبی عقائد اور ان کی دینی روایات کو بھی متزلزل کیے ہوئے تھے۔ سر سید مرحوم کے اعتذاری مباحث اور اجتہادی انتقادوں نے بڑی حد تک اس تزلزل پر نظری طور سے قابو پانے کی کوشش کی۔ سر سید کی ان بحثوں اور تنقیدوں کا علمی فائدہ یہ ہوا کہ مذہبی مباحث کی تحقیقات میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا اور مجتہدانہ نظر و بحث کے لیے نئے رستے کھل گئے۔ شبلی اسکول نے ان آزاد بحثوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ شبلی اور ان کے رفقاء اور شاگردوں کے علم و فضل، اعتدال پسندی، عمق اور ثقاہت نے اس اعتذاری لے کو بہت ہلکا کر دیا اور بے روک ٹوک اجتہاد کی بندش کی۔ مولانا آزاد مرحوم نے قرآنی صداقتوں کو اور مسلم کرداروں کو علمی ماحول میں جس اچھوتے خطیبانہ انداز میں پیش کیا، اس نے ان میں نئی زندگی بھر دی۔ اسی فضا کی ایک عظیم شخصیت خود اقبال بھی تھے۔

یہ احوال و ظروف کتنے ہی موثر سہی لیکن ان سے اقبال کی فکر کی کامل توجیہہ نہیں ہوتی۔ ایک خاص رخ سے معلومات و محسوسات کا انتخاب جمع، جائزہ، ترتیب اور استنباط کسی خاص جذبے یا جذبات کے رہین منت ہو سکتے ہیں لیکن خود اقبال کی اپنی ذہنی ساخت اور ان کی فعالی اُن کے نظام فکر کی تشکیل میں سب سے اہم عامل ہے۔ دوسری چیزوں کی حیثیت محرکات سے زیادہ نہیں۔

اقبال کا نشو و نما اور تعلیم و تربیت

اقبال جو اس عہد کے ایک عظیم مفکر تھے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کے ایک

ایسے متوسط الحال اور پیشہ ور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں صوفیانہ خیالات اور بزرگوں کی کشف و کرامات کا خاصا چرچا تھا۔ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے دلچسپی تھی۔

اقبال نے مکتبی تعلیم جس میں فارسی ادبیات کے اوسط اور عربی کے ابتدائی مروجہ نصاب تک کی کتابیں شامل تھیں، کسی ٹھیٹ ملائے مکتبی کے بجائے قصبے کے روشن خیال، صوفی منش، جدید تعلیم کے ہمدرد اور سر سید اور ان کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی رکھنے والی اثر انداز شخصیت مولوی میر حسن شاہ کے پاس پائی۔ ان بزرگ کی نگرانی اور تعلیم و تربیت میں رہتے ہوئے ان کی ہدایت پر ہی اقبال اسکاچ مشن ہائی اسکول میں (جو بعد میں اسکاچ مشن کالج ہوگیا تھا) داخل ہوگئے اور وہیں سے ۱۸۹۳ء میں انٹرنس کیا۔ اسی زمانے میں اقبال کی پہلی شادی ہوئی لیکن باہم خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہوسکے اور شادی کے باب میں اقبال کی جو خوش آیند توقعات ہونگی وہ بر نہ آسکیں۔ بہر حال ان ازدواجی علائق کے ساتھ ہی ۱۸۹۵ء میں اقبال نے اسی کالج سے ایف اے کر لیا۔

مکتب و مدرسہ کی قید و بند کے باوجود اقبال لڑکپن کے عام شوقوں میں آزادانہ حصہ لیتے تھے۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی ان کے مرغوب شغل تھے۔ پنجاب کے متوسط گھرانوں کے نوعمروں کی طرح ڈنڈ پیلنا، مگدر ہلانا اور اکھاڑوں میں زور کرنا اقبال کے دلچسپ مشاغل تھے۔ شعر و شاعری سے لگاؤ فطری تھا طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ سیالکوٹ میں جو چھوٹے موٹے مشاعرے ہوتے ان میں شریک ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ داغ کو اُستادی کے لیے اقبال نے اسی زمانے میں انتخاب کیا تھا۔

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آگئے اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی ادب اور فلسفہ لے کر امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے کیا۔ ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج کے مشہور استاد، "پریچنگ آف اسلام" کے مصنف اور شبلی کے دوست اور استاد پروفیسر آرنلڈ کے شاگرد خاص کی حیثیت میں گورنمنٹ کالج سے ہی فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ لاہور میں رہ کر اقبال کا ذوق شاعری خوب نکھر گیا۔ غالباً ۱۸۹۵ء کی بات ہے کہ لاہور کے ایک مشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوئے اور غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

تم آزمانہ ہاں کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی تھا جس پر مرزا ارشد گورگانی عش عش کر گئے تھے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس زمانے کی شاعری میں اگر ایک طرف مجازی عشق سے دل بہلایا ہے تو دوسری طرف صوفیانہ واردات کو بھی نظم کیا ہے عشق حقیقی کی چاشنی بھی ہے۔ تاہم مذہبی کرداروں سے شیفتگی، دینی روایات سے محبت اور ملت اسلامیہ سے گہری وابستگی ان کی شاعری کا غالب عنصر ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا کے چند سال ہندستان کی سیاسی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندستانی قومیت میں اختلاف و افتراق کی خلیج وسیع ہوتی جارہی تھی۔ فرقہ پرورانہ مطالبوں اور ان کے ردعمل سے سیاسی فضا مکدر تھی۔ جمہوری خطوط پر قومی حقوق طلبی کی جدوجہد اور حکومت کے نظم و نسق اور اس کی حکمت عملی پر عوامی نقطہ نگاہ سے تنقید و نظر کو مسلمانوں کا سر برآوردہ طبقہ اپنے فرقہ وارانہ مفاد کے خلاف سمجھتا تھا۔ خاص طور سے یو۔پی اور بہار کے مسلمان وطنی تحریکوں کے خلاف صف آرا تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان غیر معمولی اقلیت میں تھے یا اپنی ایک گونہ اکثریت کی وجہ سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ان کا انداز نظر بدلا ہوا تھا۔ عام مسلمان کشمکش میں مبتلا تھے۔ جذبات کی رو میں کہیں قومیت کے خلاف صف آرا ہو جاتے کبھی شانہ بشانہ برادران وطن کے ساتھ نظر آتے۔ مسلمانوں کی کوئی مستقل، مستحکم اور مرکزی پالیسی نہ تھی۔ علی گڑھ قیادت سے آزاد جدید تعلیم یافتہ نوجوان اس افتراق و اختلاف سے متنفر تھا اور چاہتا تھا کہ ہندو مسلمان ایک جان اور دو قالب ہو کر خالص وطنی بنیادوں پر اپنی سیاسی جدوجہد کو استوار کریں اور نفرت و اختلاف کو قومیت متحدہ کے وسیع مفاد میں محو کر دیں۔

اقبال کا اس زمانے میں یہی رجحان تھا۔ چنانچہ ملت سے پوری وابستگی، مذہبی روایات سے پوری شیفتگی اور ملی کرداروں سے پوری عقیدت کے باوجود انھوں نے قومی جذبات سے معمور نظمیں لکھیں جن میں ملکی روایتوں، قومی کرداروں اور وطنی علامتوں سے والہانہ دلچسپی کا اظہار تھا۔ اور وطنیت و قومیت کو فرقہ وارانہ اتحاد کی بنیاد بنا کر متحدہ قومیت کی طرف دعوت دی تھی۔ آفتاب۔ ایک آرزو۔ ترانہ ہندی۔ نیا شوالہ

ہندوستانی بچوں کا گیت اور تصویرِ درد جیسی نظمیں وطنیت و قومیت کے جذبات سے معمور دل کی پکار ہیں۔ نالۂ یتیم، یتیم کا خطاب، خط منظوم عرض بجناب حضرت نظام الدین اولیار۔ ہلال عید اور سپاس جناب امیر وغیرہ نظمیں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان نظموں میں مذہبی تلمیحات کے ساتھ ملی روایات سے عشق، اسلامی کرداروں سے والہانہ تعلق پوری شدت سے موجود ہے۔

ایم اے کر چکنے کے بعد اقبال سب سے پہلے اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے استاد ہو گئے اور غالباً عربی درسیات کے مضامین، تاریخ فلسفہ وغیرہ کا درس ان سے متعلق ہو گیا اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت کی درسیات کے اساتذہ کی رفاقت میں انھوں نے تعلیمی کام انجام دینا شروع کر دیا۔ کچھ مدت بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں جہاں آرنلڈ تھے اقبال بھی فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۵ء تک وہ اسی اسامی پر رہے۔

اقبال کا مذہبی تصوّر اور وطنیت

اس عہد کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مذہب کے ہر جیتی جاگتی اصول زندگی ہونے اور اجتماعی و انفرادی تمام شعبہائے حیات کے لیے اس کے شیرازہ بند ہونے کے تصور تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایک باطنی لگاؤ، روحانی تعلق اور قلبی لطیفہ ہے جس سے انسانی جذبات میں لطافت اور تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ سارے عالم سے یگانگی اور دوستی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ عام خلوص ہمدردی اور محبت اس کے لوازم ہیں۔ دل آزاری اور شکوہ سنجی اس کی روح کے خلاف ہیں۔ "التجائے مسافر" میں التجا ہے:

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجکو

مذہب کا نچوڑ محبت ہے۔ "سپاس امیر" میں "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا" کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کو اصل اصول قرار دے کر حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہیں:

اے باب مدینۂ محبت
اے نوح سفینۂ محبت
اے مذہب عشق را نمازے
اے سینۂ تو امین رازے

"فریاد امت" میں اسلام کی حقیقت کی اس طرح توضیح کرتے ہیں:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مذاہب کا اختلاف ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں ان میں باطنی تضاد یا تصادم نہیں۔

اصل محبوب ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
ایک بیاضِ نظم ہستی کی ہیں تصویریں بھی

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری
ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے

اقبال کی اس متصوفانہ مذہبیت کا تقاضا ہے صلح کل اور عام وحدت اتحاد، افتراق و اختلاف سے نفرت:

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
میں کسی کو برا کہوں تو بہ
ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

"فریاد امت" میں واعظوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں:

غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا
یہ غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

اس روحانی لطیفہ اور باطنی مقدس حرارت کا کوئی متعین عملی تقاضا نہیں، کوئی خاص سیاسی یا ملکی ثقافت نہیں، خاص صورتوں اور خاص رسموں میں محدود نہیں، اس کے اپنے تلے مطالبے نہیں اس لیے اس کا نہ کسی قومیت سے تصادم ہے نہ کسی نظام سے:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی | کچھ اسی کے دم سے قایم شان ہے انسان کی
روح کا جوہر نکھرتا ہے اسی تدبیر سے | آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں | خون آبائی رگ تن سے نکل سکتا نہیں

چنانچہ اقبال ترانۂ ہندی میں اعلان کرتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا | ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

نیا شوالہ میں اختلاف و افتراق کی خلیج اس طرح پاٹتے ہیں:

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو | یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو | آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے ایک نرگن کہتے ہیں پیت جس کو | دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ سے جلا دیں

مذہب کا یہ تصور کچھ تو اس دور کے عام جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذاق طبع کا آئینہ دار ہے جو خاص طور سے اس کے عملی تقاضوں اور شعائر و رسوم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور ایک بہت نجی معاملہ سمجھ کر اس کی باطنیت اور روحانیت کو ہی سب کچھ جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ایران کے عام صوفی شعراء کے کلام سے حقیقی مذہب کا جو دل آویز اور روحانی تصور ماخوذ ہوتا ہے اس کی سرمستی اور سرجوشی کو چھوڑ کر اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جب ہر شے میں ایک ہی ازلی ابدی حسن کی جھلک ہے۔ بلبل کی چہک کی دوسری صورت گل کی مہک ہے۔ غنچے کی چٹک کا دوسرا نام انسان کا سخن ہے۔ جگنو کی چمک سوز ہے اور مرغ خوش نوا کا نغمہ ساز تو پھر تسبیح زنار کی دوسری صورت کیوں نہ ہو۔ اذان ناقوس ہی کی صدا کیسے نہ ہو۔ حقیقت کا یہ شاعرانہ تخیل، وجود کا یہ جمالیاتی تصور، تہذیبوں کی آویزشوں اور نصب العینوں کے تصادموں کے لیے جس طرح کوئی گنجایش نہیں چھوڑتا اسی طرح مذاہب کی ہنگامہ آرائیوں کے لیے بھی کوئی بنیاد نہیں مہیا کرتا۔

ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو | یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو

اقبال اور جستجو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا یہ تصور اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کی عام مذہبی توجیہیں اقبال کے دل و دماغ کو مطمئن نہ کر سکیں چنانچہ آغوش مذہب میں پرورش پایا ہوا اور بزرگوں کی عقیدت مندیوں کے گہوارے میں جھولا ہوا، شاعرانہ احساسات سے معمور، ذوق و وجدان کی وسعتوں سے روشناس، مغربی فلسفے کا یہ نوجوان طالب علم جب کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی فلسفیانہ فکر سراپا استفسار و جستجو بن جاتی ہے۔ وہ بہت سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس ہنگامۂ بود و نابود کا کوئی مقصد ہے یا یہ جمع و تالیف اور شکست و ریخت محض عناصر کا کھیل ہے؟ کبھی ہمالہ سے پوچھتا ہے:

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے | دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ل

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے | انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ | نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی | جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

پرندے اور جگنو کا مکالمہ ہے۔ جگنو کی زبان میں:

چمک تجشی مجھے آواز تجھ کو | دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز | جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

کبھی گل رنگیں سے سوال ہوتا ہے کہ "راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے"۔ اگر واقعی یہ عالم رنگ و بو کوئی با مقصد اور سوچا سمجھا کارنامہ ہے تو پھر چیزوں میں ہم آہنگی اور توافق کیوں نہیں۔ اس رزمگاہ اضداد کی کیا توجیہہ ہے۔ اگر اس عالم سے ماورا بھی کوئی جہان ہے تو وہ کیا ہے اور کیسا ہے اور کیا وہ بھی ناآہنگی کا شکار اور اضداد کی آماجگاہ ہے؟ "خفتگان خاک سے" استفسار کرتا ہے:

اے مئے غفلت کے سرمستو کہاں رہتے ہو تم — کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی — اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا — اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا — اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا
رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں — اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں
اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے — روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے — قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے

پھر اس تضاد اور ناآہنگی کے دور ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ "آفتاب صبح" میں اپنی اس آرزو کو بیان کیا ہے:

دیدۂ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں — ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے — حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

پھر کائنات کی سب سے دل چسپ اور دل آویز مخلوق انسان کی کہاں سے ابتدا ہے اور کونسی اس کی منزل ہے:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں — کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

پھر انسان جو اپنی ساخت اور استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے قدرت کا شہکار ہے کیا واقعی اس کی قسمت نیستی ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے — موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

اگر موت عدم محض نہیں ہے فقط انتقال مکانی ہے تو یہ انتقال تدریج کے بجائے دفعتاً کیوں ہے؟

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے — موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے

اس دوسری زندگی کی تشخیص و تعبیر میں جنت و دوزخ کے حوالے کا مفہوم کیا ہے، ان کی کیا حقیقت ہے، کیا توجیہہ ہے؟

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے — یا رخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے — آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

اگر یہاں ہمارا علم حقیقتوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تو کیا اس زمان و مکان سے آزاد عالم میں اس کی یہ محدودیت ختم ہو جائیگی اور ہم حقیقتوں کو براہ راست محسوس کر سکیں گے یا یہی جستجو اور استفہام ہماری تقدیر ہے؟

اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے — علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے
دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی — لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا — واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا

اقبال کے سلسلے میں یہ سوالات محض شاعرانہ تخیل آفرینی یا وقتی لطیف احساسات نہیں جن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کے پیچھے منطقی فکر ہے، مستقل دل کی کرید ہے، دماغ کی مسلسل الجھن ہے، تصوف اور فلسفے کی آویزش ہے، عقیدے اور استدلال کی کشمکش ہے اور مادیت اور روحانیت کا تصادم ہے۔ چنانچہ ان کے پورے کلام پر نظر ڈال جاؤ۔ ان کے عمر بھر کے فلسفے کا جائزہ لے لو وہ ان ہی سوالوں کے گرد گھومتے نظر آئیں گے۔ ان کی پختہ نگاہ اور فلسفیانہ نظر مذہبی حقائق اور صوفیانہ شعور کے سہارے خالص مادی ماحول میں ان ہی سوالوں کا جواب دیتی

ہوئی نظر آئے گی۔ ایک خاص میلان کے تحت ان کے آئندہ نظام فلسفہ کے لیے منتشر نقطے اور دھندلے خطوط ان سوالوں کی روشنی ہی میں تشکل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وسائل علم اور ذرائع معرفت کی تنقیح اور انتخاب شروع ہو جاتا ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ

خود اصل کائنات کا جہاں تک تعلق ہے ان کے شاعرانہ وجدان اور متصوفانہ شعور نے اس کی ہستی کے راز کو اسی زمانے میں ان پر بے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کائنات اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے مسلسل اور متواتر تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے؟ طبیعی اسباب و علل زیادہ سے زیادہ اتفاق اور مصاحبت تک پہنچاتے ہیں۔ ان کو دائمی مان لو لیکن یہ کیوں ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس کا جواب عقل کے پاس کہاں تھا۔ عقل مشاہدات و محسوسات سے تجرید و تعمیم کے ذریعہ کلیات کا استخراج کرلے لیکن وہ محسوسات تک ہی تو محدود ہوں گے۔ محسوسات سے ماورا اور ان کی پشت پر اگر کوئی اندرونی واقعیت ہے تو اس کی اصل حقیقت اور پھر اس حقیقت کے ذاتی لوازم اور بلاواسطہ اوصاف اگر کچھ ہوں تو وہ عقل و فکر کی گرفت میں کیسے آتے۔ عقل و فکر کا خام مواد وہ احساسات اور ارتسامات ہیں جنکو حواس معروض کی ظہوری حیثیت سے اخذ کرتے ہیں عقل اپنے اصول و ضوابط کے تحت انھیں مرتب و منظم کرتی ہے۔ لیکن کسی معین معروض کے عقلی تصور کے لیے صرف انھیں احساسات اور ارتسامات کی ترتیب و تنظیم کافی نہیں جو حواس نے کسی خاص وقت میں اس معین معروض کے کسی خاص رخ اور خاص مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہیں بلکہ دوسرے گزشتہ اوقات کے اور دوسرے رخوں اور دوسری مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہوئے احساسات اور ارتسامات سب اس خاص زمانی اور خاص مکانی ارتسام کے ساتھ شامل ہو کر عقل کا خام مواد ہیں جن کو عقل مرتب اور منظم کر کے کسی معین معروض کا تصور مکمل کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ کسی معروض کے عقلی تصور کے لیے کوئی خاص متعین زمانی اور مکانی ارتسام کافی نہیں بلکہ گزشتہ زمانی اور مکانی تجربات کے تحت معروض کو مجموعی طور سے جیسا ہونا چاہیے ویسا ہی اس کو ٹھیک ٹھیک لیا ہونا چاہیے[1] غرض یہ کہ عقل کا عمل ظواہر پر ہوتا ہے، اصل حقیقت جو ظواہر کی تہہ میں ہے، وہ اس کی گرفت سے باہر ہوتی ہے اس لیے عرفان حقیقت اس کے حدود کار سے بہت بلند ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود کے تحت فکر کرتی ہے جن کا اصل حقیقت پر اطلاق نہیں ہوتا محض اس اصول کے پیش نظر کہ ہر اثر کے لیے اثر آفریں اور معلول کے لیے علت درکار ہے، وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت کے دروازے تک پہنچ سکتی ہے لیکن خود حقیقت یا حقائق اپنی اندرونی حیثیت میں اس اصول کے تحت ہیں یا اس اصول کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا، اس پر عقل کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ وہ تو صرف ظواہر کا یا دوسرے لفظوں میں معروضات کا اپنے طریقوں اور اپنے شروط کے ساتھ جائزہ لے سکتی ہے مگر خود حقیقت کو اس کی واقعی نوعیت کو، اس کے حقیقی لوازم و اوصاف کو، ظواہر کے ساتھ اس کے تعلق کو اگر کچھ ہو تو، پھر اس تعلق کی نوعیت کو کسی طرح نہیں محسوس کر سکتی۔[1]

حقیقت کو دریافت کر لینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو براہ راست محسوس کیا جائے۔ جب حقیقت خود محسوس ہو جائے گی تو شاید کائنات سے متعلق "کیا ہے"، "کیوں ہے"، اس کے تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے، اور کب سے اور کہاں ہے، جیسے سوالات کا جواب خود بخود ہی واضح ہو جائے گا۔ لیکن کیا اس کو براہ راست محسوس کرنا ممکن بھی ہے۔ اقبال کا جواب غالباً صوفیانہ مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ہے کہ ممکن ہے بلکہ واقعہ ہے۔ اقبال دل کو براہ راست احساس حقیقت کا منصب دیتے ہیں۔ دل سے اقبال کی مراد غابۃً وہ مقدس الٰہی لطیفہ ہے جو انسانی ظواہر میں بحیثیت باطن ذات یا حقیقت انسانیہ کے پوشیدہ ہے اور یہی محل ہے تجلیات الٰہیہ کا دل کے براہ راست محسوس کرنے کی ہی دوسری تعبیر وجدان ہے۔ اقبال عقل کے ادراک اور دل کے مشاہدے کا فرق اور عقل کے حدود اور قیود اور

---

[1] عقل کے دائرہ عمل اور طریق کار کی تشریح میں کانٹ کے زاویۂ نظر کو پس منظر کے طور پر بالقصد سامنے رکھا گیا ہے مجھے ہڑگسانی انداز نظر کی تائید میں اقبال کے اس عہد کے کلام میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔

اس کے مقابلے میں دل کی آزادی کو بیان کرتے ہیں:

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہوں میں

شاید عقل کی اس "مظاہر وابستگی" اور "زمان و مکان سے رشتہ بپائی" کا انکشاف اور دل کی اس باطن بینی اور "سدرہ آشنائی" کا شعور ہی تمہید ہے اقبال کے "شمشیر ذوق جستجو" کے زخموں کے اندمال کی ابتدا کا اور "دیدہ وری" کے رستے میں گرم سیر ہونے کا۔

دل یا انسان کی باطنی ذات عقل کے واسطے کے بغیر اصل حقیقت کو خود بخود محسوس کرتی ہے تو اس کے

اقبال اور وحدت وجود

معنی یہ ہیں کہ واقعتاً ایک ہی حقیقت ہے جو انسان بھی ہے اور واقعیت بھی۔ کسی چیز کے براہ راست شعور کے لیے معروض شعور اور شاعر کو ایک ہونا چاہیے یا ایک دوسرے کا براہ راست وصف ہو یا دونوں کسی تیسری ذات کے براہ راست اوصاف ہوں۔ آخری دونوں صورتوں کا مآل بھی یہی ہے کہ محل اور موصوف یا ذات اور بطن ایک ہی حقیقت ہے جو حامل ہے متعدد اوصاف اور اعتبارات کی غرض یہ کہ دل کی باطن بینی اور انفس و آفاق کی وحدت لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اقبال نے اپنے اس ابتدائی دور میں جہاں دل کی باطن بینی اور معرفت پر زور دیا وہاں انفس اور آفاق کی اندرونی وحدت یا دوسرے لفظوں میں نظریۂ وحدت وجود کی بھی حمایت کی جو کسی نہ کسی حیثیت میں آخر تک ان کے فلسفے کا بنیادی عنصر رہا۔

۱۹۰۵ء تک کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے سامنے 'وحدت وجود' کا کوئی متعین اور مستند نظریہ اپنی تفصیلوں اور عقلی توجیہوں کے ساتھ نہ تھا۔ ان کا وحدت وجود کا تصور غالباً ان منتشر معلومات پر مبنی تھا جو مختلف ماخذوں اور متعدد مکاتیب سے ماخوذ تھے۔ اس میں نہ ناقدانہ انتخاب ہے نہ عالمانہ ترتیب و تعمیر۔ یہ بھی بعید نہیں کہ اردو، فارسی اور ہندی شعرا کے متفرق صوفیانہ کلام نے خاص طور سے اس باب میں ان کی رہنمائی کی ہو۔ بہر حال ان کے اس عہد کے تصور میں کسی فلسفیانہ گہرائی یا براہ راست صوفیانہ احساس کو بہت کم دخل ہے تاہم انھوں نے اپنی "امتیاز دیر و حرم میں پھنسی ہوئی" فکر کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور اپنے "سیمابی جوش اضطراب" کو ٹھنڈا کرنے کی ایک راہ نکالی ہے، یہ علم کی بے تابی کو تسکین دینے کے لیے ایک شاعرانہ تخیل ہے جس میں متعدد مکاتب خیال کے خاص خاص نقطے، ان کے عقلی نتائج کو سامنے رکھے بغیر شامل ہیں۔[1]

[1] یوں تو کثرت کی وحدت سے توجیہہ اشرقی مفکرین کا ہی امتیاز نہیں فلاسفۂ مغرب بھی۔ قدیم یونانیوں میں بھی وحدت وجود کے حامی رہے ہیں اور یورپ کے جدید حکما میں بھی متعدد اہل فکر کا یہی میلان رہا ہے۔ میں یہاں صرف شنکراچاریہ اور ابن عربی کے نظریوں کی تلخیص پر اکتفا کر رہا ہوں۔ آئندہ چل کر اقبال نے بھی انہیں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہی مشرق کے مشہور نظریے ہیں جو خواص ہی نہیں بلکہ عوام تک پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اور اقبال کے تصور میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی دونوں کا اثر ہے۔ شنکراچاریہ کے نزدیک واقعی حقیقت صرف برہما ہے۔ برہما اپنی ذات کے اعتبار سے ازلاً ابداً یکساں ہے۔ ہر قسم کی دوئی سے منزہ۔ صور اور اشکال سے ماورا، ہر قسم کے تعلق اور آمیزش سے بری، صرف ذات محض، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے برتر شعور محض، سکون خالص۔ کائنات اپنی تمام جزئیات اور پوری تفاصیل کے ساتھ برہما کی مظہری صورت ہے۔ اس ظہور کی علت اور اس کا محل اور ہیولیٰ بھی خود برہما ہی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی ہستی نہیں۔ عالم یا یہ مظہری کثرت عملی اور کاروباری واقعیت کے طور پر موجود ہے، ذہنی تخیلات اور خواب کے محسوسات سے بالکل مختلف اور جدا۔ برہما کی اس مظہری ہستی یا کثرت میں اور انسانی "انا" کی مظہری ہستی میں تلازم ہے۔ جب تک مظہری "انا" اپنی مظہری شخصیت کو قائم رکھے ہوئے ہے دیاتی ہوا

اس زمانے کی مشہور نظم "شمع" اور بعض دوسرے متفرق اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک حقیقت اور واقعیت صرف ایک ہے جس میں خالق اور مخلوق، علت اور معلول یا کائنات اور مکوّن کا فرق نہیں۔ یہ جیسی تھی ویسی ہے۔ ایک ہی تھی اور ایک ہی ہے یہ ظاہری کثرت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) نہ اس کثرت کا واقعی فرد ہے اور کثرت اس کے لیے واقعی حقیقت ہے۔ اس کی یہی مظہری واقعیت بنیاد ہے اس کے سماجی تعلقات کی اور اسی پر مدار ہے اس کے مذہبی فرائض و واجبات کا۔ اعمال اور ان کے اثرات کی واقعیت اسی مظہری ہستی سے مشروط ہے۔

لیکن یہ کثرت واقعتہً حقیقی نہیں۔ اس کی بنیاد محض بے علمی یا جہالت ہے۔ جوں ہی اصل حقیقت کا عرفان ہوا کہ "تو وہی ہے" اور "انا" حقیقتاً خود ہی برہما ہے تو یہ کثرت غایب ہوئی۔ اب نہ اعمال ہیں نہ ان کے اثرات، نہ تعلقات ہیں نہ متعلقین فقط برہما ہی برہما ہے؛ ایک اور یکساں، جب تک جہالت رہتی ہے اور حقیقت کا عرفان نہیں ہوتا "میں" "میں رہتا ہوں اور "تو" "تو۔ جہالت رفع ہوئی تو نہ تو تو ہے نہ میں میں؛ صرف برہما ہے، ہر قسم کی کثرت اور ہر طرح کے تعلقات سے مقدس، بے صورت، بے قید، حقیقت خالص اور شعور محض۔

یہ عدم عرفان یا جہالت شخصی تو ہے ہی لیکن چوں کہ پوری مظہری کائنات کی بنیاد ہے اس لیے عالمی یا کائناتی بھی ہے اور چونکہ پوری مظہری کائنات اصل حقیقت کے اعتبار سے برہما ہی برہما ہے اس لیے یہ جہالت یا عدم عرفان بھی برہما ہی ہے اور مظہری کائنات کی طرح خود بھی عملی اور کاروباری واقعیت ہے لیکن چوں کہ اصل عرفان کے ساتھ یہ فنا ہو جاتی ہے اس لیے بے حقیقت اور لاشئ محض ہے۔ حقیقت تو وہی ہے جو لازوال ہے۔ گویا کائنات یا کثرت نتیجہ ہے جہالت کا جو بے حقیقت اور بے بود ہے اور برہما کا جو حقیقت ہے اور ہست۔

ابن عربی کے نزدیک ذات یا حقیقت صرف ایک ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی حقیقت نہ کوئی وجود۔ ذاتی حیثیت میں یہ حقیقت مجہول الکنہ اور مبہم ہے، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے ماورا، خود ابہام اور اطلاق بھی اس کے لیے قید نہیں۔ تمام افعال اور اسماء و صفات سے بالاتر، ازلیت اور ابدیت سے بھی برتر۔ ہستی یا مصدری وجود بھی ایک تعین ہے اور اپنی اس حیثیت میں ذات تعینات سے بلند ہے۔ ناقابل تعبیر ہے، بے عنوان اور بے اسم، غیب محض، بغیر فعلیت و ظہور۔

یہ حقیقت متعدد تنزلات یا درجات کے لحاظ کے بعد سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تنزل ایک طرح کے تعین ہیں چنانچہ سب سے پہلا تعین وجود ہے دوسرے تمام اوصاف اور تعینات سے معرّا۔ یہ ذات کا وجود ہے اور صرف ذات کے لیے۔ ہر قسم کے علم و ادراک سے ماوراء۔ حقیقت کا یہ وجودی تعین منشا ہے اس کے علمی تنزل کا۔ موجودہ حقیقت جو اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور امکانات پر مشتمل ہے، علم ذات کا موضوع ہے۔ ذات کا یہ عرفان خود اپنے آپ کا عرفان ہے جو شامل ہے ذات کی متمیز اور متعین حیثیت کے علم کو اور اپنے تمام متمیز متعین امکانات اور صلاحیتوں اور قوتوں کے علم کو۔ ذات کا یہی علمی تعین مبدأ ہے اس کی علیت کا۔ بہرحال ذات کی یہ اندرونی صلاحیتیں ایک دوسرے لحاظ سے ظواہر عالم کی حقیقتیں ہیں جن میں ظواہر کے تمام امکانات شامل ہیں۔ یہ صلاحیتیں جو علم حق میں اپنے کیفی امتیاز کے ساتھ ازلاً ابداً ثابت ہیں "اعیان ثابتہ" کہلاتی ہیں۔ ذات حقہ اپنے امکانات کے علم کے ساتھ مبدأ ہے ان امکانات کے ظہور کا۔ ان امکانات کا ظہور جو ظہور ہے کائنات کا، ذات حقہ کا ظہوری تنزل ہے۔ یہ ظہور جس طرح تقاضا ہے ذات کا اسی طرح خود یہ امکانات یا اعیان ثابتہ بھی اپنے ظہور کے متقاضی ہیں۔ ذات کے تقاضائے ظہور کی منشا محبت یا عشق ہے اس حب ظہور کا پہلا مطلوب ظرف ظہور کا حصول ہے۔ یہ ظرف ظہور جس میں اشیاء اپنی مکانی یا درجاتی ترتیب سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں ظہور اشیاء سے پہلے محض ایک وہمی اور خیالی خلا ہے۔ عماء کہلاتا ہے۔ ذات کے ظہوری تنزل کے معنی ہیں اس کے امکانات کا جو دوسری حیثیت میں ظواہر عالم کے امکانات یا اعیان ثابتہ ہیں، ظاہر اور مشہود ہو جانا۔ یہ امکانات علم حق سے قطع نظر غیر متمیز استعداد ہے جو مادہ ہے عالمی کثرت کا، چنانچہ شیخ اس کو "ہباء" کا نام دیتے ہیں۔

ہباء استعداد اور امکان ہے ذات حقہ کا۔ اس کی حقیقت ذات حقہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس کی ہستی کے معنی ہیں ذات کا ہستی اس کے ظہور کا مفہوم صرف ذات کا ظہور ہے۔ ذات کے ظاہر ہونے کا مطلب اتنا ہی ہے کہ قوتیں فعلیتیں ہو جائیں۔ ذات کی کسی فعلیت کا نمودار ہونا ذات کا اس طرح موجود ہونا ہے کہ اسے ایک خاص انداز نمودار ہو۔ مثلاً زید کی کسی استعداد جیسے قیام کی سکت، قعود کی سکت یا لکھنے پڑھنے کی سکت کے عملی حقیقت بن جانے کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس کو کائنات یا عالم کہا جاتا ہے ہمارے اپنے شعور اور آگہی کا ساختہ ہے، حقیقت میں نہ "من" ہے نہ "تو" ہے نہ کوئی بلند ہے نہ پست، نہ کہیں مہک ہے نہ کہیں مستی ہے:

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار — خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے — گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی — اصل کشاکش "من" و "تو" ہے یہ آگہی

اگر یہ شعور و آگہی فنا ہو جائے تو یہ تمام تعینات ختم ہو جائیں اور وہی ازلی اور ابدی حقیقت رہ جائے جس میں من و تو کا کوئی فرق نہیں:

آزاد دست برد بقا و فنا ہوں میں — کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

یہ مجہول الکنہ حقیقت جو وحدت صرف ہے بے چندگی اور اطلاق محض ہے بے تعین، عرفان ذات کی خواہاں اور نمود کی متقاضی ہے۔ ذات کا یہ تقاضائے نمود، حقیقت کی یہ خواہش عرفان علت ہے کثرت کی اور سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تقاضائے نمود یا عشق نظارگی دعوت بے حجابی ہوتی ہے۔ اور تعینات اور امتیازات نمایاں ہو جاتے ہیں؛ وحدت کثرت نظر آنے لگتی ہے اور دعوت بے حجابی کو مہمیز کرتی ہے:

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق — آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

اب خواہش دید پیدا ہو گئی، چشم شعور وا ہونے لگی:

یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ — ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

ذات کا مرتبۂ اطلاق و ابہام وجود سے برتر اور شعور و آگہی سے ماورا ہے۔ ہستی ہی صید شعور و آگہی ہے۔ ہستی وہ کائنات کی ہو یا حقیقت مطلقہ کی بنیاد ہے تعین و امتیاز کی، اساس ہے تعلق اور وابستگی کی قید کی۔ ہستی سے جہاں ذات متعین اور متمیز ہوتی ہے۔ وہیں اشیاء یا کثرت اور کائنات باہم دگر بھی اور خود اصل حقیقت سے بھی متمیز ہو جاتی ہے اور متعین وحدتیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں؛ من و تو میں فرق ہو جاتا ہے بلندی اور پستی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، گل میں مہک اور شراب میں مستی صاف محسوس ہونے لگتی ہے۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ حسن و عشق کے الگ الگ موضوع دکھنے لگتے ہیں؛ ہستی کا یہ پردہ سب کو جدا جدا کر دیتا ہے۔ الگ الگ قیدی اور الگ الگ قفس۔ حقیقت سے دور ہر ایک اپنے اپنے غمکدے میں غربت کے دن گزارتا رہتا ہے:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی — شام فراق، صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا — زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں — غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) معنی یہی ہیں کہ زید ایک ایسے انداز اور ایسی وضع میں موجود ہے کہ دیکھنے والا اس کو کھڑا، بیٹھا یا لکھتا ہوا، پڑھتا ہوا محسوس کرے۔ کھڑے ہونے بیٹھے ہونے، یا لکھنے پڑھنے کی نہ تو کوئی الگ ہستی ہے اور نہ ان کی کوئی الگ حقیقت ہے۔ چنانچہ یہ ہبا، یا استعداد محض فعلیاً اختیار کرتی ہے اور ذات حق کی شہودی تجلی کا محل بن جاتی ہے تو کائنات یا کثرت نمایاں ہو جاتی ہے۔ گویا کائنات ذات باری کا اپنا ایک خاص انداز وجود ہے اور بس۔ شیخ کے نزدیک کائنات اپنی نوعی حیثیت میں قدیم ہے۔ ذات حق ازلاً اور ابداً موجود ہے اور اس کی موجودگی کے لیے کوئی نہ کوئی انداز وجود ضروری ہے۔ اس کا یہ انداز وجود اس کے کسی نہ کسی امکان کا ظہور ہے اور ہر امکان کا ظہور کسی نہ کسی فعلیت کی نمود ہے۔ یہی فعلیت کوئی نہ کوئی شے ہے۔ اور یہ سلسلہ ازل سے ابد تک برابر جاری ہے۔

ابن عربی کے نزدیک اگرچہ کائنات کی اپنی الگ کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا کوئی اپنا الگ وجود ہے تاہم وہ حقیقی اور واقعی ہے نہ کوئی دھوکہ ہے نہ کوئی التباس اور فریب۔ ذات باری سے بھی ممتاز اور اس کی کثرت باہم بھی ممتاز، ایک دوسرے سے الگ، ہر شے خود ہی شے ہے نہ کہ دوسری۔

ہستی کا سراپا جستجو ہونا، راز حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا حقیقت سے اسی غیر شعوری تعلق کے غماز ہیں:

یادِ وطن فسردگیٔ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

من و تو کا یہ فرق، گل و بلبل کا یہ امتیاز، شمع و پروانہ کی یہ تشخیص، گلشن کن کی یہ بہار کیا یہ سچ مچ واقعی ہے؟ کیا حسن و عشق حقیقتاً الگ الگ ہیں؟ عالم کی یہ کثرت کیا حقیقی کثرت ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے جس کو شعور و آگہی کی غفلت آفرینی نے اپنے اظہار کے لیے گھڑ لیا ہے:

چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہور جلوۂ ذوق شعور ہے

ورنہ صرف ایک ہی مقدس اور متعالی حقیقت ہے، ان سب فریبوں سے ماورا، یہاں تو "محمود" ہے اور بس "ایازی" جہالت کا اختراع ہے:

محمود، اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے
کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے

شعورِ غفلت آفریں اور آگہی غلط نگر کا یہ کائناتی سلسلہ، زمان بردوش اور امکان در آغوش حقیقت کے گلے کا طوق بن گیا اور حقیقت مطلقہ صید و صیاد میں اور حلقۂ دام و بام حرم میں جدا جدا محصور ہو گئی ورنہ واقع میں نہ کوئی پہلے ہے نہ بعد، نہ یہاں ہے نہ وہاں، صرف ایک حقیقت ہے جس کو چاہو ناز کہہ دو چاہو نیاز نام رکھ دو؛ ناز نیاز ہے اور نیاز ناز، ظاہر باطن ہے اور باطن ظاہر:

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں

صیاد آپ حلقۂ دام ستم بھی آپ
بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں:

اس شعور و آگہی کا سبب، جس کی غلط نگاہی سے حقیقت جدا جدا تعینوں اور امتیازوں میں مقید ہو جاتی ہے خود ہستی ہے اس لیے حقیقت کے بے قید وحدت اور بے تعین اطلاق کے لیے اس ہستی کا فنا ہونا ضروری ہے:

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

گویا شخصیت کا نصب العین اور انا کا مطمح نظر خودی کو فنا کرنا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنا:

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ
اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

اقبال کے اس شاعرانہ "وحدت وجود" کا غالباً حاصل یہ ہے کہ صرف ایک ہی حقیقت ہے بے قید، بے امتیاز! اس کی اندرونی ذات اپنی خواہش عرفان کے تحت ظہور کی متقاضی ہے۔ یہ مظہری وجود یا کثرت اسی تقاضے کا جواب ہے۔ وہ شعور خالص جو خود ذات ہے اور ذات کا ہے اور صرف ذات کے لیے ہے۔ مظہری صورت میں وحدت کو جدا جدا اور زمانی، مکانی تعینوں میں دیکھنے لگتا ہے لیکن جس طرح حقیقت کا یہ رخ محض مظہری ہے اندرونی اور باطنی واقعیت نہیں، اسی طرح شعور کی یہ گرفت بھی اندرونی اور باطنی حقیقت کی گرفت نہیں، یہ مظہری ہستی باطل یا نظر انداز ہوئی اور اصل حقیقت سامنے آئی تو پھر وحدت ہی وحدت رہ جاتی ہے؛ بے امتیاز اور بے تعین۔ خود شعور کا بھی یہ غیر واقعی انداز ختم ہو جاتا ہے۔ اب حقیقت ہی حقیقت محسوس ہوتی ہے 'تو' فنا ہو جاتا ہے اور 'میں' ہی 'میں' رہ جاتا ہے۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

زندگی سے فرار کی خواہش اور وحدت وجود

اس زمانے کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعرانہ وحدت وجود کا اقبال کی فکر پر خاص اثر نہ تھا؛ نہ وہ زندگی کی کشمکش سے بھاگنا چاہتے تھے نہ ان کے

یہاں معاشرتی تعلقات سے گریز کی تلقین ہے نہ وہ ظواہر سے بچ کر گزرنا چاہتے ہیں نہ باطن ہی باطن کی تلقین کرتے ہیں نہ ان کے کلام سے کسی ہمہ گیر انفعالی دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔" ایک آرزو" میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی سے فرار، عزلت گزینی کی غیر معمولی خواہش، مظاہر قدرت سے انفعالی دلچسپی نمایاں ہے:

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں — دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو

لیکن اس کے لہجے میں سنجیدگی اور طمانیت نہیں، آرزو میں خلوص اور طلب میں سچی تڑپ نہیں ہے بلکہ جھنجلاہٹ ہے مایوسی کا وقتی ردعمل ہے، ناکامی کا غصہ ہے۔ اہل وطن کی بے حسی کا ماتم ہے۔ چنانچہ اسی نظم کے دوسرے بند کے اشعار ہیں:

شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن — ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر — میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت — ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

اہلِ وطن کا یہی اختلاف اور افتراق تھا جس سے فلسفی اقبال کا نہیں بلکہ شاعر اقبال کا دل بجھ گیا اور وہ نت نئے ہنگاموں سے اکتا اٹھا:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اور اس کو مذہب سے تعلق کے باوجود ملا اور پنڈت دونوں سے دلچسپی نہیں رہی:

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن — میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو

لیکن اس پر بھی ان کے دل کی تمنا یہی ہے کہ:

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے — بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اقبال کا میلان طبع

اس ابتدائی دور میں اقبال کے مخصوص فلسفے کی تلاش تو عبث ہے لیکن بلند نظری، عالی حوصلگی اور احساسِ ذات کی مثالیں ان کے کلام سے انتخاب کر لینی مشکل نہیں۔ ان کی طبیعت کی یہی افتاد تھی جس سے ان کے آئندہ فلسفے نے ایک خاص میلان حاصل کیا:

ہم صفیر و تم مری عالی نگاہی دیکھنا — شاخ نخل طور تاڑی آشیانے کے لیے

ایک دانے پہ ہے نظر تیری — اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

ساتھ ساتھ شاعرانہ واردات کی ہی صورت میں سہی لیکن اس زمانے میں بھی ان کے یہاں ایسے خیالات ملتے ہیں جو آگے چل کر فکری شکل میں ان کے مابعد الطبیعاتی اور اخلاقی نظام کے عناصر بنے۔

انسان کی اہمیت

اقبال نے گوناگوں طریقوں اور مختلف اسلوبوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان قدرت کا شہکار

اور کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے:

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

کائنات کی آرائش و پیرائش اسی کے دم سے ہے۔ کائنات کی تعمیر میں جو خرابیاں مضمر ہیں، جو ناآہنگیاں اور فساد و فتنہ اس میں چھپے ہوئے ہیں ان کو دور کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اسی کا منصب ہے۔ "انسان اور بزمِ قدرت" میں قدرت کی زبان سے اس کے منصب اور ذمہ داریوں کا دوسرے مظاہر سے مقابلہ کیا گیا ہے:

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود باغباں! ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود
انجمن حسن کی ہے تو تری تصویر ہوں میں عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں
میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے

انسان کی اس عظمت کا اصل راز اس کا شعور اور آگہی ہے "چاند" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

محض شعور ہی نہیں بلکہ شعورِ ذات اور یا احساسِ نفس اپنی اہمیت کا پورا پورا وقوف خاص عنصر ہے انسانی فضیلت کا "آفتابِ صبح" سے خطاب ہے:

اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں

آرزو

حیاتِ انسانی کی کائناتی اہمیت اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں پوشیدہ ہے۔ آرزو ہی ہے جو اس کو خوب سے خوب تر تک لے جاتی ہے اندر فساد میں صلاح کا خواب دکھاتی ہے، ناآہنگیوں میں آہنگ کا خیال آتا ہے۔ مظاہر سے اسباب و علل کی طرف نظریں اٹھتی ہیں:

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

"گلِ رنگیں" سے مخاطب ہیں:

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

عمل

اقبال محض آرزوؤں اور تمناؤں میں کھیلتے رہنے کو انسانیت کا جوہر نہیں سمجھتے۔ اصل مقصد ان آرزوؤں اور تمناؤں کو عملی حقیقت بنانا ہے فرزندِ آدم کا حقیقی امتیاز یہ ہے کہ وہ اسباب و علل کو سمجھے اور خوب سے خوب تر کو پیدا کرے، فساد کی بنیادوں کا پتہ چلائے اور اصلاح کے میدان ہموار کرے، اس کے لیے "زیبِ محفل ہونا" کافی نہیں "شریکِ شورشِ محفل ہونا" ضروری ہے۔ ہنگامۂ عالم کا دور سے تماشا کرنا فضول ہے۔ بلکہ اس کے صدموں کو برداشت کرنا ناگزیر ہے:

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں

"سید کی لوحِ تربت" پر وہ یہ وصیت پڑھتے ہیں کہ "ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں"۔ "تصویرِ درد" میں اہلِ وطن کو سبق دیتے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

عمل کے لیے بے خوفی دلیری اور خلوص ضروری ہے، اس کو وہ مومن کی خصوصیت سمجھتے ہیں:

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

شخصی بقاء

سلسلۂ ارتقاء کا یہ آخری حلقہ! انسان جس کی حیاتیاتی قدر و قیمت اسی کی حد تک محدود نہیں بلکہ خود کائنات کی اصلاح و ارتقاء کے لیے بھی اس کے وجود کی اہمیت ہے! اقبال کے لیے اسی وقت سے دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کی شخصی

حقیقت کے تعینات ہیں، اگر ان تعینات کے بطن کو محسوس کر لیا جائے تو صرف ایک ہی حقیقت ہے جو موجود ہے باقی سب معدوم۔

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو　　کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن اب وہ اس کثرت کو غالباً محض آگہی کا زائیدہ نہیں خیال کرتے اور نہ اصل ہستی کو پردہ مان کر اس کو اٹھا دینے کی فکر میں رہتے ہیں وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس کثرت کے بطن میں جو وحدت پنہاں ہے اس کو نظر انداز نہ کیا جائے اور حسن ازلی کا سب کو مظہر جان کر سب سے عملی دلچسپی لی جائے اور چیزوں میں امتیاز و غیریت کی ناقابل شکست دیواریں نہ حائل کر لی جائیں؛ زاویۂ نظر کو بدلا ہوا نہ ہونا چاہیے۔ ایک ہی حقیقت کے یہ سب مختلف مظاہر ہیں اور ہر مظہر اپنا ایک مقام رکھتا ہے:

Pantheism

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ　　چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

ان مظاہر کے عقب میں صرف ایک ہی وجود ہے جو قائم و دائم ہے اور وہی ان مظاہر کا وجود ہے، اس وجود کے علاوہ مظاہر کا کوئی الگ وجود نہیں:

نفی ہستی ایک کرشمہ ہے دل آگاہ کا　　لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

مظاہر تو اس وجود برتر کے فقط اطوار و اعتبار ہیں، یہ محض بحر وجود کی موجیں ہیں اور حقیقت کی اپنی ترنگیں ہیں:

چشم نابینا سے مخفی معنی انجام ہے　　تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اصل حقیقت کا عشق اور اس سے تعلق کا شدید احساس ان اطوار وجود اور اعتبارات حقیقت کو باطل کر دیتا ہے تاہم یہ ایک حال ہے، یہ عشق کی سرمستی ہے جو اس بت اعتبار کو توڑ دیتی ہے:

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق　　ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

وحدت وجود کا یہ تصور اب محض شاعرانہ نہیں، ہاں یہ بلکہ ابن عربی کے مستند نظریے سے کچھ زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ تعینات کے واقعی ہونے میں اور باہم امتیازات کے حقیقی ہونے میں ان کا کلام واضح اور قطعی نہیں ہے۔ تاہم اس کی تشریح ابن عربی کے مذاق پر بھی کی جا سکتی ہے[1]۔

تقاضائے نمود

ظہور کا تقاضا یا نمود کی خواہش جو پہلے صرف ذات حق تک محدود تھی اب پوری کائنات پر چھا گئی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اور عالم کی ہر وحدت ظہور کا تقاضا رکھتی ہے، ہر شے میں نمود کی خواہش ہے، دریائے ہستی کا ہر قطرہ ہستی کی لذت سے آشنا ہے:

لذت گیر وجود ہر شے　　سرمست مے نمود ہر شے

وجود سے یہ لذت گیری اور نمود کی یہ اندرونی خواہش مابعد الطبیعیاتی بنیاد ہے اقبال کی دعوت حرکت و عمل کی اور خاص عنصر ہے ان کے آئندہ فلسفے کا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہستی کی نفی ہی حقیقت ہے، حقیقی کمال فنا ہے اور فطرت کا مطالبہ سکون محض ہے تو پھر حرکت و عمل جو اظہار ہے ہستی کا اور خروش ہے بحر وجود کا، حقیقت سے بغاوت ہے اور مقابلہ ہے فطرت کا۔

تغیر اور نمود

اقبال کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور سے ان کی آئندہ فکر کا جو مسالہ خیالات کی صورت میں برابر جمع ہوتا جا رہا تھا اس میں شاید خالص شاعرانہ توجیہہ کے ضمن میں "تغیر" کا اضافہ اسی زمانے میں ہوا ہے۔

---

[1] خاص طور سے اقبال کا مندرجہ ذیل شعر تو بہت واضح ہے کہ وہ تعینات کو فریب نظر ہی سمجھتے تھے لیکن چونکہ غزل کا شعر ہے اس لیے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور تاویل بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر ان کا حقیقتاً یہی نقطۂ نظر ہے تو عمل سے اس کا پیوند بہت دشوار ہوگا۔

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا　　یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

"حقیقتِ حسن" میں حسن خدا سے شکایت کرتا ہے کہ "جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟" اس شکایت کا جواب دیا گیا ہے کہ:

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

نمود کے لیے یا دوسرے لفظوں میں وجود کے لیے تغیر لازم ہے۔ جو شے حرکت نہیں کر رہی ہے تو اس کی فعلیتوں کا بھی اظہار نہیں ہو رہا ہے اور ایسی حالت میں اس کے ظہور اور نمود کے کوئی معنی نہیں۔ کامل سکون اور مطلق جمود ہستی نہیں محض عقلی تجرید ہے۔ نمود یا وجود برابر بدلتے رہنے یا محض امکانات کے فعلیتوں میں ظاہر ہونے کا نام ہے اس لیے کسی ہستی کے لازوال ہونے کا مفہوم اس کی نیستی یا مکمل خفا ہے۔ مسلسل بدلتے رہنے کا ہی نام شے ہے۔ ایک فعلیت دوسری فعلیت کو جنم دیتی جا رہی ہے اور دوسری تیسری کو، فقط ثبات تغیر کو ہے زمانے میں!

وطنیت کے بجائے ملّیت

وطن کے خالص جذباتی ماحول سے علیحدگی، مختلف اسلامی ممالک کے باشندوں سے تعلقات اور ان سے یگانگی کا احساس "ایرانی مابعد الطبیعیات" کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف عہدوں اور مختلف وطنوں کی شخصیتوں عمومی وحدتِ خیال، جذبۂ وطنیت کے مظاہر اور اس کے دور رس نتائج کا شعور، مسلم لیگ کا قیام اور انگلستان میں مقیم ہندوستانیوں کی اس سے دلچسپی اور تحریک وحدتِ اسلامی ان سب کے ملے جلے اثرات نے غالباً اقبال کو ملت کی انفرادیت اور اس کی غیر منقطع وحدت سے آشنا کیا اور ان کے جذبات میں کھلا انقلاب آ گیا۔ اگر "اضرب العبیر" کی صورت میں وطنیت سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب وہ ملتِ اسلامی کو سماجی وحدت کے ساتھ ساتھ ایک مستقل سیاسی وحدت بھی سمجھنے لگے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو انھوں نے وطنی اور قومی تقاضوں اور ضرورتوں سے جدا محسوس کرنا شروع کر دیا۔

اقبال کے تصورات میں یہ انقلاب نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل تھا، یہ ایک بڑی موڑ تھی جس نے ان کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اگر وہ ملت کی انفرادیت اور وحدت کو مطمحِ نظر نہ بناتے تو شاید ان کی فکر کوئی مستقل رخ نہ اختیار کرتی اور وہ دنیا کو ایک نیا خیال نہ دے سکتے۔ خود ان کی شاعری بھی وہ اچھوتا انداز نہ حاصل کر پاتی جس نے ان کو شعراء کی صف میں مستقل اور قابلِ رشک انفرادیت کا حامل بنا دیا اور شاید ان کی شخصیت بھی اتنی پرکشش اور محبوب نہ رہتی، نہ ملکی حیثیت میں اور نہ بین الاسلامی بلکہ اب تو بین الاقوامی حیثیت میں بھی۔

وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا بنانے والا اقبال اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم قومیت خود مستقل وحدت ہے جو کسی وطنیت اور کسی قومیت میں محدود نہیں۔ یہ ایک نیا سماجی مظہر ہے جس کے تحفظ کے طریقے بھی نئے ہیں:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کیوں کہ اس نئے سماجی مظہر کا کوئی اپنا وطن ہی نہیں ہے دنیا تو دنیا اور مذاہب کے برخلاف اس کا نصب العین عقبیٰ بھی نہیں ہے:

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اس انوکھی قومیت کی بنیاد وہ اصولِ حیات ہیں جن کا شعار اور علامت حرم کی صورت میں پوری قوم کے لیے جاذب ہے:

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

محدود وطنیت اور ملکی قومیت افتراق کے بت ہیں جن سے ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اپنے دامن کو ان بتوں سے بچائے جانے کی یہی تدبیر ہے کہ ملی وحدت کے شعار میں جذب ہو جائیں:

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

عبدالقادر کے نام پیغام میں اسلامی قومیت کے اصول کو جو اس غوغائے وطنیت میں نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں، ان کا حسن و جمال دکھا کر ملت میں ان کے لیے نئی تڑپ پیدا کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں:

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اور یہ غلط خیال جو ملت کے دل میں جما دیا گیا ہے کہ ملی تصورات مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہیں اس کی عملی تردید کا سامان بہم پہنچائیں:

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بت کدۂ چین سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

فرد اور ملت

اقبال کے فلسفے میں اگرچہ خودی کے اسرار کا انکشاف مقدم ہے تاہم بےخودی کے رموز کی جھلک ابھی سے نظر آنے لگی ہے۔ جبکہ خودی ابھی ان کے دھندلے شخصی میلان سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس زمانے میں ملت سے ان کا غیر معمولی شغف کچھ جرمنی کا فلسفیانہ ماحول، غالباً ان کا ہی اثر تھا کہ اقبال نے فرد کی مستقل حدت سے صرف نظر کرلی اور فرد پر اسی اسلامی ملت کے جزو کی حیثیت سے نظر ڈالی جس کی انوکھی ساخت وطنیت اور قومیت کے بجائے اصول پر ہے۔

چنانچہ فرد کے انفرادیت سے متمتع ہونے کے معنی ملت کے جزو ہونے کی حیثیت سے ملت کے ضمن میں متمتع ہونے کے ہیں اس کی اپنی الگ کوئی ہستی ہی نہیں، اس کی ہستی تو ملت کے ایک ترکیبی جزو کی ہستی ہے اس لیے اس کا پورا اور صحیح تحقق ملت کی ہستی کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے اپنے مفاد کے معنی ہی ملت کا اجتماعی مفاد ہے اور سب افراد کی ہستی کو محض ان کی اپنی ہستی کہنا مجاز اور تسامح ہے:

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن مجاز ہو جا

اقبال کی وطن کو واپسی اور انکا فکری نشوونما

اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے، لندن سے بیرسٹر اور میونک یونیورسٹی، جرمنی سے ڈاکٹر ہو کر ہندوستان واپس آگئے اور اس طرح ان کی رسمی طالب علمی کا دور ختم ہو گیا۔ ان کی فکری نشوونما کا جہاں تک تعلق ہے تو گویا تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کے نظام فکر کے بہت سے اجزاء کے نقوش کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ نقوش کچھ تو گہرے تھے اور کچھ اُتھلے اور بعض کی حیثیت رخ اور میلان سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بعد کے زمانے میں ان میں ترمیم و تنسیخ ہوئی اور اضافہ بھی یہاں تک کہ "اسلامی الٰہیات کی تعمیرِ نو" میں ان کی فکر نے ایک منظم اور مربوط فلسفے کی صورت اختیار کرلی۔

(باقی)

روح افزا — گرمیوں کا لیک تغذیہ بخش، مزے دار ٹانک، جو ہر عمر کے اشخاص کے لیے مفید اور پسندیدہ ہے۔ اس میں جڑی بوٹیوں، ہری ترکاریوں اور پھولوں کا اکسٹریکٹ اور دس فی صد سنترہ اور اننّاس کا رس شامل ہے

ہمدرد

دہلی، کانپور، پٹنہ

روح افزا

اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر محمود الٰہی

حیدر آباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذۂ علم و فن کی خدمات حاصل تھیں ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سر فہرست ہے۔ قاضی صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے اور بھروچ میں پیوند خاک ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی نہج پر ہوئی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس تعلیم سے وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے جس میں ملک و قوم کی فلاح مضمر ہے اس لیے انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے کی سند حاصل کی۔

قاضی صاحب نہ تو مغربیت کے دلدادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندھے مقلد۔ وہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا۔ بعض امور میں شبلی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات میں شبلی کے خوشہ چیں تھے اور غالباً اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبلی کے خطوط میں قاضی صاحب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے جس سے ان کے ابتدائی رجحانات اور مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ لسان العصر ریاض رضواں اور مرآۃ المثنوی کا شمار قاضی صاحب کے ادبیات میں ہوگا۔ مثنوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مرآۃ المثنوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق تھا، اس کا علم اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مرآۃ المثنوی کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کی تھی۔ قاضی صاحب کے خطوط کی نقل تو موجود نہیں لیکن علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیز محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ میں حامد علی صاحب کا شکر گزار ہوں نہ صرف یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے یہ خطوط مجھے دیے بلکہ اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع دیا:

لاہور ۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء

جناب من تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں گو پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے۔

مجھے پہلے سے اندیشہ تھا کہ کتاب کی فروخت میں آپ کو زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی مفقود ہے۔

بہاول پور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتے تاہم قدر داں ضرور ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب عمدہ جلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں، میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو۔ افسوس کہ ان کے گرد و پیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے عنقریب کوئی خوشگوار تبدیلی ان کے مصاحبین میں ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو۔

اس کے علاوہ آپ سر سید راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہل علم کے قدر داں ہیں۔ ان کی خدمت میں کتاب عمدہ جلد کرا کر بھیجیے۔ سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی منسٹر بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے۔

والسلام
محمد اقبال لاہور

(۲)

جناب من السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ ابھی اپنی کتاب نواب صاحب کی خدمت میں ارسال نہ کیجیے۔ آٹھ دس روز تک حج بیت اللہ کو جانے والے ہیں ان کی واپسی تک انتظار کیجیے جو جلد ہوگی۔ یورپ جانے کا قصد نہیں ہے۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۰ر جنوری ۱۹۳۵ء

(۳)

بھوپال ۸ر مارچ ۱۹۳۶ء

جناب قاضی صاحب السلام علیکم

میں ابھی تک علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں برقی علاج کے لیے مقیم ہوں۔

اس وقت بھاول پور کی ریاست ہندو مسلم مناقشات میں الجھی ہوئی ہے۔ موقع موزوں نہیں تاہم اگر آپ مراۃ المثنوی وہاں بھیجنا چاہیں تو عرضداشت کرنل مقبول حسین صاحب قریشی ہوم ممبر ریاست کے نام بھیجیے۔ میں نے ان کے نام ایک خط لکھ دیا ہے جو اسی لفافے میں بند ہے۔ خط بھی عرضداشت کے ہمراہ بھیج دیجیے۔

والسلام

محمد اقبال

(۴)

جناب من

آپ کا لفافہ ابھی ملا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے میری صحت عام تو اچھی ہے مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کوئی مقالہ حضرت رومیؒ پر نہیں لکھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۲۷ر جولائی ۱۹۳۶ء

جی ہاں
آگ میں پھول بھی کھل سکتے ہیں!

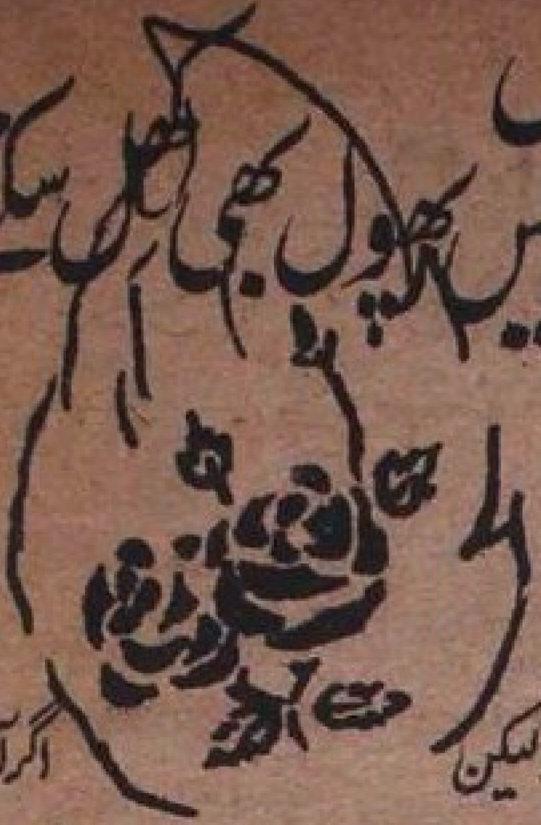

خدا نہ کرے لیکن اگر آپ کے جسم کا کوئی حصہ جل جائے۔ یا چوٹ آجائے یا خراش پڑ جائے تو جلن اور سوزش کی یہی کیفیت جیسے آگ ہو اس موقع پر فوری

جلمار کا استعمال کیجیے

جو آپ کی اس آگ میں پھول کھلا دے گی

FOR BURNS SCALDS & ABRASIONS USE JALMAR a CIPLA product

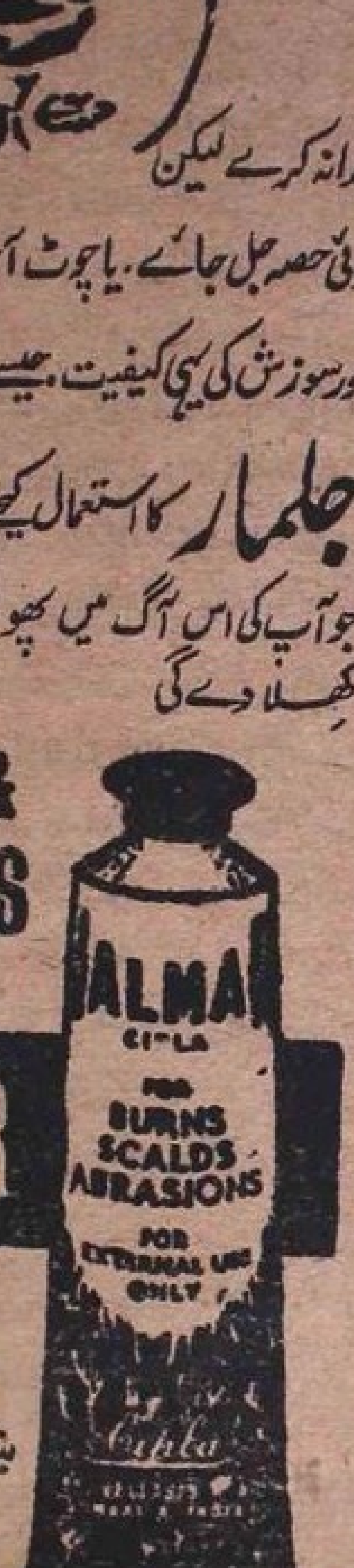

بنانیوالے:

سپلا لیبارٹریز بمبئی ۸

علامہ اقبال بحیثیت استاد

صالحہ الکبریٰ عرشی

" یوں تو علامہ اقبال کے کلام کی تفسیر و توضیح اور اس کی ترویج و اشاعت کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں مضامین کی بھرمار ہے اور ان موضوعات پر مستقل کتابوں کا بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی حیات کے شب و روز سے ——— جو رنگ و نور سے روشن و تابندہ ہیں۔ لوگ بے پروا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چند ہی سال ایسے ہیں جن میں وہ ہستیاں ہمارے درمیان موجود ہیں جنھیں علامہ اقبال سے شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ ابھی ایسی آنکھیں باقی ہیں جنھوں نے اس عظیم شاعر کو دیکھا ہے اور ابھی وہ لب و گوش قوت سماعت اور طاقت گویائی رکھتے ہیں جنھوں نے اس محبوب اور محترم شخصیت سے گفت و شنید کا لطف اٹھایا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تمام بزرگوں سے پرزور درخواست کی جائے کہ وہ علامہ اقبال کی حیات کی ایسی بے شمار کڑیوں کو ملانے میں مدد دیں جو ان کی زنجیر ایام سے غائب ہیں۔ یہ لوگ نہ رہیں گے تو پھر ہمارے سارے ذرائع کمزور اور سارے وسیلے ایک حد تک یقین کی اس بلندی سے نیچے اتر آئیں گے جن پر وہ آج ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال پر کام کرنے والے افراد اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اداروں پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زیر بحث کام میں عملی دل چسپی لیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کو خصوصیت سے گفتنی اور ناگفتنی کی رسمی اور مذموم قید کو توڑ کر لکھنا چاہیے اور درج گزشتہ ہر وہ بات ہونا چاہیے جو اس شخصیت کو یا اس کے کارناموں کو سمجھنے میں کسی نہج سے بھی کارآمد اور مفید ہو سکتی ہو۔ اس موقع پر حضرت یزداں میں چپ نہ رہنے والے بندۂ گستاخ کی مثال جرأت پیدا کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہوگی چاہے وہ خود اسی زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے والے سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں تو ہم سب کو چاہیے کہ ان اصحاب کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اگر یہ حضرات لکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے باقاعدہ ملاقاتیں کی جائیں اور سوالات کے ذریعے وہ سب کچھ معلوم کرنے کی سعی کی جائے جس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان کے سینوں میں ایک راز کی صورت ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

اسی جذبے کے تحت ایک بے حد دل چسپ اور بیش قیمت تاثراتی تحریر علامہ اقبال کے ایک شاگرد اور میرے والد (امتیاز علی عرشی صاحب) کے ایک عزیز اور قریبی دوست میاں عطاء الرحمٰن کی پیش کی جاتی ہے جو لاہور کے مشہور صاحب علم و ثروت خانوادے (میاں سر محمد شفیع باغبان پورہ) کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے علامہ اقبال کو اس عالم میں دیکھا جس میں کم لوگوں نے دیکھا ہوگا

میاں صاحب کی یہ تحریر رام پور رضا انٹر کالج کی طرف سے منعقد کیے گئے یوم اقبال کی ایک نشست منعقدہ سنہ ۱۹۴۵ء) میں پڑھی گئی تھی جس کی صدارت مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کی تھی۔ اس جلسے کی دوسری اور تیسری نشست جس میں کلام اقبال سے متعلقہ تفسیری تصاویر کی نمائش بھی شامل تھی رشید احمد صدیقی اور غلام السیدین کے زیر صدارت ہوئی تھیں۔ یہ تصاویر رام پور کے دو مصوروں عظمت اللہ خاں اور اودیاما کی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔

میاں صاحب مرحوم کے اس مضمون کی نقل میرے پاس محفوظ تھی جس کے عنوان میں علامہ اقبال اور چچا عطاء الرحمٰن۔

دونوں سے عقیدت اور محبت کو دخل رہا ہے۔ امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تحریر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علامہ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کچھ اور پرکشش ہوگی۔

مضمون نگار (میاں عطاء الرحمٰن مرحوم) کے بارے میں بھی یہ عرض کردوں کہ وہ سالہاسال رام پور میں مقیم رہے اور ریاست کے محکمہ فنانس کے علاوہ بھی بہت سے شعبوں کے منتظم رہے اور آخر میں ہز ہائی نس کے پرائیویٹ سکریٹری بھی۔ وہ بڑے خوش مزاج زندہ دل اور پرخلوص آدمی تھے۔ انھیں ادب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ دخل بھی تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ لاہور سے شایع بھی ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے وہ واپس لاہور چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔

مضمون اور مضمون نگار کے تعارف کی رسم کے بعد مجھے رخصت کی اجازت دیجیے اور اصل تحریر ملاحظہ فرمائیے۔

٭

مجھے کالج چھوڑے ہوئے آج تیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ گو ایسا اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے۔ لیکن جب بھی مجھے کسی ایسے مجمع میں شمولیت کا موقع ملتا ہے جیسا آج ہے تو شاید گردونواح کی فضا کے اثر سے میرے جسم میں خون ایک نئی طرح سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور میں اپنے دماغ میں اس قسم کے محسوسات گردش کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ جب آتش جواں تھا۔

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بے شمار چیزیں شایع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن ان کے کسی شاگرد نے بحیثیت شاگرد کے اپنے محسوسات بیان نہیں کیے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مہینوں مسلسل ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے انگریزی کی وہ نظمیں پڑھیں جو اس زبان میں اپنی نوع کی بہترین تخلیقات خیال کی جاتی ہیں۔ اور اس مطالعہ میں وہ لطف حاصل کیا ہے جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی زبان سے مغرب کے سب سے بڑے شعراء کا کلام پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال کی یاد میں غالباً ان موقعوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب پہلے پہلے میں نے انھیں دیکھا۔ میاں شاہنواز بیرسٹرایٹ لا مرحوم سے ہمیشہ ان کے خاص تعلقات رہے۔ ان دونوں کی آپس میں بے انتہا بے تکلفی تھی اور آخر تک بھی یہ دونوں جب بھی ملتے گفتگو کا وہی پرانا رنگ شروع ہو جاتا۔ میرے چچا میاں سر محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہنواز ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے پہلو میں ایک ہی احاطے کی دو کوٹھیوں میں رہتے تھے غالباً سنہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب میری عمر بھی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ چچا سر شفیع کے یہاں میرا آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہاں میرے دو ہم عمر رفیق رہتے تھے مجھے خواب کی طرح لیکن صاف یاد ہے کہ جس کمرے میں ہم لڑکے بیٹھا کرتے تھے، اس کے برابر والے کمرے میں ان زندہ دل جوانوں کی بے تکلفانہ محفل جما کرتی تھی۔ ہمیں اس میں شمولیت کی اجازت تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن ہم دروازوں کے روزنوں میں سے اور کسی کھلے دروازے کے باہر دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے اور جہاں اندر سے کسی بزرگ کے نکلنے کی آہٹ ہوتی بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ اقبال ان دنوں محفل کے روح رواں تھے۔ اور ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ حد درجہ کے رند مشرب ہیں۔ ان کی آواز سب سے زیادہ بلند ہوتی اور باتوں میں کھلا مذاق جس کے لیے پنجابی زبان خاص طور پر موزوں رہی ہے۔

اسی زمانہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے انجمن کی پرانی شیرانوالہ دروازہ والی عمارت میں ہوا کرتے تھے اور چوں کہ ان جلسوں میں اکثر اوقات دلچسپی کا کافی سامان ہوا کرتا تھا۔ ہم بھی کئی کئی دنوں کا پروگرام ہونے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا شمولیت سے ناغہ نہیں کرتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جب اس وقت کے نوجوان شعرا، جن میں سے خان احمد حسین خاں اور اقبال خاص طور پر ممتاز تھے، اپنا کلام سنانے والے ہوں مجھے یاد ہے کہ اقبال ایک خوش وضع جوان کی صورت، ہلکی پھلکی سی عینک لگائے، گلے کا بٹن کھلا ہوا شلوار پہنے اسٹیج پر آیا کرتے تھے۔ اور ان کے آتے ہی وہ ہنگامہ جو چندہ جمع کرنے اور خشک و بے لذت تقریر کرنے والوں کی وجہ سے تمام ہال میں برپا رہا کرتا تھا، تالیوں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر وہ نغمے فضا میں گونجنے لگتے جن کے سننے کی آرزو میں ہم بھیڑ بھاڑ میں دھکے کھاتے ہوئے، داخل ہو کر صبح سے چاروں طرف کے دباؤ کے جھٹکے برداشت کیے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری سمجھ میں آتا تھا یا نہیں کہ شاعرانہ نکتہ سنج کیا کہہ رہے ہیں۔ بہرحال اقبال کے دلکش ترنم میں وہ مزا آجاتا تھا جو شاید

کسی محفل رقص و سرود میں بھی نہ آتا۔ اور ان کے اشعار کی داد اس بے تکلف دل سے نکلے ہوئے جوش کے ساتھ دی جاتی جو پنجاب والوں ہی کا حصہ ہے۔ ان جلسوں میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے آدمی شرکت کیا کرتے تھے۔

چنانچہ مولوی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی جیسی ہستیوں کو پہلے پہلے میں نے وہیں دیکھا یا سنا۔ مولانا حالی بہت ضعیف تھے اور آواز اتنی نہ تھی کہ تمام حاضرین سن سکتے۔ لاؤڈ اسپیکر کا زمانہ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا حالی اپنی نظم کے ایک دو اشعار پڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور مسودہ اقبال کو دے دیا جو انھوں نے اپنے مخصوص طرز میں سنایا۔ اور نظم پڑھنے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی کہی جس کے قافیہ ردیف نام حالی کلام حالی تھے۔ الفاظ مجھے یاد نہیں۔

اس کے بعد اقبال ولایت چلے گئے اور کئی سال تک سوائے اس کے کہ اقبال کی کوئی نئی غزل مخزن میں نکلی اور ہم نے جھٹ اپنی بیاض میں نقل کر کے اسے یاد کرنا اور گانا شروع کر دیا۔ ان کا سامنا نہ ہو سکا۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد ان کے تغزل کے رنگ میں فرق آ گیا اور اس میں کم از کم اس وقت ہمارے لیے وہ رندانہ کیف نہ رہا جو ان کی ولایت سے بھیجی ہوئی اس مشہور غزل کے مقطع میں ہے:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفیت ہے اس کی   کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

اقبال کے ولایت سے واپس آ جانے کے بعد غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب میں اسکول سے کالج میں پہنچ چکا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ جلسے سے پہلے یہ خبر اڑائی گئی تھی کہ اقبال اپنی کوئی خاص نظم پڑھنے والے ہیں۔ بس پھر کیا تھا وقت سے دو گھنٹے پہلے کالج سے بھاگ لیے اور ابھی چونکہ پنڈال اچھی طرح بھرا نہ تھا، عین ڈائس کے کنارے جس کے اوپر بڑے لوگوں کے لیے کرسیاں بچھی تھیں پاؤں نیچے لٹکا کر جم گئے۔ کالج کے چار یا پانچ نوجوان کہیں تہیہ کر کے بیٹھ جائیں تو انھیں کوئی رعب یا دھمکی دے کر اٹھا تو لے۔ خصوصاً ایسے جلسے میں جس میں اقبال نئی نظم پڑھنے والے ہوں۔ دو چار قانون اور حفظ امن کے چوکیدار آئے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن یہاں "زمین جنبد، نہ جنبد گل محمد" والا تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ کسی سے مذاق، کسی پر پھبتیاں، کسی سے کامل خاموشی بلا حرکت کی سیاسی پالیسی برتی گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب وقت کم رہ گیا اور جگہ کی قلت پیدا ہوئی تو ایک ہی ہلے میں ڈائس کے چاروں طرف کے کنارے پاؤں لٹکائے ہوئے نوجوانوں سے بھر گئے۔ اور کسی سینے پر کپڑے کا پھول لگا کر اکڑنے والے کی دال نہ گلی۔

غرض یہ کہ اقبال ڈائس پر آئے۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اور حسبِ معمول ڈائس پر تھوڑی بہت کھسر پسر کے بعد وہ اپنی نظم پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ باوجود سامعین کے بے حد اصرار کے اقبال نے نظم کو ترنم سے پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ترنم سے پڑھنا نظم کے مضمون سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان "شکوہ" ہے۔ اقبال پہلا بند پڑھنے لگے:

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں   فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں   ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی کے سانس لینے کی آواز تک سنائی دے جائے۔ دوسرا بند شروع ہوا:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم   قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم   نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

جوں جوں اقبال نظم پڑھتے جاتے تھے سامعین کا جوش بڑھتا جاتا تھا اور ہر بند کے بعد تالیوں اور نعروں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا جس کے خاموش ہونے تک اقبال کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔ اسی ہنگامہ پرور شان کے ساتھ یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھی گئی۔ اور نئے اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں آج تک انجمن حمایت اسلام کے یا دوسرے جتنے بھی جلسے ہوئے ان میں مجھے یاد نہیں کہ کسی میں اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہو۔

جس قدر اس قابل یادگار موقع پر ہوا۔

شکوہ کے شایع ہونے کے بعد چاروں طرف سے جوابوں کی بوچھار شروع ہوئی۔ کھلے خطوط میں، اخباری مضامین میں، نثر میں، نظم میں، درجنوں پمفلٹ شایع ہوئے۔ کچھ مولویوں نے اقبال کو برا بھلا کہا۔ لیکن اقبال بالکل خاموش رہے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کی نظم شمع و شاعر نکلی۔ لیکن یہ قدرے مشکل زبان میں لکھی گئی تھی۔ اور مقصد اور خیالات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ سوائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اسلامی پبلک کے اس کا لطف کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لیے گو اس کی شہرت بہت ہوئی لیکن عام نہیں۔

اس سے بھی چند ماہ یا شاید ایک سال بعد جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبال نے خود شکوہ کا جواب لکھا ہے جو عنقریب کسی جلسے میں پڑھا جائے گا اس پر جوش امید ہر طرف پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خاں "زمیندار" والوں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا۔ اور مشتہر ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہوگی۔ شائقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسہ میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا۔ اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ کے لیے جمع ہوگئی۔

یہ نظم کئی لحاظ سے شکوہ کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے اور اس میں پہلے پہل مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ان کا شعار اسلامی نہیں رہا، وہی سبق دیا گیا ہے جو اقبال کی طرف سے اہل اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یعنی یہ کہ زمانہ گزشتہ کی یاد میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں، اسلام فنا نہیں ہو سکتا، اگر کوشش کرو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کوشش کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے چند بند سن لیجیے تاکہ اقبال کے درد قومی کے خلوص کا اندازہ ہو سکے۔ اللہ سے شکوہ کے بعد دیکھیے جواب کس طرح شروع ہوتا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے　　خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا　　اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا　　کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں　　راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں　　جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقبال کے شکوہ کا جواب تھا۔ اب پیغام سنیے:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی　　گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچہ میں پریشاں ہو جا　　رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا

ہے تنک مایہ تو، ذرے سے بیاباں ہو جا　　نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

انجمن کے جلسوں میں بعض اوقات حاضرین اور منتظمین کے درمیان بڑی دل چسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ منتظمین میں عام طور پر اردو کے ان دنوں غالباً سب سے زیادہ مقبول اخبار "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی عبد العزیز پیش پیش ہوا کرتے تھے لوگ خوش طبعی سے انھیں پیسہ اور دھیلا کہا کرتے تھے۔ گو اس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ لیکن عبد العزیز صاحب خصوصاً چونکہ انجمن کے جلسوں میں چندہ جمع کرنے کے لیے سب سے زیادہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی اور حاضرین کے درمیان خصوصیت تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں کسی پسندیدہ شاعر کی نظم یا اچھے مقرر کی تقریر کا وقت آیا عبد العزیز صاحب ڈائس پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ فلاں صاحب کی نظم سننے کے لیے بے چین ہیں وہ موجود ہیں اور سنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن چندے کی رقم مثلاً ساڑھے چار ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے پانچسو اور دلوایئے تو نظم شروع ہوگی۔ ورنہ جب تک پانچ ہزار روپیہ نہ ہوں گے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر لوگ جلدی جلدی دوڑتے اور رقم پوری کر دی جاتی" تو نظم شروع ہوتی۔ اس کا جواب حاضرین کو موقع مل جاتا تھا تو اس طرح دیا جاتا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال کی اگر کسی جلسے میں کوئی نظم نہیں ہوئی اور حاضرین میں موجود ہیں تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا کہ آج تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ آپ نے ہماری دل چسپی کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا۔ لہٰذا علامہ اقبال سے ان کے چند غیر مطبوعہ اشعار سنوا دیجیے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو چندہ بھی نہیں ہوگا۔ تمام حاضرین تہیہ کرکے بیٹھ جاتے کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا۔ چنانچہ منتظمین مجبور ہو جاتے اور علامہ کی منت سماجت کرکے اشعار پڑھواتے۔ ایک ایسا موقع یاد ہے کہ اقبال مسکرا اٹھے اور ایک فی البدیہہ رباعی مذاحیہ شان میں پڑھی، ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہیں۔ کچھ اس طرح تھے: بلبندہ باقی۔ بہت سے چندہ باقی۔ اور ابھی تو رہتا ہے بندہ باقی وغیرہ۔ اور یہ سنا کر بیٹھ گئے حاضرین نے پہلے تو خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ اس کے بعد ایک صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ اس رباعی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن شوق پورا نہیں ہوا۔ حسرت رہی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ پھر اٹھے اور پھر چند اشعار سنا کر چندے کی گاڑی کو دوبارہ چلتا کر دیا۔

ٹھیک تاریخیں یاد نہیں لیکن ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ اقبال کئی مرتبہ اس کالج میں پڑھانے پر مامور ہوتے۔ لیکن ہمیشہ فلسفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ شاید پرنسپل کی غیر موجودگی، یا کسی اور وجہ سے ہماری جماعت کو انگریزی نظم کا سبق دینا ان کے فرائض میں شامل ہو گیا اور ہماری بے حد خوش قسمتی تھی کہ ہم نے انگریزی زبان کے بہترین شعرا کی چند بہترین نظمیں ان سے پڑھیں۔ ان میں جہاں تک مجھے یاد ہے ملٹن کی Penseroso, Allegro اور Lycidas اور کیٹس کی Isabella ڈرائیڈن کی Mac Flecknoe اور غالباً کولرج کی Ancient Mariner شامل تھیں Grey's Elegy کے علاوہ شیلے کی Adonais جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بلا مبالغہ یہ انگریزی زبان کی چند سب سے بلند نظموں میں سے ایک ہے۔ شیلے کا تخیل ہمارے مشرقی شعرا کی طرح گہرا اور پرمعنی ہوتا ہے اور جس طرح ہمارے شعرا ایک ہی شعر میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اسی طرح شیلے کے ایک بند میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے اجن کو علیحدہ علیحدہ کرکے پوری طرح سمجھنے کے لیے قدرے محنت درکار ہوتی ہے۔ اس خاص نظم کے متعلق میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر استاد کی استادانہ حیثیت کی حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔ آپ کے معلمین تو جانتے ہوں گے۔ لیکن آپ میں سے شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جسے معلوم ہو کہ یہ نظم شیلے نے اپنے دلی دوست اور مشہور شاعر (Keats) کے مرثیے کے طور پر لکھی تھی جس کا صرف چوبیس برس کی عمر میں، نقادوں کے نہایت بے رحمی سے اس کی بعض نظموں پر اعتراض کرنے کے صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ تمام نظم صحیح معنوں میں درد و غم کے اثرات سے معمور ہے اور ہر مصرعے میں ایک زخم خوردہ دل کے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ عجیب بات ہے نظم کے آخری تین چار بندوں میں اس انتہائی مایوسی اور شدت غم کے ذکر کے ساتھ جو کیٹس کی جدائی سے شیلے پر چھا گیا تھا، شیلے کی اپنی موت کا جو اس

نظم لکھنے سے تین چار سال بعد واقع ہوئی ہو بہو نظارہ موجود ہے گویا یہ ایک قسم کی پیشگوئی تھی کہ میری موت اس طرح واقع ہونے والی ہے۔ گویا اول تو لکھنے والا شیلے۔ دوسرے اس کی وہ نظم جو انتہائی جذبے کی حالت میں لکھی گئی۔ اور تیسرے پڑھانے والا ڈاکٹر محمد اقبال جو خود گھرے تخیل کا بادشاہ ہے اس مجموعے نے شاگردوں کی جماعت کے ان افراد پر جو حساس دل رکھتے تھے، وہ اثر کیا کہ تمام عمر فراموش نہیں ہو سکتا۔

اس نظم کے پچپن بند ہیں اور ڈاکٹر صاحب پینتالیس منٹ کے ایک کالج کے گھنٹے میں تو، نو مصرعے کا ایک بند ہی روزانہ پڑھاتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو پڑھانے میں جماعت کو پڑھنے میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہوگا۔ جب شیلے کے خیالات کو علامہ اقبال جیسا آدمی سمجھانے کی غرض سے واضح کرے اور خیال کے ساتھ مقابلہ یا موازنہ کے طور پر اپنے اور اردو شعراء کے خیالات بھی پیش کرے تو سامعین کی خوش قسمتی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ایک دریا تھا جو بہتا چلا آتا تھا۔ علامہ کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور دل یہی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح پڑھاتے جائیں۔ اور ہم دل بھر خاموش بیٹھ کر سنا کریں۔ کالج کا ایک گھنٹہ جو عام طور پر طالب علم کے لیے محنت سے چھٹکارے کی مسرت انگیز خبر لیے ہوئے آتا ہے۔ اس گھنٹے کے ختم ہونے سے دل پر چوٹ کی شکل میں لگتا تھا۔ اور بادل نخواستہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ شیلے کی (Adonais) سے مثال کے طور پر ایک چیز پیش کر دوں جس سے آپ کو مندرجہ بالا گھنٹوں کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے دوسرے بند کی آخری سطور میں شیلے کہتا ہے کہ ان کی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کی طرح جو دفن شدہ انسان کی بے ثباتی اور نفرت انگیز صورت پر ہنستے ہیں۔ کیٹس نے اپنی آنے والی ہولناک موت کو اپنے آخری نغموں سے اس طرح سجا کر چھپا رکھا تھا کہ وہ نظر نہیں آتی تھی۔

کسی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر شیلے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک تو وہ پھول انسان کی بے ثباتی پر ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ انسانی لاش کے ڈراؤنے پن کو اپنے حسن سے چھپا دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مرزا غالب فرماتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

ان میں قبر کے پھولوں کو دیکھ کر غالب کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ یہ پھول ان دلفریب صورتوں کا ایک حصہ ہیں جو اس خاک میں دفن ہیں اور جنھیں ان کے حسن کی طاقت نمو نے مٹی کے باہر ظاہر کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا شیلے کو شیلی کہتے تھے۔ اور اردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لیے ہوئے لہجے میں بولتے تھے۔ یعنی قاف کو کاف ہی کہتے تھے۔ اور حقہ کو حکہ۔ اسی بنا پر مولانا نیاز فتحپوری نے اپنی مشہور ڈائری میں اقبال کی صورت و شکل اور طرز گفتگو کو نہایت غیر شاعرانہ بیان کیا ہے۔ لباس کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا بغیر استری کے۔ ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی۔ عام طور پر بندھی بندھائی بوچیکا لیا کرتے تھے۔ بوٹ میلے ہیں تو کچھ پروا نہیں۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے۔ پیچھے کو برش کر لیا کرتے تھے۔ پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ بعد میں بالدار سیاہ ٹوپی اختیار کر لی۔ باوجود اس کے کہ ہماری اس سال کی بی اے کی جماعت جو شروع سینٹرل ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لیے مشہور چلی آتی تھی۔ اور خصوصاً برے تلفظ والے پروفیسر کا تو ناک میں دم کر دیا کرتی تھی۔ ان کے گھنٹے میں اس قدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے اور اس کی آواز سنائی دے جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ اقبال نے کبھی کسی لڑکے کو کسی قصور پر سزا دی ہو۔ بلکہ دھمکی تک بھی کبھی نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ مجھے اب علم ہوا ہے کہ ان کی داہنی آنکھ بیکار تھی۔ جماعت میں ہمیشہ ان سے قریب بیٹھتا تھا لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے علامہ اقبال کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا۔ گو سنا ہے کہ حقے کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کلاس کا رجسٹر لیے۔ سر جھکائے کبھی کچھ گنگناتے ہوئے ادھر اُدھر دکھائی دیتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے۔

ان دنوں کالج میں ایک سوسائٹی بزم سخن کے نام سے تھی، جس کے جلسے عام طور پر پندرھویں دن یا مہینے میں ایک بار ہوا کرتے تھے۔ لیکن زندہ دل پروفیسر شیخ نور الٰہی صاحب اس کے مستقل صدر تھے۔ ہر جلسہ میں اپنے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اتنے طالب علم جمع ہو جایا کرتے تھے جتنے کمرے میں سما سکتے۔ اس بزم میں کالج کے لڑکے اپنا منظوم کلام جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہوتا سنایا کرتے تھے۔ بعض اوقات طرح مقرر کر دی

جاتی تھی جس پر سب مشق سخن کرتے تھے ۔ ساہر جوں کہ ہمارے صدر میں پہلے عرض کر چکا ہوں، زندہ دل تھے، وہ مبتذل قسم کی عریانی کے سوا ہر قسم کی بات کہہ لینے دیا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح اس وقت شعراء میں اتنی عریاں پسندی بھی نہ تھی لیکن مذاق اور پھبتیوں میں کالج کے کسی نہ کسی رنگ میں ممتاز طالب علموں اور پروفیسروں تک کو شعر میں باندھ دیا جاتا تھا جس سے جلسہ کی دلچسپی روز افزوں تھی۔ خدا جانے اب تک وہ بزم قائم ہے یا نہیں۔ بہرحال اس وقت بہت کوشش کی گئی لیکن صدر بننا تو در کنار علامہ اقبال کبھی اس کے ایک جلسہ میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ البتہ (COLLEGE DAY) کے موقع پر ہر سال کسی بھلے آدمی نے بہترین اردو نظم کے لیے ایک مستقل انعام مقرر کر رکھا تھا۔ اس مقابلے میں جو لڑکے نظمیں بھیجتے تھے ان کے جج علامہ اقبال ہی ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ کالج میں پڑھاتے بھی نہ تھے، تو یہ نظمیں فیصلے کے لیے انھیں کے پاس بھیجدی جایا کرتی تھیں۔ بعد میں وہ نظمیں جو اول، دوم، اور سوم درجہ پر ہتیں کالج ڈے پر تمام لڑکوں کے سامنے ان کے مصنف پڑھ کر سناتے اور انعام حاصل کرتے تھے۔ ویسے عام طور پر بھی علامہ اقبال نوجوانوں کے شعر کہنے کے خلاف تھے مجھے یاد ہے کہ ان کی پروفیسری کے دنوں میں جب وہ ہمیں پڑھاتے تھے ہم ان کی کلاس کے دو تین لڑکے اپنی اپنی غزلیں لے کر ایک دن اکٹھے ان کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور شعر کہنے کا شوق رکھتے ہیں اگر کبھی کبھی آپ ہماری ناچیز کوشش دیکھ کر تھوڑی بہت اصلاح فرما دیا کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔ فرمایا کہ بھائی میں کبھی کسی کے اشعار پر اصلاح نہیں دیا کرتا۔ جو تمہارے دماغ میں آئے لکھو۔ لیکن اگر میری نصیحت مانو تو شعر کہنا چھوڑ دو یہ مشغلہ اچھا نہیں۔

اقبال کے ملنے والے عام طور پہ کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بہ فراغت بیٹھے ہوئے بھی جب کبھی بات چیت کے دوران اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ اور یہ تو مشہور ہے کہ شعر کہتے وقت اکثر زار و قطار رویا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہ ان سے عندالطلب شعر نہیں کہلوائے جا سکتے تھے، جب تک ان پر وہ خاص کیفیت طاری نہ ہو اور طاری ہو تو بیسوں اشعار ایک وقت میں کہہ جاتے تھے۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا ہے، حالانکہ وہ پڑھاتے وقت کتاب کے مصنفوں ہی سے سروکار رکھتے تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ سبق چھوڑ کر گویا جماعت سے باتیں کرنے لگے۔ جو نظم وہ پڑھا رہے تھے اس میں ایک مصرعے کے یہ معنی تھے کہ شاعر کے لیے زبان کے الفاظ اظہار خیالات کو کافی نہیں ہوتے۔ اقبال کتاب کی طرف سے نگاہ اٹھا کر جماعت سے مخاطب ہو گئے اور فرمایا کہ آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر کے دماغ میں جس وقت آمد ہوتی ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ خیالات ایک طوفان کی طرح امڈے چلے آتے ہیں، اس کو ہر خیال کے لیے پہلے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں پھر عروض اور قافیہ ردیف کے مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے اس کے بعد ایک شعر بنتا ہے۔ اس وقت تک درجنوں ایسے خیالات بھول کر ضائع ہو جاتے ہیں جو اگر شعر میں آ جاتے تو اس مخصوص شعر سے شاید کہیں بہتر ہوتے۔ شاعر بعض اوقات سخت بے چین ہوتا ہے اور تڑپتا ہے کہ اظہار خیال کے لیے اسے الفاظ نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اس خاص بحر یا قافیہ یا ردیف میں ادا نہیں ہو سکتے۔ جس میں نظم یا غزل لکھی جا رہی ہے۔

(اقبال ریویو سہاہی)

پہلی فخریہ پیش کش

ماہنامہ آجکل کراچی

کا عظیم الشان افسانہ نمبر فوٹو آفسٹ پر

جس میں

ہندوپاک کے تمام مشہور افسانہ نگار حصہ لے رہے ہیں

قیمت: دو روپے ۔ صفحات ۲۷۵

یہ عظیم الشان افسانہ نمبر جو ۱۴ راگست ۱۹۶۳ء کو منظر عام پر آ رہا ہے۔ سالانہ خریداروں کی خدمت میں مفت پیش کیا جائے گا۔ اگر آپ سالانہ خریدار نہیں ہیں تو آج ہی سالانہ قیمت چھ روپے اور افسانہ نمبر رجسٹری خرچ تریسٹھ پیسے کل (6/63) ارسال فرما کر یہ نمبر آپ بھی مفت حاصل کریں۔

ترسیل زر کے پتے:

پاکستان میں: دفتر آجکل ۱۱۱ واٹر نہ چیمبر ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

ہندوستان میں: ایم برکت اللہ عادل نمبر ۱۲۰ چک بانہ ارونڈ ڈاکخانہ بنگلور ۱

اکبر اور اقبال

نور محمد ایم اے

کمال اور زوال، بلندی اور پستی، سرفرازی اور تنزلی، ان الفاظ میں دنیا کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ ہندوستان مغلوں کے زمانے میں اپنے عروج کا شباب دیکھ چکا تھا، شاہجہاں کے عہد میں پردیسیوں کی نظر بد اس شباب کو گھن بن کر لگ گئی اور بسرعت تمام شیب میں تبدیل ہوتا چلا گیا! آخر ۵۷ء کا حادثہ رونما ہوا ۵۷ء میں سلطنت مغلیہ نے ایک سنبھالا لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا اور وہ بابری شمع جو اس بزم رنگیں کو تین سو سال تک جلا دیتی رہی جھلملا کے ختم ہو گئی اور اپنے ساتھ پرانے ہندوستان کو بھی ختم کر گئی ۵۷ء کے بعد ہندوستان نے ایک نیا جنم لیا۔ غالب نے واقعہ ۵۷ء کو "رستخیز بیجا" کے نام سے یاد کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ "رستخیز بجا" تھا۔ ۵۷ء نے جدید ہندوستان کی بنیاد رکھی، وہ ہندوستان جو اورنگ زیب کی وفات کے وقت سسکیاں لے رہا تھا کب تک زندہ رہتا۔

قوموں کی زندگی کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مذہبی، ادبی، سیاسی۔ تنزل پذیر قوم ان تینوں چیزوں سے محروم ہو جاتی ہے اس کے ایمان میں تزلزل، اس کے ادب میں انحطاط اور اس کی سیاست میں گتھیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایسا مذہبی سرگروہ نہیں ملتا جو صحیح معنوں میں اس کی رہنمائی کرے اور نہ کوئی ایسا سیاست داں ملتا ہے جو قوم کے سامنے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرے قوموں کا زوال ایک یا دو دن کی بات نہیں ہوتی، سال یا دو سال کا واقعہ نہیں ہوتا قوم کو بنتے اور بگڑتے صدیاں لگ جاتی ہیں۔

۵۷ء کا واقعہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا منحوس ترین سانحہ ہے یہ ایک ایسا جانگداز اور روح فرسا صدمہ تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھے، مذہب سے جو مسلمانوں کا اوڑھنا اور بچھونا ہے روگردانی شروع ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس غیر متوقع آفت نے رہے سہے عقائد اور اعتقادات بھی ڈھیل کر دیے اور اس طرح ایمان میں تزلزل کی بنیاد پڑی۔

بھولا ہوا خواب جب حقیقت کا روپ دھارن نہ کر سکا تو مسلمانوں کے ہوش مختل ہو کر رہ گئے وہ سمجھتے تھے کہ دہلی کی سلطنت ان کی میراث ہے اور اس کی بقا اور حفاظت ان کی سیاست۔ جب یہ ہاتھ سے نکل گئی تو ان کی سیاست کا خاتمہ ہو گیا انھیں اب کوئی شاہراہ عمل سجھائی نہیں دیتی تھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ ان کی بدحواسی، بے چینی اور اضطراب نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کاوش فکر کرتے اور اس غیر متوقع مصیبت کا کوئی ٹھیک حل ڈھونڈ نکالتے۔ یہ تھے وہ حالات جہاں سے سیاست میں پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں شروع ہوئی ہیں۔

"دلی کی نوخیز چھوکری" سلطنت کا سایہ عاطفت اٹھ جاتے کے بعد مبہوت ہو کر رہ گئی۔ یتیمی کے صدمے نے اس سے بھلے اور برے میں امتیاز کرنے کی قوت سلب کر لی اور وہ اپنے خیر خواہوں میں تمیز نہ کر سکی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شاہی حرم اور دربار میں پرورش پائی ہوئی بیگموں اور شاہوں کے منہ لگی ہوئی کیا جانتی کہ مصیبت کیا چیز ہوتی ہے، جس وقت قلعہ سے نکالی گئی نادان تھی، عوام کے نرغہ میں جا پھنسی، جوانی کے دن تھے اور امنگوں کی راتیں، ان سے کھل کھیلی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف عزت ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو دوسری طرف اثاثہ لٹتا دکھائی دیا، غرضکہ اس طرح ادب میں انحطاط رونما ہوا

ایمان میں تزلزل سیاست میں پیچیدگیاں اور ادب میں انحطاط ان تینوں نے مل کر مسلم قوم کے لیے نہ صرف زوال کے سامان مہیا کر دیے بلکہ اسے اس مقام تک لے آئے جہاں اس کی بقا کے لیے کسی مرد کامل کی ضرورت لاحق ہوئی۔ توحید کی امانت سینوں میں رکھنے

والے اب نہ صرف ایک مذہبی رہنما کے محتاج تھے بلکہ انھیں اپنی بقا کے لیے ایک مجتہد ادیب کی ضرورت تھی اور سیاست میں ایک دور اندیش اور تجربہ کار سیاستداں کی۔ ان کی کشتیٔ حیات بادِ حوادث کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لا کر پاش پاش ہوئی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت چند افراد خدا کا نام لے کر قوم کو بچانے کا عزم کر کے اٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اصلاح ایک شخص کے بوتے کا کام نہ تھا، مولوی ابو القاسم مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور دیوبند میں ایک مذہبی جامع کی بنیاد رکھتے ہیں، سر سید سیاسی رہنما کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں لیکن اس گُر سے بخوبی واقف ہیں کہ سیاست کی پہلی سیڑھی تعلیم ہے اسی لیے وہ علوم جدید و قدیم کی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے علی گڑھ میں ایک مرکزی دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور ادب کی اصلاح اور صحیح نہج پر لانے کا سہرا حالی کے سر رہتا ہے۔

حالی اردو ادب میں پہلی ہستی ہے جس کے یہاں اجتماعی شعور رہا یا جاتا ہے۔ حالی کو اپنے سے زیادہ قوم اور وطن کا خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے حسی اور بے دلی سے حد درجہ متاثر ہیں ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس بے حسی اور بے دلی کو دور کرنے کے لیے وقف تھا انھوں نے ادب کو پہلی مرتبہ ایک وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا حالی کے یہاں ادب مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ محض ان کے اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے۔ حالی کے نزدیک مقصد اتنا اہم ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ غزل کی سی صنفِ ادب کو بھی وہ وسیلہ کے طور پر ہی کام میں لاتے ہیں" حالی رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" حالی نے ماضی کے گن گائے اور حال کی بدحالی پر نیر بہائے، حالی مغرب سے مرعوب تھے وہاں کی مادی ترقیات اور علوم و فنون کے عروج نے ان کی نظر میں خیرگی پیدا کر دی تھی، حالی کی یہ کیفیت بہت کچھ سر سید کی صحبت اور قربت کا نتیجہ تھی حالی کے کردار میں یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ وہ شخصیتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے، حالی نے سر سید سے متاثر ہو کر عمر بھر "پیروی مغربی" کے راگ الاپے حالی نے ایک پختہ کار اور ہوشیار فن کار کی طرح ہمارے سامنے دو متضاد تصویریں پیش کر دیں۔ ماضی کی رونق اور حالی کی خستگی اس درماندگی اور خستہ حالی کا علاج حالی نے "پیروی مغربی" تجویز کیا۔

لیکن حالی ہی کے زمانے میں ایک شخص نے یہ آواز بلند کی کہ ہماری موجودہ پستی، افلاس اور ادبار کی وجہ ہماری مغرب کی اندھی اور کورانہ تقلید ہے ہم نے جادۂ حق کو چھوڑ دیا اس لیے ہم قعرِ مذلت میں گر پڑے ۔ یہ آواز اکبر کی تھی۔ اکبر نے مسلمانوں کی بہبودی اور خوشنودی اسی میں دیکھی کہ وہ سختی کے ساتھ اپنے ماضی سے وابستہ رہیں۔ حالی مسلمانوں کے ماضی کو روشن اور شاندار تسلیم کرتے ہوئے بھی جب کشمکش اور الجھن کے دوراہے پر پہنچتے ہیں تو مسلمانوں کو "آتشِ نمرود" میں "بے خطر" کود پڑنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اکبر اس اندھی تقلید کے قائل نہیں قدامت پسندی ان کا مذہب اور شرقیت ان کا ایمان ہے "غیرت قومی" اکبر کے مزاج کا جزو لاینفک ہے خواہ وہ تعلیم ہو یا سیاست ہو یا مذہب ہو یا معاشرت اکبر کبھی غیرتِ قومی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اکبر کے بعد جس شخص نے مغربی تہذیب کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی وہ اقبال تھے۔ اکبر نے قریب قریب ان ہی چیزوں کی مخالفت کی تھی جن چیزوں کی اقبال نے کی یعنی مغرب کی اندھی تقلید، عورتوں کی آزادی اور ان کی موجودہ تعلیم مشینوں کا غلبہ، مغربی تعلیم، قرآن اور مذہب سے بے نیازی وغیرہ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر کے منہ سے جب ہم ان باتوں کی مخالفت سنتے ہیں تو ہم انھیں محض تفریح کی چیز سمجھ کر ٹال جاتے ہیں لیکن جب اقبال کے منہ سے سنتے ہیں تو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں —— اس سے پہلے کہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ کیوں اقبال کی آواز کو ندا کی آواز کا اثر رکھتی ہے کہ ہم بے اختیارانہ اس کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کیوں اکبر کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی یہ مناسب ہوگا کہ میں ایک ہی موضوع پر اکبر کے اور پھر اقبال کے اشعار آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دوں اشعار کی تعداد صبر آزما ہے لیکن میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ناگزیر سا امر ہے۔ اکبر مغرب کی اندھی تقلید کے بارے میں کہتے ہیں!

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے ۔۔۔ بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی ۔۔۔ یوروپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

حاصل کرو علمِ طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

خدا جانے کہا کس نے یہ کسی دن عقل سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست ان کی
مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجیے ان کو حکیمانہ طریقوں سے
کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے مقراض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے
کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ ہیں یہ نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد
عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے جی خوگر ہیں
امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے بارے میں اکبر کی ظرافت کی پھلجھڑیاں ملاحظہ ہوں:

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں ہے دلیری اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ان اشعار سے آپ یہ غلط نتیجہ نہ نکال لیں کہ اکبر تعلیمِ نسواں کے مخالف تھے، یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہوگی وہ عورتوں میں تعلیم کا رواج دیکھنا چاہتے تھے لیکن کس قسم کا یہ ملاحظہ ہو:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

کون کہتا ہے کہ تعلیمِ زناں خوب نہیں
ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس سلسلے میں اکبر کی ایک طویل نظم "تعلیمِ نسواں" ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اقبال "آزادیٔ نسواں" کے عنوان سے کہتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اسی سلسلے میں اقبال کے اور اشعار پیش ہیں:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

تعلیم کے بارے میں اکبر کہتے ہیں:

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے — خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے — جناب ڈاروِن کو حضرت آدم سے کیا مطلب

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر — گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا — ذہن کو تپ آگئی اور مذہب کو فالج ہو گیا

کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب — دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ

بتکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف

لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں — عہدہ مطلوب ہے وطن مالوف

اقبال کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے حاصل نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈھنے جائے کوئی — اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

مر ہے افکار سے ان مدرسے والوں کا ضمیر — خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

نئی تہذیب کے متعلق اکبر کہتے ہیں:

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی — کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشوں کی

مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں — حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں

ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر — اگزبیشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق — ان حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا — لڑکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا

حسن و جنون بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

انگلش ڈریس انور کا جو کل بزم میں دیکھا — اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر — تبدیلئ صورت کے رہے گر یہی اطوار

حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا — شرمائو گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ ادھر کے — انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

اقبال کہتے ہیں:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب / کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید / ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں / بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے / یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں تخیل میں / ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کون ہے تارک آئین رسول مختار / مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار / ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں / کچھ بھی پیغام محمد کا تمہیں پاس نہیں

اقبال نے جب یورپی تہذیب اور تمدن کا بہ نظر غور مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے / کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی / جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اکبر نے سات سمندر دور رہتے ہوئے بھی اقبال سے پیشتر یہ کہدیا تھا۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو / بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ / دیکھنا اکبر بچائے رہنا اپنے آپ کو

نفس انسانی پر مشینوں کے غلبہ کے بارے میں اکبر اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال کیا ہے۔

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے / اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے (اکبر)
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت / احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (اقبال)

قرآن کریم مسلمانوں کے لیے آئین حیات کا کام دیتا ہے مسلمانوں نے اگر دنیا میں شہرت و نیک نامی حاصل کی عظمت و بزرگی پائی ترقی و سروری کے مدارج طے کیے تو یہ سب اسی آئین حیات پر عمل پیرا ہونے کا صدقہ تھا۔ اکبر و اقبال دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ع

اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اکبر کہتے ہیں:

صوم ہے ایمان سے، ایمان رخصت صوم گم / قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

اور اقبال کہتے ہیں:

از یک آئین مسلمان زندہ است / پیکر ملت ز قرآن زندہ است

اشعار کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھے احساس ہے لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ایک ضروری امر تھا آپ نے ان اشعار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ اساسی چیزوں کے متعلق اکبر اور اقبال دونوں ہم خیال ہیں لیکن اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اکبر کے مقابلے میں اقبال کیوں زیادہ کامیاب رہے اس کے کئی اسباب ہیں۔

آرٹ کی عظمت بہت کچھ آرٹسٹ کی شخصیت اور اس کے عقائد پر منحصر ہے۔ اکبر اور اقبال کی شخصیت میں بعد المشرقین ہے۔ ایک دیو پیکر ہے تو دوسرا بونا، ایک علوم جدید و قدیم کا ماہر تو دوسرا صرف علوم قدیم سے آشنا، ایک مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے مزین تو دوسرا گنے چنے لوگوں کے خیالات سے آگاہ، ایک فلسفی تو دوسرا صوفی بعد میں اور ظریف پہلے، اقبال کے کلام میں تاثیر ان کے شاعرانہ

اعجاز سے نہیں ہے کیوں کہ جہاں تک فنی خصوصیات کا تعلق ہے اکبر کا کلام کسی لحاظ سے، کسی پہلو سے اقبال کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو قدرت اکبر کو زبان پر حاصل تھی وہ شاید اقبال کو کبھی نصیب نہ ہوئی اس فرق کی وجہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں شاعرانہ اعجاز نہیں بلکہ شخصیتوں کا فرق ہے۔ اکبر کی شخصیت نہ اتنی بلند ہے جتنی اقبال کی ہے نہ اس میں وہ ہمہ گیری ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ زبان پر اگر قدرت ہے تو شعر میں شگفتگی، برجستگی، سلاست، طلاقت اور روانی پیدا ہو سکتی ہے۔ شعر میں حسن بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک محرکاتِ شعری عظیم نہ ہوں آرٹ میں بلندی نہیں آسکتی۔ اکبر کے یہاں تخریبی پہلو نمایاں ہے اقبال کے یہاں تعمیری پہلو پیش پیش ہے۔

اکبر کے یہاں شوخی تھی اور بلا کی سوجھ میں بوجھ کو بہت کم دخل تھا، اکبر ہر چیز کے منفی پہلو کو پہلی نظر میں دیکھ لیتے ہیں اور اسی کو اساسی پہلو قرار دے کر طنز و ظرافت کے تیروں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں۔ اکبر زیادہ تر چیزوں کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں، اقبال نے ان چیزوں کا مطالعہ ساحل پر کھڑے ہو کر محفوظ و ثبت مقام سے نہیں کیا بلکہ انھوں نے طوفان سے چشمک زنی کی، وہ موجوں سے کھیلے اور چٹانوں سے ٹکرائے، اسی چشمک، کھیل اور ٹکر سے وہ شرارہ وجود میں آیا جس نے ان کے کلام کو زیادہ موثر، زیادہ بلند اور وقیع بنا دیا برخلاف اس کے اکبر ان چیزوں کو غول بیابانی سمجھتے رہے۔ انھوں نے ایک محفوظ اور مثبت مقام سے طوفان کا صرف نظارہ کیا اسی لیے وہ اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے ان کا مطالعہ کچا، خام اور ناقص رہا، اسی لیے وہ جزئیات پیش کرنے سے قاصر رہے وہ برائیوں پر زور دیتے ہیں جو پہلی نظر میں دکھائی دے جاتی ہیں، اکبر بات کو تبنگڑ بنا کر پیش کرتے ہیں اور معمولی چیز پر زور دینے میں ان کا وار ہمیشہ کوٹ، پتلون، اور سایہ پر ہی پڑتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اکبر اوچھے ہتھیاروں سے وار کرتے ہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا اقبال ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور چیزوں کے حسن و قبح کا انحصار ان کی ظاہری سج دھج پر نہیں بلکہ ان کی تمام خصوصیات پر رکھتے ہیں ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبر کی ناکامی کا سبب ان کے مطالعے کی سطحیت اور فکر و بینش کی کمی ہے۔ لیکن صرف اسی چیز کو اکبر کی ناکامیابی کی وجہ قرار دینا اکبر کے ساتھ ناانصافی ہوگی اکبر کے زمانے میں مغربی سیلاب نیا نیا تھا نئے سیلاب میں شدت ہوتی ہے، طاقت ہوتی ہے، زور ہوتا ہے، اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی حال اس وقت بھی ہوا سلطنت کے نقصان اور تعلیم کے فقدان نے یہ امر ذہن نشین کر دیا تھا کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب کی پیروی شروع کر دیں مغربی معاشرت اور تمدن کا غائر نظر سے مطالعہ کسی نے نہیں کیا غلام قوم کے قوائے ذہنی مفلوج ہو جاتے ہیں وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتی خوب و زشت میں امتیاز نہیں کر سکتی اقبال کے الفاظ میں:

بھروسہ کر نہیں سکتے غلامی کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

فاتح کا ہر عیب مفتوح کی نظر میں حسن بن جاتا ہے اس کے علاوہ دور سے چمکنے والی چیز سونا ہی نظر آتی ہے۔ آقا کا ہر فعل غلاموں کے نزدیک قابل تقلید ہوتا ہے اس کے علاوہ مغربی معاشرت میں ظاہری چمک دمک کچھ ایسی تھی کہ یہاں کے لوگوں کی نظر خیرہ ہو کر رہ گئی غرضکہ ایسے ماحول میں جب ذہن مفلوج ہو گئے تھے اور نظریں خیرہ، اکبر نے تن تنہا مغربی یلغار کو روکنے کی کوشش کی اکبر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں ایک اکبر تو کیا اگر دس اکبر بھی ہوتے تو اس سیلاب کو روک نہ سکتے۔ میرا مقصد اس سے اکبر کی عظمت گھٹانا نہیں ہے، اکبر کی اتنی اہمیت تو مسلم ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ ہمارے افکار و خیالات مغربی رنگ میں رنگے جا چکے تھے انھوں نے اپنے بے پناہ طنز و ظرافت کے بل بوتے مغربی سیلاب پر اتنی شدید اور کاری ضرب لگائی کہ علی گڑھ اور برطانوی سامراج دونوں کا بڑھتا ہوا اثر اور ترقی کرتی ہوئی طاقت تحس نحس ہو کر رہ گئی۔ علی گڑھ نے برطانوی قدروں کی حمایت کی تھی اور انھیں مسلمانوں میں عام کرنا چاہا تھا لیکن اکبر نے اس ڈھول کا پول کھول دیا اکبر کو اگر ہم حکیم نہیں کہہ سکتے تو نقاد ضرور کہہ سکتے ہیں۔ برطانوی عظمت کو منجملہ جن چیزوں سے دھکا پہنچا ہے ان سیاسی تحریکات کے بعد سب سے پہلے اکبر کا نام آتا ہے اکبر کا یہی کمال کیا کم ہے کہ اقبال کے لیے زمین ہموار کر دی اکبر کی عدم موجودگی میں اقبال کے کلام کا کیا حشر ہوتا یہ صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے بیان نہیں۔

اقبال کی کامیابی اور اکبر کی ناکامیابی کی ایک وجہ اور ہے۔ اکبر نے اپنے خیالات کے ابلاغ کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا وہ طنز و ظرافت تھی۔

لطیف نازک اور پرمعنی ظرافت ہر شخص کے بس کی نہیں ہوتی اسی لیے اکبر کا کلام زیادہ تر قہقہوں میں اڑا دیا گیا اس معنویت کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی اکبر نے ہنسا کر رلانا چاہا وہ تبسم میں آنسوؤں کا پیغام لائے تھے لیکن عوام کی کم فہمی اسے صرف قہقہہ سمجھ کر رہ گئی یہ نہ دیکھا کہ اس قہقہے میں کتنا کرب کتنا سوز، کتنی بے چینی پوشیدہ ہے۔ اکبر نے حکومت کے خوف سے سرد موسم اور برفبار ہواؤں میں شاہدِ معنی کے لیے ظرافت کے لحاف کو ترجیح دی۔ طنز و ظرافت کا تعلق جہاں جذبات و حسیات سے ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ذہن و دماغ سے ہوتا ہے اکبر نے متفرق اشعار کہے لیکن ذہن پر جب تک کوئی مکمل مسلسل نہ ہو اثر نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی کامیابی بڑی حد تک اکبر کی ناکامیابی کی رہینِ منت ہے اکبر ہی کا ایک شعر ہے:

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے
دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا ہی

یہ اقبال کی دانشمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے خودی کا ہتھیار اس وقت استعمال کیا جب مسلمانوں کے دل اکبر کے نغمے سے تازہ تازہ گرم تھے۔ اکبر اور اقبال کے مزاج میں کتنا فرق تھا یہ آپ ان دو شعروں سے معلوم کر سکتے ہیں:

اس میں برائی کیا تھی جو میں
احیائے رسمِ دیرینہ رہا

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اکبر تہذیب مغربی کی مخالفت کرتے رہے لیکن لوگوں نے اسے قبول کر ہی لیا۔

جلوۂ ساقی و مے جان لیے لیتے ہیں
شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیے لیتے ہیں

اکبر کی ناکامی کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مغرب کی ترقی لادینی، عریانی اور چنگ و رباب سے ہے یہ ان کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اقبال کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بتایا کہ:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

محکمی او نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

اکبر کی آنکھوں پر قدامت کی عینک تھی، قدامت پرست انسان تھوڑا بہت متعصب بھی ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی تمام خوبیاں اور بھلائیاں اسی تہذیب معاشرت اور تمدن سے ہیں جس کا وہ پیرو ہے وہ تو کنویں کا مینڈک ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بحر کی وسعتیں ایک لفظ مہمل ہے اکبر نے جو شعر شیخ جی کے بارے میں کہے تھے وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں۔

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ
گو تقدس مآب بیشک ہیں

شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اقبال کے یہاں سب کچھ ملتا ہے لیکن تعصب نہیں ملتا وہ جانتے ہیں کہ مغرب باوجود اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اس قدر پست ہونے کے ہمیں بہت کچھ دے سکتا ہے اور وہ بہت کچھ ہے ندرت فکر و عمل

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارا لعلِ ناب

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قریب قریب یہی بات کہی تھی:

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی کار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔"

اکبر کی ناکامی کی ایک وجہ ان کی تعلیم کا منفی پہلو بھی ہے انھوں نے صرف یہ کہہ دیا کہ یہ راستہ جس پر تم گامزن ہو خطرناک ہے لیکن یہ نہ بتا سکے کہ یہ دوسرا راستہ بھی ہے جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ اکبر نے انسانوں کو اور انسانوں کے سماج کو چھوئی موئی سے زیادہ نازک سمجھ لیا تھا کہ جہاں چھوا مرجھا گیا شاید وہ ارتقا کے قایل نہ تھے:

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں — ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

شاید انھیں یہ احساس نہیں تھا کہ ع "اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"۔ وہ سماج ہی کیا جس میں لچک نہ ہو بڑے سے بڑا درخت اگر آندھی کا مقابلہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا۔ زندہ اور قایم وہی رہتا ہے جس میں جھکنے اور طوفان کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے ممکن ہے کہ مغربی سیلاب بھی ایک تاتاری فتنہ ثابت ہوتا۔ جس طرح اسلام تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ حال ہوا اسی طرح اس نے ترقی بھی انھیں کے بل بوتے پر کی۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اقبال کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو ٹھوس اور جامد نہیں قرار دیا بلکہ نامی اور جدلیاتی تصور کیا۔ اسی سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

"پچاس برس کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی لہروں کے ملنے سے نکلتی ہے ان بجلیوں کو علیحدہ کر دیجیے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی۔"

حالی کے یہاں مفاہمت ہے، اکبر کے یہاں احساسِ شکست ہے اور "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو" کی صدائے بازگشت ہے، لیکن اقبال کے یہاں اعلان جنگ ہے اور یہی وجہ اکبر کی ناکامی اور اقبال کی کامیابی کی ہے، حالی اور سرسید کے یہاں اندھا دھند تقلید کرنے کا نعرہ ہے اور اکبر کے یہاں قدامت پسندی کی تلقین ہے۔ ظاہر ہے دونوں کے نقطۂ نظر انتہا پسند تھے۔ ان میں توازن کی ضرورت تھی، چناں چہ اقبال نے ہمیں ایسا پیغام دیا جس میں اعتدال اور توازن ہے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے یہاں سرسید حالی اور اکبر کی بہترین تعلیم ملتی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں نہ انتہائی تعصب سے کام لیا گیا ہے نہ انتہائی عقیدت سے بلکہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والے کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ خودی کے فلسفے کو کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیجیے پھر دیکھیے کہ اقبال کے یہاں کیا رہ جاتا ہے یہی سرسید، حالی، اور اکبر کے خیالات کی صدائے بازگشت، وہی مشرقیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو لیکن مغرب سے بھی جتنا حاصل کر سکو کر لو:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر — فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

سنہ ۱۹۶۲ء کے اردو ادب کا جائزہ — ماہنامہ **جامعہ** کا خاص نمبر شایع ہو گیا

ماہنامہ **جامعہ** کا، پچھلے سال کی طرح، امسال بھی **جائزہ نمبر** شایع ہوا ہے، جس میں ہندستان اور پاکستان کی سنہ ۱۹۶۲ء کی مطبوعات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، نیز سنہ ۶۲ء میں جن ادیبوں کا انتقال ہوا ہے، ان کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ اور ہندوستان کے تصنیفی اداروں پر بھی ایک مضمون شامل ہے۔

پتہ: ماہنامہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی نمبر ۲۵

شاعرِ مشرق

سعادت نظیر

یادِ ایام کہ مسموم تھی مشرق کی فضا
ہر سخنور کی صدا دیتی تھی پیغامِ قضا

شاعری نام تھا الفاظ کی صناعی کا
عام فقدان تھا مضمون کی رعنائی کا

نقشِ بے رنگ تھی اربابِ سخن کی محفل
لیلیٔ حکمت و معنی سے تھا خالی محمل

عقل و دانش پہ تھا اک خوابِ گراں سا طاری
بختِ خوابیدہ کہاں، اور کہاں بیداری

تو نے وہ بربطِ نو چھیڑ دیا، اے اقبال!
جس کے ہر سُر میں ہے فطرت کا جمال اور جلال

تیری آواز سے اقوامِ وطن جاگ اُٹھے
اک نئی شان سے جذباتِ عمل جاگ اٹھے

تیرے نغمات پہ اربابِ وطن جھوم اُٹھے
جھوم اٹھے اہلِ نظر، اہلِ سخن جھوم اٹھے

گونج اٹھے تیرے ترانے کچھ اس انداز کیساتھ
نطق مربوط ہو جیسے لبِ اعجاز کے ساتھ

تیری آواز ہے یا ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
درد میں، سوز میں ہے ڈوبی ہوئی تیری نوا

اللہ اللہ! ترا اسلوبِ بیانِ گل کار!
نظر آنے لگے ویرانے میں آثارِ بہار

دردِ دل تھا جو تری سعیٔ خوش انجام کیساتھ
جاگ اٹھا قوم کا اقبال ترے نام کیساتھ

تیرے افکارِ جواں نے وہ مسیحائی کی
روح سی پھونک دی ہر جسم میں برنائی کی

تیری پرواز کی رفعت سے فلک ہیں پامال
پایۂ عرش کو چھوتے ہیں ترے فکر و خیال

فکر سے تیرے ملا شعر کو کچھ ایسا مقام
شاعری بن گئی اک حسنِ عمل کا پیغام

جس کے ہر شعر میں جادو ہے، وہ شاعر تو ہے
فلسفہ جس پہ ہے نازاں، وہ مفکّر تو ہے

تیری لے میں ترے نغمات جو سن پاتے ہیں
حوصلے عشق کے کچھ اور ابھر آتے ہیں

تیری باتوں سے ٹپکتا ہے خرد ساز فسوں
تیرا احساسِ خودی اور ترا ذوقِ جنوں

تو نے آئینۂ امروز میں فردا دیکھا
جو نہ اوروں کو نظر آیا وہ جلوا دیکھا

زندگی بخش حقائق ترے اشعار میں ہیں
اور عرفان کے نکتے تری گفتار میں ہیں

تیری ہر نظم میں ہے روشنی سیّاروں کی
تیرے ہر گیت میں خوشبو ہے چمن زاروں کی

جو درخشاں نہیں گردوں پہ، وہ خورشید نہیں
تو وہ شاعر نہیں، جو زندۂ جاوید نہیں

نورانی تیل

- آپ کے خاندان بھر کے تحفّظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے۔ اور درد، چوٹ، زخم ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجے

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی میونا تھ بھنجن یو پی

ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار گھیر سنجی رام پور یو پی سے شائع کیا

کھیل کھیل میں چوٹ لگ گئی

کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ درد بہت دن آپ کو پریشان کرے۔
آپ تفریح سے محروم الگ رہیں اور کام کاج میں علیحدہ نقصان ہو۔

لیکن پریشان کیوں ہوتے ہیں

نورانی تیل

چوٹ زخم اور درد کی لاثانی دوا ہے۔

اس پر بھروسہ کیجے۔

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن ۔ یو ۔ پی

ضروری اعلان :- پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں رسالہ جاری کردیا جائیگا - نمائندہ نگار ۶۱/۷ این سمن آباد لاہور

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

جلد ۴۲ | فہرست مضامین فروری ۱۹۶۳ء | شمارہ ۲

ملاحظات		۲	غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط	عبادت بریلوی	۱۸
غالب اور صہبائی	مالک رام	۵	غالب انڈ گو ئیٹے (مزاح)	حاجی لق لق	۱۹
غالب سے متعلق دو خطوط (صاحب آب حیات کے نام)	اکبر علی خاں	۸	طالب — غالب کا ایک گمنام شاگرد	نام سیتاپوری	۲۲
غالب کی مثنوی بے نام کا نام	سید مرتضیٰ حسین فاضل	۱۲	دیوانِ کامل و شاداں	رشید حسن خاں	۳۱

ملاحظات

اناللہ راز یزدانی صاحب کا ۱۲ جنوری کو اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ میرے لیے متوقع ہوتے ہوئے بھی سخت تھا۔ متوقع اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دل کے مریض تھے اور اس پر اپنی بیماری کی طرف سے بے پروا بھی۔ ویسے بھی دل کی بیماری سے کون جانبر ہوا ہے۔

جب میں نے نگار کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ان کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ دراصل میں نے یہ کام اسی لیے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا کہ مجھے اُن سے بہت کچھ توقعات تھیں اور وہ بے جا بھی نہیں تھیں۔ میں نے اُن سے مضمون کے لیے کہا اور وہ انھوں نے تیار کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو مضمون اُن سے جنوری کے شمارے کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور جس کی کتابت تک ہو چکی تھی وہ اس بار بھی نہیں آسکا۔ فروری کے شمارے کے لیے انھوں نے غالب کے ہاں سہل ممتنع کا موضوع انتخاب کیا تھا۔ اور یہی ان کا آخری مضمون تھا جو نامکمل رہ گیا۔

راز صاحب میں کام کرنے کی جیسی لگن تھی وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس پر طرہ ان کی گرفت تھی۔ وہ بہت جلد اپنے موضوع کا احاطہ کر لیا کرتے تھے۔ اور اُس سے بھی کم وقت انھیں مواد کو ترتیب دینے میں لگتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خان آرزو پر اپنا مضمون دو چار روز میں مکمل کر لیا تھا (یہ مضمون نقوش کے تازہ خاص نمبر میں شایع ہو چکا ہے) اس لیے میں مطمئن تھا کہ اگر فوری ضرورت پیش آئی تو یزدانی کسی کام دے جائے گی۔ لیکن آج یہ سہارا ٹوٹ چکا ہے۔ اور میں ان کی یاد میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

راز صاحب نے ساری عمر شاعری اور صحافت میں گزاری ۵۶ء میں وہ عرشی صاحب کے ترغیب دلانے پر مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئے اور دو اہم موضوعات پر دل لگا کر کام کیا۔ ان میں سے ایک تھا رام پور کا ماحول شعر و سخن اور دوسرا اُردو کی داستانیں۔ ان میں سے آخری کو انھوں نے میرے اصرار پر کتابی شکل میں مرتب کر کے میرے ہی حوالے کر دیا تھا۔ یہ کتاب انشاءاللہ جلد شایع ہو جائے گی۔

آج کل وہ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کر رہے تھے جو مولانا عرشی پریزنٹیشن والیوم کے نام سے موسوم تھا۔ جب اُن کے ذہن میں یہ اسکیم آئی تو شاید انھوں نے سب سے پہلے مجھ ہی سے اس کا ذکر کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہی کام مالک رام صاحب بھی کرنا چاہتے ہیں اور وہ مجھے لکھ بھی چکے ہیں

اس لیے آپ کے لیے یہ موزوں نہیں۔ مرحوم نے کہا "میں انھیں بھی لکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس کام میں اپنے ساتھ شریک کرلیں"۔ یہ جملہ اس لیے بڑا اہم ہے کہ اس سے اُن کی منکسر المزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے۔

وہ خود بھی بڑے جذباتی آدمی تھے۔ مظفر علی سید نے اردو تحقیق پر نقوش میں ایک مضمون لکھا اُس میں عرشی صاحب کا بھی ذکر کیا۔ راز صاحب سید صاحب کی رائے سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے یہ کہا وہ انھیں بھی کتاب کے مرتبین میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کہنے لگے تم انھیں لکھو۔ میں نے جواب دیا کہ میرا لکھنا موزوں نہیں آپ ایک کام کر رہے ہیں تو آپ ہی لکھیے بولے آغاز تم کردو میں بعد کو لے بڑھالوں گا چنانچہ یہی ہوا میں نے سید صاحب کو خط لکھا انھوں نے تائیدی جواب دیا اور پھر راز صاحب کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ انھوں نے کتاب کے سلسلے میں بہت سے لوگوں کو لکھا۔ مجھ سے اکثر مشورہ ہوتا رہا۔ مگر یہ سخت تاکید ہوتی تھی کہ عرشی صاحب کو نہ معلوم ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ بات زیادہ نہیں چھپ سکتی تھی۔ عرشی صاحب کو معلوم ہوگئی اور انھوں نے مرحوم کو روکنا چاہا، اس پر میرے پاس بہت افسردہ آئے اور کہنے لگے کہ میں مالک رام صاحب کو اور عندلیب شادانی صاحب کو (عرشی نامہ کے ایک مرتب شادانی صاحب بھی ہیں) لکھتا ہوں کہ اب آپ ہی عرشی صاحب کو لکھ کر اجازت لیں۔ ابھی اُدھر سے جواب نہ آنے پائے تھے کہ خود ہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے"۔ یہ کام اس حد تک ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا کہ مرنے سے ایک روز پہلے شام کو اپنے ایک شاگرد پر شدید تقاضا کیا کہ وہ پریس سے طباعت کا تخمینہ بنوالائیں جو مالک رام صاحب نے ان سے طلب کیا تھا۔

اس سلسلے میں جب کسی کا خط آتا تھا بے حد مسرور ہوتے تھے۔ سارے ہی اہم لوگوں کو دعوت دی تھی، ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، ڈاکٹر علیم صاحب، علامہ نیاز فتحپوری صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب، ڈاکٹر نظام الدین صاحب، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، ڈاکٹر باقر صاحب، شیخ محمد اکرام صاحب، پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب، مسعود حسن رضوی صاحب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب، پرنسپل عبدالسلام خاں صاحب ——— ان میں سے کچھ کے مقالے انھیں مل گئے تھے۔ باقی سب کے وعدے تھے۔

کئی بار ذکر آیا کہ "اگر میں یہ مکمل نہ کرسکوں تو مواد ضایع نہ ہو" میں بات کو ٹال دیتا تھا۔ اس لیے کہ اقرار کے معنی یہ تھے کہ میں خود بھی ان کی زندگی سے مایوس ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ان پر برا اثر ہی مرتب کرتی۔ اب اُن کا جمع کیا ہوا یہ مسالہ ان کی وصیت کے مطابق مالک رام صاحب کو بھیج دیا جائے گا۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ جو اس کام کا مجوزہ ہے وہی تنہا اسے انجام بھی دے۔

راز صاحب کا ایک مجموعہ کلام حرب وضرب کے نام سے کبھی شایع ہوا تھا اب وہ بھی ناپید ہے اس کے بعد بھی بیس بائیس سال انھوں نے جو کہا وہ مدون نہ ہوسکا۔ نگار کے ایک نمبر میں اس کلام کا نمائندہ انتخاب اور راز صاحب کے اہم متفرق مضامین شایع کرنے کا ارادہ ہے جو یقیناً اردو ادب کو رامپور کا ایک یادگار تحفہ ہوگا۔

موجودہ شمارہ زیر نظر شمارے میں غالب اور اُس سے متعلق عنوانات پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ ارادہ ہے کہ یہ بدعت برابر جاری رہے یعنی ہر سال فروری کے شمارے میں غالب پر مضامین شایع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

یہاں ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں میری رائے میں غالب پر لکھنے والوں کو یہ التزام کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مضامین ماہِ نو، آجکل اور اب ایک اور اضافہ ——— نگار ان ہی میں اشاعت کے لیے بھیجیں۔ اس طرح آیندہ کام کرنے والوں کو دربدر مارا مارا پھرنا نہیں پڑے گا۔ آیندہ خود میں بھی یہ کوشش کروں گا کہ غالب پر سال کے مختلف حصوں میں ادھر ادھر شایع ہونے والے مضامین میں سے اہم نگار میں نقل کرتا رہوں، تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولت ہوسکے۔

اس بار وعدے کے باوجود مسلسل شایع ہونے والے کتاب غالبیہ کا دوسرا باب صفحات کی کمی کی بنا پر نہیں دیا جاسکا۔ اگرچہ اسی کتاب کے ایک اور باب سے غالب سے متعلق دو خط شایع کیے جارہے ہیں، تاکہ قطعاً وعدہ خلافی کا جرم بھی سرزد نہ ہو۔ ان خطوں سے متعلق اختلافی حواشی نظر انداز کردیے گئے ہیں۔ ابتدا میں صرف تعارفی سطریں درج کی گئی ہیں۔

مجھے مسرت ہے کہ متفقہ طور پر غالبیہ کی اشاعت کو قارئین نے سراہا۔ مجھے اس کتاب کی ترتیب کا خیال دستور الفصاحت کی ترتیب کو دیکھ کر آیا تھا جس کے حواشی میں عرشی صاحب نے دوسرے تذکروں سے احوال شعرا کا اضافہ کیا ہے۔ سوچا تو یہ تھا کہ تذکروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا جائے، جس میں اردو کے اہم شاعروں کے بارے میں تمام تذکروں کے بیانات یکجا کیے جائیں۔ اور اس کا آغاز اپنے محبوب شاعر غالب سے کیا تھا۔ مگر اب اس کی وسعت کا اندازہ ہوا ہے تو سوچتا ہوں سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔ میرے اکیلے کرنے کا یہ کام نہیں۔ اس کے لیے بے اندازہ وقت مکمل توجہ اور وافر روپے کی ضرورت ہے جو اس دور میں کہاں میسر ہیں۔ اس لیے میری رائے میں اب علیحدہ علیحدہ شاعروں پر اپنی اپنی دلچسپی کے ماتحت دوسرے لوگ بھی کام کریں تو بہت کچھ ہو جائے گا۔ لیکن اس میں یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ ہماری توجہ کے لائق کون ہے اوّل و دوم درجے کے شعرا کو چھوڑ کر اگر ہم چوتھے اور پانچویں درجے پر آ جائیں تو نہ صرف اس کا فائدہ بڑا محدود رہ جائے گا بلکہ تضیع اوقات بھی ہوگی۔

یہ کام یونی ورسٹیوں کے اردو شعبے بھی ایم اے اور پی ایچ ڈی کے طلبا سے کرا سکتے ہیں بشرطیکہ رہنمائی کرنے والوں میں صلاحیت ہو اور وہ اسے اپنے سے فروتر بھی نہ جانیں۔

شاداں کا دیوان میں شایع کرنا چاہتا تھا۔ نگار کی اشاعت کا کام سنبھالا تو سوچا کہ کیوں نہ اسے غالب کے لیے وقف شمارے میں چھاپ دیا جائے۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ رام پور رضا لائبریری میں موجود ہے۔ خمخانہ جاوید میں کچھ اور اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس کے لیے شہید حسین خاں صاحب سے ایک مختصر تعارف بھی لکھوا لیا اور اس طرح کامل کے متفرق کلام کے ساتھ یہ دیوان بھی چھاپا جا رہا ہے۔ یہ اس سلسلہ نوادر کا آغاز ہے جو رام پور رضا لائبریری کے ذخیرے سے حاصل کر کے چھاپے جائیں گے۔

شاداں کا ذکر مکاتیب غالب (عرشی) تلامذہ غالب (مالک رام) کے علاوہ فغان دہلی، فریاد دہلی، سخن شعرا، خمخانۂ جاوید، انتخاب یادگار۔ تذکرہ کاملان رام پور، تذکرہ طور کلیم اور ذکر غالب میں بھی ہے۔

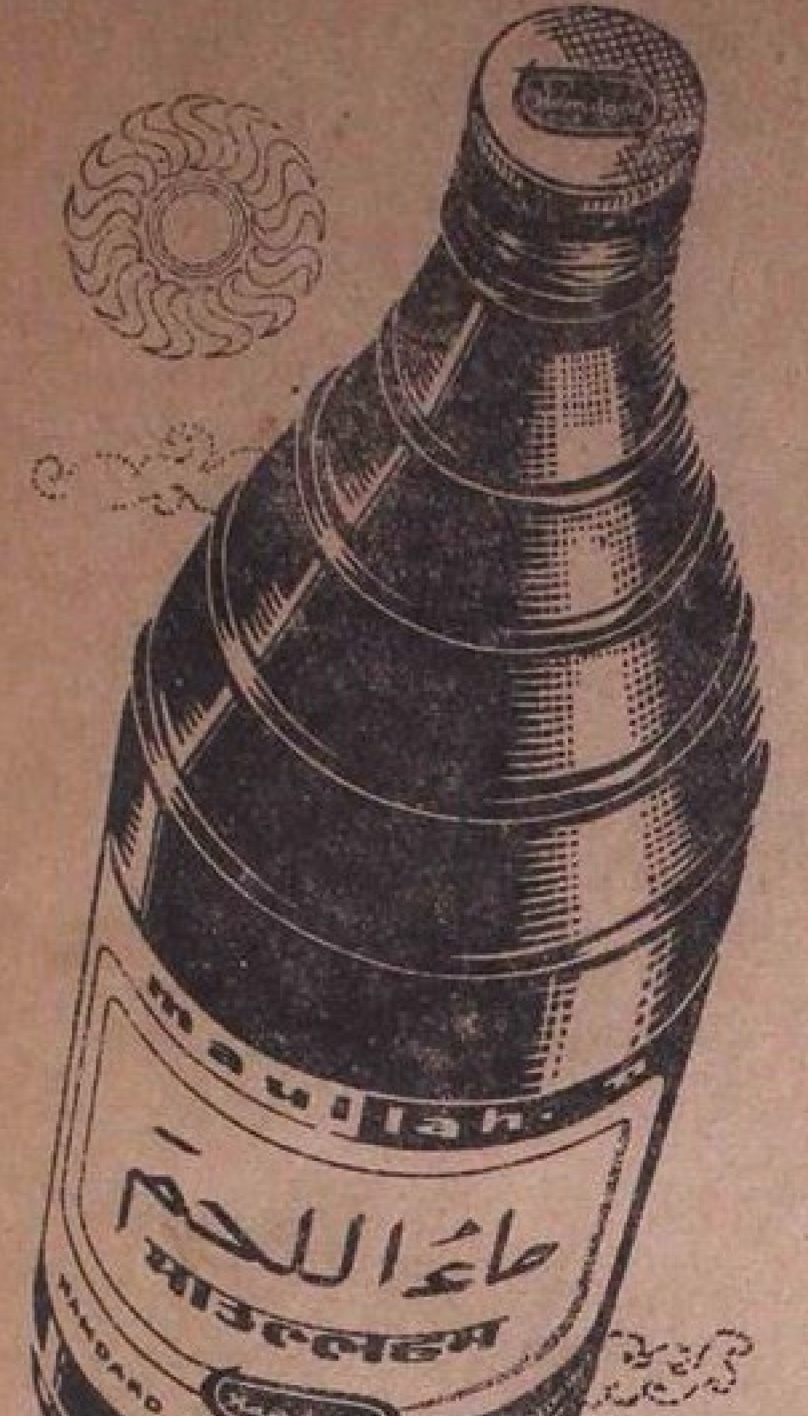

ہمدرد کا ماءُ اللحم
بھوک کو بڑھاتا ہے اور دورانِ خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر ایک نئی طاقت، نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔
ہمدرد
دہلی
کانپور
پٹنہ

غالب اور صہبائیؔ

مالک رام

غالب کی خود بینی اور خود ستائی اب اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ اس پر کسی تفصیل سے لکھنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ وہ ہندوستان کے کسی فارسی گو شاعر اور ادیب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خطوں میں تقریباً تمام ہندوستانی شاعروں اور نثر نگاروں کے نام آئے ہیں اور انھوں نے ان میں سے ایک حضرت امیر خسرؒو کے سوا کسی کو نہیں بخشا۔

اس کے باوجود انھوں نے اپنے ہمعصروں سے متعلق ایک قطعے میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے فرماتے ہیں:-

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم　　چہ بما منت بسیار نہی از کمِ شاں
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود　　باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائیؔ و علوی وانگاہ　　حسرتی اشرف و آذردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شاں

یہاں انھوں نے اپنے چھ معاصروں کا نام لیا ہے اور اپنے آپ کو انکسار سے ان کا محض ہم نفس اور ہمدم کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں سے ایک صہبائیؔ ہیں۔

صہبائیؔ، جن کا اصلی نام امام بخش تھا، نجیب الطرفین تھے۔ سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی پر اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے۔ ان کا خاندان تھانیسر کا رہنے والا تھا، لیکن یہ دلّی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے میں فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ یہ عبداللہ خاں عُلوی کے شاگرد تھے، جن کا نام غالب کے مندرجہ صدر قطعے میں بھی آیا ہے۔ ان کا کلیات فارسی ان کے ایک ہندو شاگرد اودین دیال میر منشی ایجنٹی بھوپال نے جمع کر کے چھپوایا تھا۔ اردو میں بھی ان کی بعض نثری چیزیں ملتی ہیں۔ قدیم دلی کالج کے پرنسپل فیلکس بوترو کی فرمایش پر انھوں نے ۱۸۴۳ء میں شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، لیکن اس میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی کی ہے۔ یعنی عبارت میں اتنا رد و بدل اور حذف و اضافہ کیا ہے کہ یہ کتاب ان کی مستقل تالیف ہو گئی ہے۔ اصل کتاب میں مثالیں فارسی میں تھیں، ان کی جگہ انھوں نے اردو کی مثالیں مہیا کی ہیں۔ بعض جگہ مثالوں میں اپنے چند اردو شعر بھی درج کیے ہیں، ورنہ یوں وہ اردو میں شعر نہیں کہتے تھے۔ اس کتاب کے علاوہ اسی کالج کی ترجمہ سوسائٹی کے لیے انھوں نے اردو شاعروں کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔ ہر ایک انتخاب سے پہلے انھوں نے شاعر کے مختصر حالات اردو نثر میں لکھے ہیں۔ یہ انتخاب بھی اسی سوسائٹی کی طرف سے ۱۸۴۴ء میں شایع ہوا تھا۔ سرسیّد کی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں بھی وہ برابر کے شریک رہے تھے، بلکہ ایک پورے کا پورا باب انہی کا لکھا ہوا تھا۔ جب ۱۸۴۰ء میں دلّی کالج میں عربی کی طرح فارسی کے لیے بھی ایک اچھا مستعد مدرس رکھنے کی تجویز ہوئی، تو اس جگہ پر صہبائیؔ ہی کا تقرر ہوا تھا۔ ان بیچاروں کا انجام بہت حسرت ناک ہوا۔ اپنے دو جوان بیٹوں کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزی گولی کا نشانہ ہوئے۔ اِنّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

غالب کے اس قطعے سے خیال ہوگا کہ وہ صہبائیؔ کی شاعری کے قایل اور معترف ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ خدا معلوم، وہ کس تاثر کے تحت یہ لکھ گئے، ورنہ انھوں نے اور جہاں کہیں بھی صہبائیؔ کا ذکر کیا ہے، حقارت اور مذمت کے لہجے میں۔ برہانِ قاطع کے مباحثے میں صہبائیؔ کے

شاگرد میرزا رحیم بیگ میرٹھی نے بھی غالب کے جواب میں ایک کتاب ساطع برہان لکھی تھی۔ میاں داد خاں سیاح، غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے کسی خط میں اس کتاب کا ذکر کیا، تو انھیں لکھتے ہیں:[1]

"وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملا، مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہر حال اب اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔"

اگرچہ یہاں انھوں نے سیاح کو لکھا تھا کہ ساطع برہان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، لیکن بعد کو انھوں نے خود ایک طویل خط میرزا رحیم بیگ کے نام لکھ کر اسے نامۂ غالب کے عنوان سے شائع کیا۔ میرزا رحیم بیگ نے ساطع برہان میں اپنے استاد کے نام (امام بخش) کی رعایت سے ایک مقام پر ان کے اسم گرامی سے پہلے "امام المحققین" لکھا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرزا نامۂ غالب میں ایک جگہ میرزا رحیم بیگ سے پوچھتے ہیں:[2]

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو 'امام المحقِّقین' خطاب دیا ہے، کتنے مُحقِّقین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب تک نہ اجماع مُحقِّقین کا ہوگا، یہ خطاب بر اجماعِ اہلِ عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔ وہ فرماں روائے عہد شہنشاہ کہلائے گا، کئی بادشاہ جس کے فرمان پذیر ہو جائیں گے۔ ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا، یہ میر شہنشاہ صاحب کیونکر شاہجہان و جہانگیر ہو جائیں گے! اگر حضرت بفتحۂ قاف بصیغۂ تثنیہ امام المحقَّقَین کہتے، تو ایک ماموم آپ ہوتے اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

میرزا نے نامۂ غالب اپنے خرچ پر طبع کروایا تھا اور دور نزدیک اس کے نسخے دوست احباب میں تقسیم کر دیے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ایک صاحب مولوی عبدالرزاق شاکر مچھلی شہری تھے۔ معلوم ہوتا ہے، میرزا نے انھیں بھی اس کا نسخہ بھیجا تھا۔ اس پر شاکر نے مکتوب الیہ (میرزا رحیم بیگ) سے متعلق پوچھا اور چاہا کہ اگر ہو سکے تو ساطع برہان کا نسخہ بھی مہیا کیا جائے۔ اس پر انھیں لکھتے ہیں:[3]

"نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واہ رے اس ہیچ در ہیچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عز و وقار ہو۔ رسالہ اس کا ساطع برہان دلی بھیج کر ڈھونڈھواؤں گا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا۔"

معلوم نہیں اہلِ دلی نے کیا کہا اور کیوں کہا۔ بے شک، انھوں نے اپنے کلام پر تو صہبائی سے اصلاح نہیں لی تھی، لیکن گلستانِ سخن (ص ۱۴۱، ۲۴۱) میں صاف لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے چند رسائل نثر اصلاح کے لیے صہبائی کو بھیجے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے سے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیا تلمذ کے لیے یہ کافی تصور نہیں کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں گلستانِ سخن سے زیادہ اور کوئی بیان قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔

لیکن غالب نے رحیم اور شاکر کے نام صہبائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی رائے ان سے متعلق کیا تھی۔ دو دو جگہ ایک ایک لفظ سے ان کی توہین اور علمی بے وقری کا اظہار مقصود ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ برہان قاطع کی بحث میں میرزا اپنا توازن کھو بیٹھے تھے اور اس معرکے میں جو بھی ان کے مدمقابل ہوا، انھوں نے اسے نیچا دکھانے کے لیے جائز اور ناجائز تمام حربے استعمال کیے۔ علمی دلائل سے گزر کر

---

۱ اردوئے معلیٰ، ص ۲۲ (مطبع کریمی، لاہور) ۲ عود ہندی، ص ۱۳۸ تا ۱۳۹ (مطبع کریمی، لاہور) ۳ عود ہندی، ص ۱۵۱، ۱۵۲

۴ یہ خط رامپور سے لکھا گیا تھا۔

طنز و طعن اور تمسخر و تشنیع سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ یہاں اتفاق سے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اصلی ہدف تو میرزا رحیم بیگ تھے، صہبائی بیچارے اُن کے استاد بھی لپیٹے میں آگئے۔ اگر اور کوئی شہادت موجود نہ ہوتی، تو یہ توجیہہ کسی حد تک قابل قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے ایک اور جگہ بھی صہبائی کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

میرے اپنے پاس غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر قلمی مجموعہ ہے۔ اس میں چند قصیدے، قطعات اور رباعیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام معاصر اخباروں وغیرہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں میں کہیں کہیں غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔

اس مجموعے میں منجملہ اور چیزوں کے ولی عہد ظفر، میرزا فتح الملک بہادر کی مدح کا وہ قصیدہ بھی ہے، جو اس وقت مطبوعہ کلیات میں نمبر ۴۸ پر ہے اس کا مطلع ہے:-

بازم نفس از سینہ بہنجار بر آمد
شد زخمہ رواں، زمزمہ از تار بر آمد

اس کے بعد دوسرا اور تیسرا شعر ہے:

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفے زلبِ کافر و دیندار بر آمد
آں از نعم آوازۂ انکار در افگند
ایں راز بلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

یہاں غالب حاشیے میں لکھتے ہیں:-

"چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی پیشِ معتقدانِ خویش کہ خرکرۂ چند بودند، گفت: افسوس کہ غالب عربی نمی داند و از نعم معنیِ انکار افادہ می کند، حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنیٰ است۔ مولوی آلِ نبی یکے از یارانِ غالب عبارتِ شرحِ مُلّا کہ رفعِ ایں وسوسہ می کرد، بوے نمود و گفت: غالب حق گفتہ است و تو غلط فہمیدۂ۔ سوال از جانبِ حق اینست: اَلَستُ بِرَبِّکُم؟— آیا نیستم پروردگارِ شما؟ و ایں کلمہ استفہامیہ است۔ کفار گفتند: ہاں، نیستی خدائے ما؛ مومناں گفتند: ہاں، ہستی خدائے ما۔ آں تسلیم انکار است و ایں تسلیم اقرار۔ مولوی چوں خر در وحل فرو ماند۔"

اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

بقیہ۔ غالب کا ایک گمنام شاگرد

آنکھ جس دن سے کھلی محوِ رخِ دوست ہوں میں
میری آنکھیں نہیں واقف، کسے کہتے ہیں خواب

ہے یہاں موسمِ برسات ہمیشہ طالب
دیدۂ تر میں مرے روکشِ باراں سیماب

ہے حسن و تخیل میں اک فرق بہر صورت
واں زلف پریشاں ہے یاں فکر پریشاں ہے

زندگی اس کی، نصیب اس کا، زمانہ اس کا ہے
جو ہے بے خوفِ عدو دن رات ہم پہلوئے دوست

طالبِ خلد بریں طالب ہو کس کے واسطے
دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

کس آتشیں نگار کے سوزِ فراق میں
سرگرم نالہ ہوں شرر افشانیوں کے ساتھ

طالب کیا ہے آہ نے اپنی اثر ضرور
وہ ہیں جو عذر خواہ پشیمانیوں کے ساتھ

یہ سرسری انتخاب ان شکستہ اور کرم خوردہ اوراق کا ہے جس کی ترتیب و تدوین کے لیے اچھے خاصے وقت کی ضرورت ہے! طالب کے نام غالب کا کوئی خط مجھے ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ طالب کے اکلوتے فرزند مفتی سید احمد شریف گھر لا ولد مرے۔ ان کی وفات کے بعد اس خاندان کا نسلی چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ خاندانی جائداد کے تنازعے شروع ہوئے اور جس کے ہاتھ جو کاغذات لگے اس نے اپنے قبضے میں کر لیے بظاہر ان کے ملنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں پھر بھی سعی و کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔

غالب سے متعلق دو خط

صاحب آب حیات کے نام

(زیر طبع کتاب غالبیہ سے)

اکبر علی خاں

تذکرہ آب حیات کا نام جہاں ہمارے ذہنوں میں ایک باغ و بہار، دلکش اور ساحرانہ اسلوب کی تازگی کا اثر بیدار کرتا ہے وہیں تاریخی اعتبار سے اس تصنیف کی اہمیت کو کم اور اس کے مصنف کو پایہ اعتبار سے ساقط بھی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ شاید ہی موجودہ دور کا کوئی نقاد اور محقق ایسا ہو جس سے محمد حسین آزاد کے بارے میں رائے دریافت کی جائے ــــ اور وہ بھی آب حیات کی روشنی میں تو وہ انھیں جانب دار، متعصب اور واقعات کو حسب ضرورت استعمال کرنے والا نہ کہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب تک جن حالات کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا وہ بیشتر آزاد کے خلاف نکلے۔ اس لیے ہمارے نقاد اور محقق آزاد کو مجرم سمجھنے میں بڑی حد تک حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد کی دیانت داری کو مشکوک بنانے میں جہاں اور بہت سی باتیں کام کر رہی ہیں وہاں خصوصیت سے تدوین کلام ذوق کے وقت اصلاح اشعار کا کام بھی ہے۔ بے چارے آزاد نے یہ کب سوچا ہوگا کہ اپنے استاد کے لیے خلوص محبت اور عقیدت میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں عالم آشکار ہو کر رہے گا۔ مگر وقت کی رو بڑی بے درد ہوتی ہے اور آج ہم سب جانتے ہیں کہ ذوق کی تصویریں کتنے نقوش اصل اور کتنے مصور کا اپنا اضافہ ہیں۔

اسی طرح آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں کا تذکرہ شامل نہ کر کے بھی انھوں نے اپنے آپ کو اعتراضات کا نشانہ بنالیا۔ کہنے والوں نے کہا کہ مذہبی تعصب کے جنون میں آزاد نے مومن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ لاکھ صفائی پیش کرتے رہے کہ مجھے مومن کے بارے میں سعی و جستجو کے باوجود معلومات نہیں مل سکیں لیکن دوسرے ایڈیشن میں جب مومن کا ذکر آگیا تو لوگوں نے یہی سمجھا کہ پہلی بات عذر لنگ کے سوا کچھ نہ تھی اور یہ شمولیت مطالبہ جمہور کے ڈر سے ہے۔

یہ اور اس جیسے بہت سے اعتراضات صاحب آب حیات کے سلسلے میں عام ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آب حیات کو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی افسانہ و افسوں سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا لب و لہجہ تاریخ اور تذکرے کے مروجہ انداز سے میل نہیں کھاتا اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ زیب داستاں کے لیے صاحب کتاب نے اپنی ذہنی اڑان کو بے دریغ استعمال کیا ہے۔ لیکن کلی طور پر یہ خیال درست نہیں ہے۔ آزاد نے خام مواد کے مہیا کرنے میں مختلف ذرایع استعمال کیے تھے۔ اور غالب و مومن وغیرہ کے سلسلے میں ایسے اصحاب کو خطوط لکھے تھے جو انھیں ان شخصیتوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے تھے۔

اس مسالے کو ڈاکٹر محمد صادق نے دریافت کیا ہے۔ اس میں علاء الدین احمد خاں علائی اور شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی کے دو خط بھی ہیں۔ یہ خط غالب سے متعلق ہیں۔ پہلا خط علائی کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے سوالات قایم کر کے بھیجے تھے جن کے جوابات بالترتیب علائی نے لکھے ہیں۔ دوسرے خط میں جو ذکاء اللہ کا ہے باقاعدہ سوال و جواب کا ڈھنگ تو نہیں لیکن ہے وہ بھی آزاد کے استفسار ہی کے جواب میں۔ ان خطوں کے سامنے آجانے سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ آزاد نے حتی الامکان کسی کے بارے میں لکھنے سے پہلے ایسے ذرایع تلاش کیے جن کی طرف انھیں رجوع کرنا چاہیے تھا، اور جن سے صحیح واقعات و احوال کا علم ہو سکتا تھا۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں خط موافق و مخالف انداز فکر کی آخری حدوں کو چھوتے ہیں۔ علائی نے غالب کے سلسلے میں جس عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے ذکار اللہ کے یہاں اس کے برعکس جذبہ نظر آتا ہے اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ۔

ان خطوں کے ساتھ آب حیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ آزاد نے منفی کے مقابلے میں مثبت اطلاعات کو ترجیح دی ہے اور غالب کے بارے میں ان تاثرات اور واقعات کا اندراج پسند کیا ہے جو علائی نے لکھے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ذکار اللہ کے بیانات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

دراصل یہ طرز عمل آزاد کے مرنجاں مرنج مزاج کا تقاضہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ گل کبھی نہ کھلا سکتے جو انھوں نے کاغذ پر کھیر دیے ہیں اور جو کاغذ کے ہوتے ہوئے بھی بے رنگ و بو نہیں۔ وہ اگر چاہتے تو جانب داری سے کام لیتے ہوئے مخالف مواد کو بآسانی پیش کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے ہمیں سارے مشکوک مواقع پر جہاں ہم آزاد کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتے ایک بار پھر سوچنا چاہیے کہ ہم مصنف کو کتنی چھوٹ دے سکتے ہیں۔

یہ خطوط اگر ایک طرف آزاد کو سنگین الزام سے بری کرتے ہیں تو دوسری طرف غالب کے بارے میں دلچسپ معلومات کے حامل بھی ہیں اور دو قطعاً مخالف سمتوں کی وجہ سے بے حد لائق توجہ بھی۔ ڈاکٹر محمد صادق کے شکریہ کے ساتھ انھیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مکتوب نواب علاء الدین احمد خاں علائی

ادیب شفیق، حبیب لوذعی و المعی مولوی محمد حسین صاحب عربی پروفیسر کالج لاہور

السلام علیکم! آپ کا مہربانی نامہ ۲۴ر جون کا اس دور افتادہ کو ملا۔ اس کا ورود میرے لیے فتح الباب مسرت ہوا۔ آپ کا ارادہ نسبت تالیف تذکرہ مشاہیر شعرا اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس تذکرے میں ہر شاعر کے تاریخی حالات اور اس کی سوانح عمری کے واقعات لطائف اور تلامذہ رحمانی کا آپ نے التزام فرمایا ہے اور عنایت الٰہی اس کا تکمیل پر پہنچنا دریافت ہو کر نہایت درجہ مسرت حاصل ہوئی۔ اگرچہ میں سرمایہ علمی بہت کم رکھتا ہوں الا ایسے امور کا نہایت شایق ہوں اور افسوس ہے کہ وقت لکھنے اس تذکرے کے میں آپ سے دور تھا۔ ورنہ آپ کو تاریخی حالات شعرا کی نسبت سوائے حالات مرزا اسد اللہ خاں غالب کے زیادہ تر امداد دی جاتی، کیونکہ میں نے اپنے والد ماجد سے بہت کچھ سنا ہے۔ میں ایک خاکستر ہوں اس خرمن کا جسے آتش غدر، نے جلا دیا۔ اب آپ نے مخدومی مکرمی مرزا غالب کا حال دریافت کیا ہے۔ اگرچہ اس کا منصب عمومی مکرمی جناب ضیاء الدین خاں صاحب کو حاصل ہے وہ بالاستیعاب ان کے حال سے آپ کو اطلاع دیتے۔ بدیں وجہ کہ وہ مجھ سے زیادہ کہن سال بھی ہیں اور ان کی معلومات اوہام۔ اوہام کے نزدیک معتمد علیہ اور معتبر تر ہے مگر خیر جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ حوالۂ قلم ہے۔

آپ کو واضح ہو کہ جناب مرحوم سے مجھے تلمذ بھی تھا۔ اور غایت درجہ مہر و شفقت اُن کی میری نسبت تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باہم میرے والد کے اور ان کے زیادہ محبت اور مودت تھی۔ اور چونکہ وہ صاحب اولاد نہ تھے مثل فرزند مجھے تربیت کیا۔ میرے علم میں جو کچھ ہے اسے بے تکلف لکھے دیتا ہوں، یہ نہیں کہہ سکتا کہ اور راویان صادق کی تحقیق کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

آپ کا سوال نسبت تبدیلی تخلص؟

جواب ـــــ مجھ کو یاد ہے فرماتے تھے کہ ۱۸۲۸ء میں ۲۹ کے قریب انھوں نے تخلص تبدیل کیا۔ اور واقعی اسد اللہ خاں کے نام کے واسطے غالب ہی تخلص زیبا تھا۔ کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا یہ لقب قرار پایا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ کوئی اسد نامی ایک فرومایہ بونگا کوڈھبا جھجر کا شعر کہتا تھا اس کے ایک مقطع میں لفظ اسد ان کی نظر سے گزرا۔ وہ مقطع یہ تھا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب　　　ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

ہم تخلص ہونا جناب مرحوم کو ایسے لوگوں سے جو تہمت آدم میں نہایت مکروہ معلوم ہوا اس وجہ سے اسد اللہ خاں کے ساتھ غالب کو موضوع کر دیا

دوسرا سوال بابت مذہب مرزا صاحب و آبائے مرزا صاحب؟

جواب ــــ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب اولاد سلم اور تور سے ہیں اور ترکمان کہلاتے ہیں۔ اجداد ان کے شیعہ مذہب نہ تھے۔ مگر اس ملک کا آدمی اور ترکمان لوگ اکثر تفضیلی ہیں۔ اور مرزا صاحب کو نظر سیر اور تاریخ پر تھی۔ ان کے نزدیک حقیقت خلافتِ امامت کی ثابت ہوئی۔ ماسوا اس کے کثرت صحبت ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حسام الدین معروف کے ساتھ اور بخشی محمود رضا خاں کے ساتھ اسی امر کی باعث ہوئی کہ وہ علی پرست ہوگئے۔ اور غلو ان کا ہنگام مباحثہ تھا نہ یہ کہ وہ تبرائی ہوں۔ بزرگوں میں مرزا صاحب کے کسی کو ہم کیش مرزا نہ سُنا۔

تیسرا سوال کہ کس سنہ میں شعر کہنے شروع کیے؟

جواب ــــ سنہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر عنفوان جوانی سے طبیعت نے راہ دی اور یہی مشغلہ رہا۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔

چوتھا سوال ہرمزد عبد الصمد کا معاملہ؟

جواب ــــ آپ کی زبان سے میں نے اکثر سنا تھا کہ وہ ان کا استاد تھا۔ وہ تاجر تھا۔ ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے ایک گھر بنایا تھا۔ پس اگر مرزا صاحب جھوٹے تصور کیے جائیں تو یہ روایت بھی بے اصل محض ہے۔ اور جب یہ روایت بے اصل ہے تو پھر القا اور الہام کو ماننا پڑے گا۔ ایسا متعلم سوائے سروش غیبی کے کیسے فیض پذیر ہو سکتا ہے۔

پانچواں سوال کتب مصنفہ کی تدوین؟

جواب ــــ دیوان فارسی ۱۸۳۳ء، ۱۸۳۵ء میں ترتیب ہو گیا۔ انطباع کا زمانہ مجھے یاد نہیں وہ الواح طبع سے مل سکتا ہے۔ دیوان اردو ۱۸۴۹ء کے بعد ترتیب پذیر ہوا۔ مہر نیمروز شاید ۱۸۵۱ء میں شروع ہوئی۔ اور اسی سنہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں شرف باریابی ارک پایا اور حکیم احسن اللہ خاں کے تقاضے سے تاریخ نگاری شروع کی ورنہ بادشاہ ایسے اشتیاق و اشتغال سے مبرا تھے۔

چھٹے سوال کا جواب بھی اسی پانچویں میں آگیا۔

ساتواں سوال۔ کلکتے میں طرح باد مخالف اور اس کی وجہ؟

جواب ــــ اہل پورب اور بنگالہ بوجہ بے مذاقی کے قتیل پرست اور مادھو رام ستائی ہیں اور مرزا صاحب کو اہل ہند کی نسبت کلام رہا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے اس شعر سے مستفاد ہے۔ شعر:-

لیک نباید ز من کہ در گفتار　　مدحت لالہ سوردا س کنم

اور باعث اس تفضیح کے چند بے تمیزانِ کلکتہ ہوئے، کہ وہ لوگ آداب مہمان نوازی اور مہر شناسی سے عاطل ہیں۔ بجائے تکریم ضیف تسویم و تضحیم ضیف کی گئی۔ اس تقریب کے باعث مولوی عبد القادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب نام دو بزرگ کلکتہ تھے اور یہ دونوں آدمی کالج گورنمنٹ میں معلم اور مشاہیر سے تھے۔ ترتر مکان صاحب نے شاہنامے کی تصحیح کہ گویا جس کو تفضیح کہنا چاہیے ان دونوں صاحبوں کے واسطے سے کی تھی۔ بجملہ اس بنا پر باد مخالف لکھی گئی۔

آٹھواں سوال۔ نواب مصطفےٰ خاں کو ہدایت غیبی؟

جواب: حالت غیبی رفیق حال ہوئی مگر حالت شیبی سے پہلے رنگ جما ہوا تھا۔ اگر رم جو منہیات میں داخل نہیں ہے تو بنت العنب سے مضائقہ کیجیے۔ شعر:-

ہو گی چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی　　پیتے تھے روز ابر و شب ماہتاب میں

مگر ہاں میاں انصاف کہ میاں عبد الغنی صاحب سے خانقاہ میں جب تجدید بیعت کی اور خود بھی کسی قابل نہ رہے تو توبہ کامل حاصل ہوئی

اور شاید پاس داشت حدیث خوانی ملحوظ خاطر اسلام شکوہ رہا ہو۔

— نواں سوال۔ مولوی الطاف حسین حالی کی روایت ؟

جواب — واقعی مرزا صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ دقتِ اشارات و معنی و غرابتِ ترکیب ہم اردو میں نہ کرتے اگر طباع افہام کو ایسا ناقص جانتے۔

محبا! میں احباب کی خدمت گذاری کو عموماً حاضر ہوں، اور آپ کی اس مہجور پرستی کا شاکر، جب کام ہو تو آپ ارقام فرمائیں اس کا سرانجام میرے لیے سرمایۂ مسرت ہے۔ مگر اس معاملہ خاص میں باہمہ بے بضاعتی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہ امر بے ممکن نہیں۔ اگر آپ تصنیف کی تکمیل چاہتے ہیں تو دو چار روز کے لیے مع اس تالیف شریف کے یہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ یہ امر نہ دشوار اور نہ شاید آپ کو اس میں جائے انکار۔ ریواڑی سے لوہارو تک میرے ہاں کی سواریاں حاضر ہو سکتی ہیں۔ اور لاہور سے ریواڑی تک ریل کی سبیل ہے زاید و السلام والاکرام میں نا تندرست ہوں۔ ورنہ اپنے ہاتھ سے لکھتا۔

المعذور معاف علاء الدین

مکتوب شمس العلما منشی ذکاء اللہ دہلوی

جناب من!

جب مجھے آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصور آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اب تک شایع کیوں نہیں ہوا۔ مگر جب یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ کو بندے سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت سے شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں وہ نی مافی کرنے کو تیار ہوں گے اس لیے ایک عذاب جان بن جائیں گے۔

اب مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ ربنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ "صہبائی شعر کہنا کیا جانے نہ اس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں نہ جیل خانے میں پڑا۔" طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس جگہ بیچتا تھا۔ اس لیے قصاید میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے۔ بلکہ ان پر نمبر لگائے ہیں سیزدہم۔ دہم۔ نہم۔

میرے نزدیک فقط اُس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ فضائل اور اخلاق سے بحث نہ ہو میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر مرزا قتیل کے شاگرد ہیں۔ وہ مرزا کو یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں میں۔ غالب کا خود قول تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی کا چرچا ہوا دو شاعر ہوئے ایک غالب اور دوسرا خسرو۔

ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم اور ایک اہل شیراز کا سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لیے دیا۔ اس نے ایک دفعہ دیکھ کر واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ "دریں خرافات اوقات ضایع نکنیم، مانمی دانیم کہ در کدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است۔"

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شیرازی سید باقر علی جو عیسائی ہو گیا تھا۔ جان مور نام رکھتا تھا۔ وہ ذوق مرحوم کے پاس جاتا تھا وہ اس سے مشکل شعر مرزا کے پوچھتے تھے۔ وہ فوراً معنی بتا دیتا اور محاورہ کی ایک دو غلطی۔ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم و نثر اُس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسے کے تربیت یافتوں کو بجا ہے اور منشی اور دبیر جو پہلے زمانے کے ہیں وہ خود بھی نہیں جانتے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

غالب کی مثنوی بے نام کا نام

سید مرتضیٰ حسین فاضل

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں غالب کا تذکرہ کرتے ہوئے نو کتابوں کے نام لکھے، گل رعنا میں وہی نام نقل کر دیے گئے مولانا حالی نے سب سے پہلے غالب کی تصنیفات، و تالیفات کا ضمنی و سرسری جائزہ لیا، مگر ان کا موضوع نہ سوانح تھا نہ تاریخ، اس لیے تالیفات کی تحقیق اور ان کے بارے میں تفصیلات بھی بنیادی طور پر پیش نظر نہ رہے لیکن ان معلومات کے ماخذ اولین میں جہاں اور بہت سی کام کی باتیں ہیں وہاں دو ایسی کتابوں کے بارے میں اشارے بھی ہیں جن کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو مولانا کا یہ کہنا:

" چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا"

(ص ۱۵۷، یادگار غالب)

دوسرے یہ تحریر کہ:

" بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام غالباً " دمغ الباطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا، اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی، بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا"

(یادگار غالب ص ۷۰)

ابھی تک " ناتمام قصے" کے تفصیلات تو معلوم نہیں ہو سکے، مگر مذکورہ بالا مثنوی پر کنجکاوی منزل تحقیق تک پہنچ گئی۔

حالی کے بعد جناب مہر صاحب نے سوانح و سیرت غالب کی طرف پوری توجہ کی، لیکن " غالب" طبع اول (و نیز بعد) میں " مثنوی دعائے صباح" کی طرح اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا، جناب اکرام صاحب نے غالب نامہ طبع دوم ص ۶۰ حاشیے میں اس مثنوی کے دو شعر لکھے مگر نام نہ لکھا، پھر ص ۶۲ پر لکھا:

" اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ مرزا سے دمغ الباطل (کذا) کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا"

پھر چوتھے ایڈیشن میں غلطی طباعت، کی اصلاح فرمائی گئی اور ص ۱۲۱ پر " دمغ الباطل" لکھا۔ مالک رام صاحب اس سلسلے میں خاموش ہیں اور کوئی نام نہیں بتلاتے، مسعود حسن رضوی صاحب نے " متفرقات غالب" میں یہ مثنوی شائع کی تو ان کے سامنے رسالہ علم جیدری در عقائد سلاطین تیموری" تھا، اور نام کی تحقیق، حالی کی غلط فہمی پر بحث بھی فرمائی لیکن اسے " بے نام مثنوی" ہی قرار دیا۔

میں نے ۱۹۴۶ء میں " رسالہ علم حیدری اور مثنوی شوکت حیدری" صفی دار المطالعہ لکھنؤ میں دیکھی اور مثنوی تو پوری نقل کی لیکن نثر کے رسالے کو نقل کرنے اور نوٹس لینے کی باری نہ آسکی، مگر زیر بحث مثنوی کا نام لکھ لیا۔ پاکستان آنے کے بعد بارہا ارادہ کیا کہ اس سلسلے میں کچھ لکھوں مگر ماخذ کو دوبارہ دیکھے بغیر ہمت نہ پڑی، بعض احباب کو ضرور بتا دیا تھا۔ حبیب محترم جناب خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی نے چند وقیع کتابیں عاریت دیں جن میں، رسالہ علم حیدری، مثنوی شوکت حیدری، مثنوی شیعیان علی۔ بھی ہیں۔ اس درمیان جناب اکبر علی خاں صاحب نے فرمائش مضمون فرمائی۔ ہم نے اس مضمون میں ان تینوں کتابوں کے پہلے مطبوعہ لکھنوی نسخوں ۱۲۷۰ھ کو سامنے رکھا ہے۔

جناب مسعود حسن صاحب نے مثنوی کے بارے میں بڑی کارآمد بحث فرما کر اس سلسلے کی اکثر مثنویوں کے نام اور صحیح تفصیلات لکھی

ہیں۔ لیکن جناب امداد صابری نے "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا" میں، ایک اور ہی قصہ لکھا۔ "غیر ملک سے انگریزوں کے خلاف مدد لینے کی سعی" کے عنوان سے فرماتے ہیں:

"۱۸۵۱ء میں مرزا حیدر شکوہ .... اور واجد علی کے قابل اعتماد مانے جاتے تھے، جن کو ایک ہزار روپیہ وظیفہ ملتا تھا، اور واجد علی شاہ کے ہم مذہب یعنی شیعہ بھی تھے۔ ان سے بہادر شاہ کی گفتگو ہوئی، اور جو حرکتیں بہادر شاہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے مرزا حیدر نے بادشاہ کو مشورہ دیا، کہ ہندستان میں اپنی طاقت و اقتدار بڑھانے کے لیے واجد علی شاہ سے یک جہتی اور رابطہ قائم کیا جائے تاکہ دونوں متحد ہو کر اور طاقت ور بن کر شاہ ایران کو اپنا ہمنوا بنا کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور بقول حکیم احسن اللہ خاں ان سے مل کر اپنا ملک فتح کر لیں۔

بہادر شاہ کو یہ طریقہ پسند آیا، اس پر غور کیا گیا کہ اتحاد کا طریقہ کیا اختیار کیا جائے، مرزا حیدر کی رائے ہوئی کہ شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جائے گا تو واجد علی شاہ اور شاہ ایران پر بھی اثر پڑے گا اور آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جائے گا۔"

انگریزوں کی مخالفت کے لیے شیعہ بننے کا اعلان

بہادر شاہ ظفر، انگریزوں سے انتہائی برگشتہ اور نالاں تھے، انھوں نے بغض معاویہ کے جذبہ میں آکر اعلان لکھ کر مرزا حیدر کو دے دیا، کہ میں نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے، مرزا حیدر نے اس کو لکھنؤ میں جا کر مجتہد العصر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ خبر لکھنؤ کے ہر محلے اور ہر بازار میں پھیل گئی۔ لکھنؤ والے بہت خوش ہوئے لیکن دلی والوں میں کھلبلی مچ گئی کہ انھوں نے اس مصلحت وقت کو مذہب کے مقابلے میں کیوں اہمیت دی بالآخر بادشاہ نے اپنے انکار کی تصدیق میں ایک کتاب "حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت" مرتب کی اس پر مرزا غالب نے بادشاہ کو اس اتہام سے بچانے کے لیے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا۔"

(کتاب مذکور طبع دہلی ۱۹۵۹ء ص ۱۰۷ ببعد)

مجھے اس عبارت سے بحث نہیں، اگرچہ امداد صابری نے "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" اور مولانا حالی کی یادگار غالب کا حوالہ دے کر یہ سب کچھ لکھا ہے مگر یہ ضرور عرض کرنا ہے کہ واقعہ یوں نہیں۔ بلکہ یہ ہنگامہ دسمبر ۱۸۵۳ء سے جنوری ۱۸۵۴ء کے درمیان میں شروع ہوا، اور حالی سے آفاق تک سب نے اس کی صحیح وجہ بادشاہ کی بیماری و صحت یابی ہی بتایا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت آنے والے معاصر بیانات و دستاویزات کی بنا پر مشتبہ، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غلط ہو جائے گی تو شاید بے جا نہ ہو۔

مثنوی "دمغ الباطل" نہیں "کلمات طیبات" ہے جس کی تالیف کا پس منظر یہ ہے کہ بادشاہ ۸ رجولائی ۱۸۵۳ء عید ۱۲۶۹ھ (غالباً) میں بیمار ہوئے، دوران علالت میں مرزا ملازمت دربار کی وجہ سے قلعے جاتے اور مزاج پرسی کے لیے بھی حاضر ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کو علالت کے تفصیلات سے براہ راست علم تھا، مگر انھوں نے زیادہ تاثر کا اظہار نہیں کیا صرف منشی بخش حقیر کے نام جو خطوط ہیں، ان میں ذرا مفصل حال ملتا ہے، اور وہ بھی کسی گہرے تاثر کی نشان دہی نہیں کرتا، مثلاً ۲۱ر اگست ۱۸۵۳ء کو لکھتے ہیں:

"بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو، اور اگر تم نے پوچھا ہے تو میں کیا لکھوں دست موقوف ہو گئے، مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں، تپ جاتی رہی، مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے، ہچکی اس شدت کی نہیں رہی، گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکار سی آتی ہے۔ ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں، اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں، اس ہیئت سے برآمد بھی ہوتے ہیں، قلعے ہی قلعے میں پھر کر، پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصور کیجیے اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے، بہرحال جب تک سلامت رہیں غنیمت ہے۔" (۱۶ر ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ، بروز یکشنبہ)

۲۹ر ذی الحجہ، ۲ر اکتوبر کو لکھتے ہیں:

"اب سنتا ہوں کہ حضور، بعد محرم جشن غسل صحت کریں گے۔"

۲ر محرم، ۶ر اکتوبر کو لکھا:

"بعد محرم سناجاتا ہے کہ جشن غسل صحت ہوگا۔ بادشاہ اچھے ہیں رہا ضعف، وہ لازمۂ عمر ہے۔"

مرزا کے ان خطوں سے بادشاہ کی بیماری کا ایک ہلکا سا خاکہ، اور تھوڑے تفصیلات معلوم ہوئے۔ رسالہ علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری" کے مؤلف محمد حیدر شکوہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ ان دنوں بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جسے خود بادشاہ کی لفظوں میں سنیئے:

"نور چشم راحت جان، مرزا حیدر شکوہ بہادر مورد تفضلات بودہ بدانند کہ ہر دو علم، صرف از اعتقاد غلامان غلام جناب حضرت علم دارگاہ رسانیدہ ام، اگر قبول افتد زہی عز و شرف۔ از طمع دنیا د ران نہ بیداد (کذا) ونمی فہم، صرف برائے آسودگی دین، کسی نمی داند کہ عنایت، چہ قدر بریں احقر شدہ، چند بار بزیارت شدہ (کذا) قابل اظہار نیست، الّا بروقت ملاقات خود ما خواہیم فرمود۔ ہر شخصے کہ از اہل بیت حسدمی داشت بر و لعن دوام باد بیش باد، ایں ایمان است فقط"

اس خط کے بعد حیدر شکوہ کلکتے سے دہلی آئے اور دربار میں حاضر ہوئے، تو بادشاہ نے اپنے خواب کا بیان اور "تعمیم عزم بنائے تعزیہ خانہ" (علم حیدری ص ۳) کا تذکرہ کیا اور جناب سلطان العلماء کے نام ایک خط مرحمت فرمایا، علم مرزا محمد نور الدین حیدر بہادر کے ہاتھ لکھنؤ بھیج چکے تھے حیدر شکوہ لکھنؤ آئے اور ۱۷ ربیع الاول کو وہ علم شاہی اہتمام سے "درگاہ" میں نذر کیا گیا۔

مثنوی شوکت حیدری میں "آغاز ماجرا" یوں ہے:

رہ دین چو دریافت آن بادشاہ — طلب کرد ما را بصد عز و جاہ
مرا بسکہ با خویش ہمراز دید — زحضار بدکیش خلوت گزید
چو محفل تہی شد، زہرا ہر من — بہ فرمود از من دران انجمن
کہ یک روز در خواب نوشین ما — ہدایت گن دین و آئین ما
درآمد، علمدار سبط نبیؐ — مسمّیٰ بہ عباسؓ ابن علیؓ
بہ تلقین زبان ہدایت کشود — مراد رغلامان حیدرؓ نمود
بہ تعبیر آن گشت چون اہتمام — ہمان وقت با اعتقاد تمام
بہ آل محمدؐ تولّا نمود — ز اعدای آنہا تبرّا نمود
بہ شکرانۂ آن علم ساختہ — زبانی چو افسر بہ سر داشتہ
فرستاد، در لکھنؤ بادشاہ — پئے نذر درگاہ عرش اشتباہ
دگر شقۂ خاص خیر اکتساب — بنام جناب ہدایت مآب
بہ علم و عمل مقتدای انام — سمیّ محمد علیہ السلام
بہ ما مرحمت گشت واز دست ما — رسیدہ بہ درگاہ آن مقتدا
چو در لکھنؤ آمدم از حضور — فریبی نمودند اصحاب زور
چنان طبع را منحرف ساختند — کہ بر کردۂ خود نہ پرداختند
چو آن قوم بدکیش ناچار کرد — ز ارسال و اصدار انکار کرد
چو توقیع شاہی غلط ساختند — بنام من این قرعہ انداختند

مثنوی شوکت حیدری ص ۵ بعد

یہ علم ۱۷ ربیع الاول ۱۲۷۰ھ کو شاہی جلوس کے ہمراہ سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب کے ہاتھوں درگاہ حضرت عباس واقع کشمیری محلہ لکھنؤ میں نصب کیا گیا اور وہیں مجلس میں مرزا نور الدین نے بادشاہ کے نام سے مرثیہ پڑھا۔

شاید اس سلسلے میں اشتہارات و اعلانات کے علاوہ افواہیں بھی پھیلائی گئیں۔ اس کا رد عمل یہ ہوا کہ اکابر و علمائے دہلی نے بادشاہ سے ان کے عقاید اور تبدیلیٔ مذہب کے بارے میں بازپرس کی تو بادشاہ نے اپنے سنی ہونے کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہا کہ "علم" اور مرثیہ کا قصہ میرے اوپر بہتان ہے، یہ سب کچھ مرزا نورالدین اور محمد حیدر شکوہ نے کیا اور میرے سر تھوپ دیا۔

بظاہر اس سلسلہ میں تین اقدامات کیے گئے، ایک تو یہ کہ بادشاہ نے "امین الدولہ سمین فرزیز بہادر، دلیر جنگ، صاحب ایجنٹ شاہ جہان آباد کو ایک خط لکھا:

"امارت و ایالت مرتبت، عمدۂ امرای نامدار، زبدۂ عقلای باوقار خیر اندیش، دولتخواہ بلا اشتباہ، فدوی خاص بعقیدت اختصاص، لایق العنایت والاحسان!

بتفضلات بادشاہی مباہی بودہ بدانند! دریں ایام بملاحظۂ قطعات سوالات علما و مشائخ این شہر بوضوح پیوستہ کہ از روی اخبار و خطوط لکھنؤ بدریافت این مردم رسیدہ کہ بتاریخ ششم ربیع الاول مرزا حیدر شکوہ بہادر، و مرزا نورالدین بہادر، شیعی مذہب، مبیرگان مرزا سلیمان شکوہ بہادر، در لکھنؤ علمی بکمال تجمل بہمراہی عمائد آن شہر برداشتہ بدرگاہ حضرت عباس بردند۔ و فضیلت پناہ، سیادت دستگاہ سید محمد مجتہد مذہب شیعہ، بدست خود علم مذکور را در درگاہ نصب نمودہ۔ و مرزایان مسطور بہ نسبت ابلاغ آن علم بہ بندگان والا کردند۔ و نیز، مرزا نورالدین بہادر بر منبر برآمدہ مرثیہ بزبان اردو کہ متضمن بی ادبی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بودہ در مجمع کثیر بآواز بلند برخواندہ، در مقطع آن مرثیہ تخلص حضور پرنور درج کردہ و قطعۂ شقۂ مہری خاص مشعر ترک کردن مذہب اہل سنت و جماعت و اختیار نمودن مذہب اہل تشیع و وثوق ارادۂ تعمیر امام بارہ و اختیار تعزیہ داری بردوام موسومہ مجتہد مذکور ظاہر ساختہ، بندگان والا را باتہام مذہب روافض متہم و بدنام ساختند

و چون این ہمہ غلط و بی اصل و محض افترا و بہتان است، زیرا کہ بعنایت الٰہی در عقیدۂ راسخۂ حضور کہ آن بطریق اہل سنت و جماعت است، ہرگز فتور و فساد راہ نیافتہ۔ و کدام مرثیہ محتوی مضمون سب و طعن نسبت بخلفائے راشدین، کہ اساطین دین و مقتدایان اہل یقین اند، بر زبان الہام بیان نرفتہ، و شقۂ خاص باشعار امور خلاف شرع بنام مجتہد مذکور ہرگز ریختۂ کلک گوہر سلک نگردیدہ این ہمہ تصنع و دروغ آرائی مرزایان مذکور است کہ بحضور پرنور منسوب کردہ اند۔

ولیکن بیاد می آید، کہ ایشان ہنگام حضوری خود دریں جا، این معنی بطریق حکایت و تذکرہ معروض داشتہ بودند کہ موافق مذہب خود برای حصول صحت بندگان والا، نذر قرار دادہ ایم کہ بروقت غسل صحت حضور از طرف خود علمی طیار ساختہ، در شکریۂ صحت حضرت اقدس بدرگاہ حضرت عباس خواہیم داشت، لہٰذا این ریح مذکور نہ کردہ بودند، و نیز اکثر شقہ جات در مقدمۂ ذاتی خود ہا سجل کنانیدہ بودند ولیکن بنام فضیلت پناہ مذکور کدام تحریر کہ بہ مہر خاص مزین باشد ہرگز بوقوع نیامدہ شاید مرزایان مسطور بنام کدام مصلحت و منفعت خود این افترا بر حضور کردہ باشند و تحریری کہ بی اصل و باطل مرتب کردہ دادہ باشند و مجتہد مذکور بمقتضای نیک نہادی خود آن را در پایۂ صدق دانستہ شہرت دادہ باشند دریں صورت ملاحظۂ آن شقہ کہ نزد آن سیادت دستگاہ رسانیدہ اند ضرور ترافتادہ، تا معلوم شود کہ مضمونش چیست، و نگارندہ اش کیست۔ و بعد دریافت این حال تدارک انسداد رخنۂ این فساد بطرز مناسب بعمل آید کہ بار دیگر کسی جرأت این افترا پردازی بہانہ گردد۔

لہٰذا، زیب ارقام می باید کہ آن امارت و ایالت مرتبت بمقتضای دولت خواہی و خیر اندیشی بہ جہت رفع این اتہام و بدنامی بندگان اقدس خطا انگریزی خود بنام ایجنٹ بہادر لکھنؤ بمزید تاکید بر نگارد کہ شقۂ جعلی مہری خاص، از مجتہد مذکور بہر نوع کہ تواند طلبیدہ زود تر ارسال دارد۔

ہر آئینہ این معنی موجب استرضای خاطر عاطر خواہد شد ـــــ زیادہ تفصیلات شناسد۔ فقط"

سلطان العلماء نے اس کے جواب میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو ایک خط بہادر شاہ کو لکھا جس کا متن علم حیدری ص ۷ پر درج ہے خلاصہ یہ ہے:

"آپ کے آباؤ اجداد شیعہ تھے[1]۔ آپ کے سابقہ خط نے اس کی تائید مزید کی تھی، لیکن جس طرح بادشاہ غفران پناہ، بہادر شاہ، طاب ثراہ کو اعلان تشیع کے جرم میں شہید کیا گیا[2]۔ اسی طرح جناب والا کے اس اقدام کے بعد ہنگامے کھڑے ہو گئے اور دشمنوں نے یہ چاہا کہ آپ کا نام بھی خطبے سے نکال دیں۔ عین اسی عالم میں آپ کے خط کی نقل اجنسٹ کے نام آئی مجھے پڑھ کر حیرت ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سابقہ خط میں فریب کا امکان ہے۔ اسی طرح اس خط کو تقیہ پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ خط جعلی ہے؟ اس کا جواب مرزا محمد شکوہ بہادر اور مرزا نور الدین صاحبان سے ہے۔ ان کے خطوط آرہے ہیں اور چونکہ اس سلسلے میں تحقیق ہو رہی ہے، اسلیے اصل تحریر تو ابھی واپس نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بعد تحقیق جس طرح بھی جناب والا کا خط واپس کروں گا، یقین ہے جناب والا بھی میرا جواب واپس کر دیں گے۔

اس کے ساتھ ہی سلطان العلماء نے رزیڈنٹ کو اسی قسم کا جواب لکھا، مرزا حیدر شکوہ نے بھی رزیڈنٹ کو اپنے آباء اجداد کے شیعہ اور حالت تقیہ میں ہونے کا ذکر کرتے ہوئے حقیقت واقعہ لکھی، جس کے بعد فیصلہ انہی کے حق میں ہوا، کچھ دنوں کے بعد ایک رسالہ "بطور اعلام از طرف بادشاہ جم جاہ و چند اشعار، بطور مثنوی بزبان فارسی باندراج تخلص بادشاہی کہ متخلص بہ ظفر اند ـــــ کلمات طیبات ـــــ مخاطب ساختہ طبع کنانیدہ، جا بجا مشتہر کی گئی"۔ (علم حیدری ص ۱۲ سطر ۴ بعد)

(۲) رسالہ کے آخر میں ص ۲۰ پر ہے "مثنوی شوکت حیدری در جواب کلمات خبیثات خوارج دہلوی" پھر علی بخش کے مطبع کی چھپی ہوئی اٹھارہ صفحات اور ۱۶۲ شعروں کی مثنوی ہے، اسی مثنوی کے ص ۱۸ پر مصنف کا قطعہ تاریخ ہے۔

ازین نظم حق، مفتری شد ذلیل　　بر اوج مراتب شدہ مثنوی
ز دہلی چو نظم دروغ آمدہ　　کہ آن پر معایب شدہ مثنوی
چو حق بود سویم، نوشتم جواب　　بر این عجایب شدہ مثنوی
شدہ غالب کل غالب معین　　بر ان نظم غالب شدہ مثنوی

ان طویل اور مفید اقتباسات سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ چونسٹھ شعروں کی وہ مثنوی جسے متفرقات غالب میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کا نام "کلمات طیبات" تھا، اور غالب نے بادشاہ کے نام سے کہی تھی:

بو ظفر، ملک و دیں خدا داداست　　داد خواہیم و کار ما داد است

اور وہ "اعلام نامہ" جس کا ذکر حقیر کے نام مرسلہ خط میں ہے:

"وہ مثنوی اور اعلام نامہ میں نے تمہارے پاس بھجوا دیا ہے"۔ (نادرات ص ۵ حصہ مکتوبات)

مثنوی سے جداگانہ چیز ہے۔

اس پوری بحث کے بعد پنج آہنگ طبع دوم دہلی ص ۲۲۴ اور طبع نول کشور طبع سوم ص ۲۲۸ کا وہ بے تاریخ خط بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور یقینی طور سے اس کی تاریخ بھی معین کی جا سکتی ہے جس میں مرزا نے انتہائی عاجزی و شرمندگی کے ساتھ "مجتہد العصر، سلطان العلماء، مولوی سید محمد صاحب" کو اس مثنوی کی معذرت میں جواب دیا ہے:۔

---

[1] یہ بات درست نہیں ہے اس خاندان میں بہادر شاہ اول کے علاوہ کوئی بھی بادشاہ شیعہ نہیں ہوا۔ (نگار)

[2] یہ بھی خلاف واقعہ ہے، بہادر شاہ طبعی موت مرے ہیں اور طویل عمر پائی تھی۔ (نگار)

"داد آنست کہ اگر ازیں پرسش باندازِ بازپرس بودی ہم راہ سخن بر من فروبستی، و لرزہ پیکر مرا خرد و در ہم شکستی، چون از روی مہر و آزرم است، چرا نہ گویم، و اگر گویم ہم از من بر من ستم رود، و در چار انجمن گفتہ شود، کہ — فلانی در گناہ دلیر است و در پوزش ناپروا — زبان سخن سرای آلہ گہر سفتن است، نہ ساز آہنگ ناسزا گفتن. نمی گویم کہ بد گفتن گناہ نیست و ہی گویم کہ گناہ من جز پذیر فتن فرمان شاہ نیست. "تا درین ناخوش ہنگام و ناروا ہنگامہ دیگر چہ فرمان رود"

راست می گویم و یزداں نہ پسند و جز راست حرف ناراست سرودن روش اہرمن است در نگارش مثنوی، مضمون از خسرو است و لفظ از من، چنانکہ در رامش زخمہ از مغنی و صدا از تار — و نشگفت کہ بایں ہمہ از زبان من نبود و دیگراں مصرعی چند افزودہ باشند"

قطع نظر اس سے کہ خط کس قدر دل کش عبارت، اور کیسے پیارے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ ہمیں مرزا کے نفسیات، بادشاہ سے مرزا کا قلبی تعلق، سلطان العلماء کی تحقیق و تفتیش کے علاوہ ایک بالکل نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ "کلماتِ طیبات" میں کوئی اور شخص بھی ساجھے دار ہے[1]

[1] نگار کو فاضل صاحب سے اختلاف ہے اس لیے کہ غالب نے "مصرعی چند افزودہ باشند" کہا ہے جس میں احتمال پایا جاتا ہے یقینی طور پر کہنے کی جرأت انھیں بھی نہ ہوئی ممکن ہے مختلف مصالح سے انھوں نے یہ جملہ لکھا ہو اور حقیقت حال اس کے قطعاً خلاف ہو جو غالب کے مزاج کے پیش نظر قرین قیاس ہے۔

چھیڑ غالب سے چلی جائے
غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بے حد دلچسپ انداز سے پیش کرنے والی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے — قیمت ۵ روپے
نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

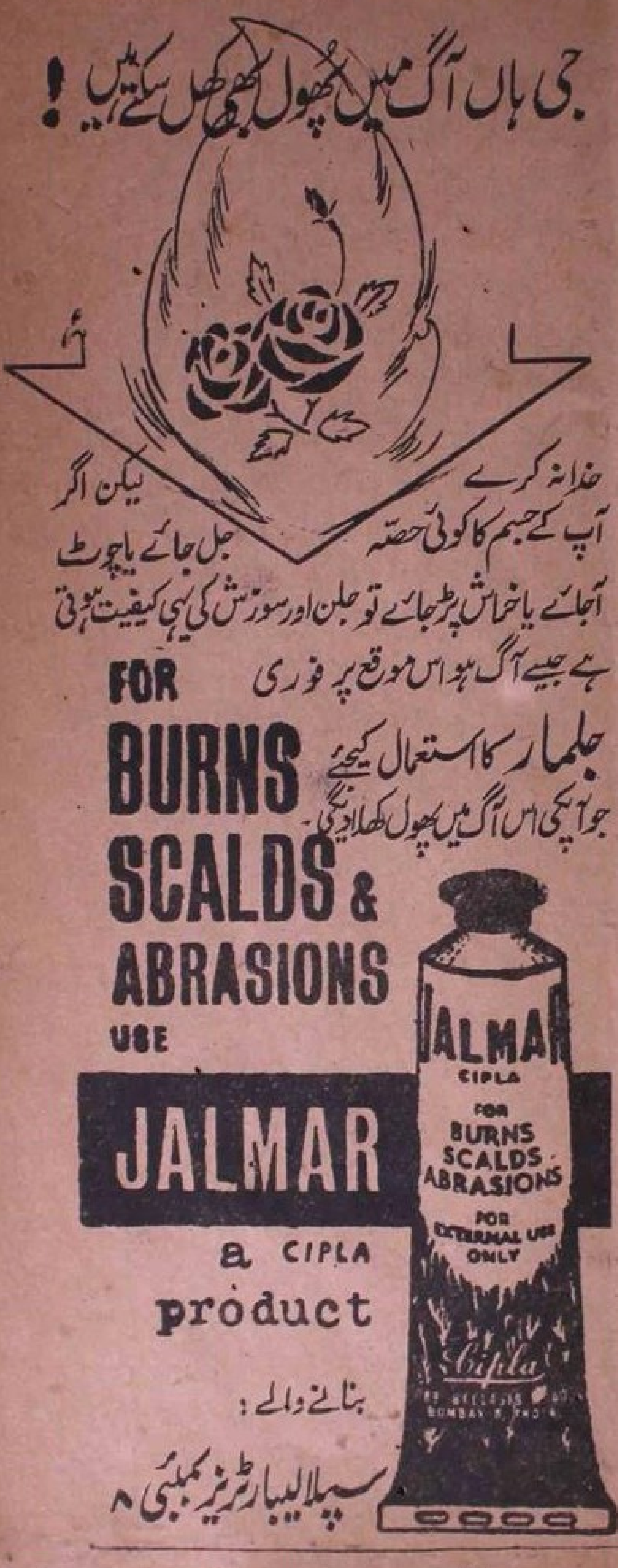

مزاح:

غالب انڈ گوئٹے

حاجی لق لق

مجھ سے روایت کیا کامریڈ باری علیگ نے اور انھوں نے سُنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سُنائی آپ بیتی اور اب آپ مجھ سے سنیے "مرزا بیتی" میرے الفاظ میں اور اس کا ثواب پہنچایئے غالب اور گوئٹے کی ارواح کو اور دعا کیجیے میرے حق میں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے ان ایام کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پریتم سنگھ سے ہوئی اور دونوں تین چار روز تک ایک قہوہ خانے میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب سے کہا کہ بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں اٹلی جانا چاہتا ہوں اور میرے پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کچھ روپیہ مجھے بطور قرض دے دیں یا کسی دوست سے دلا دیں تو میں اٹلی پہنچ کر تھوڑے ہی عرصے میں یہ قرض چکا دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا "قرض؟ سردار صاحب! یہاں پردیس میں کون ایسا ہندستانی فارغ البال ہو سکتا ہے جو اپنے اللّے تللّوں کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے؟"

سردار جی: "مجھے کوئی زیادہ روپیہ نہیں چاہیے۔ صرف......"

مرزا صاحب: (بات کاٹ کر) "اجی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے۔"

سردار جی: (مایوسی کے لہجہ میں) "تو پھر کیا کیا جائے؟"

مرزا صاحب: "کیا کیا جائے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

سردار جی: (پُر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) "وہ کیا، وہ کیا؟"

مرزا صاحب: "وہ یہ کہ ہندستانیوں کی بجائے جرمنوں سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ جو بہت آسان کام ہے۔"

سردار جی: "وہ کیسے؟"

مرزا صاحب: "میں کل بتاؤں گا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لے آئیے۔"

سردار جی کی آنکھیں ان الفاظ کو سن کر چمک اٹھیں اور آپ مرزا صاحب کا پیشگی "شکریہ" ادا کر کے رخصت ہوئے۔

رات بھر سردار جی کو نیند نہ آئی۔ اور دوسرے دن وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی قہوہ خانے میں پہنچ گئے اور بے صبری کے ساتھ مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے اور قہوہ کی پیالی پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے:-

مرزا صاحب: "دیکھیے سردار جی! مرزا غالب ہندستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے؟"

سردار جی: "وہی نا جنھیں انڈین شکسپیر کہتے ہیں؟"

مرزا صاحب: (مسکراتے ہوئے) "نہیں نہیں۔ انڈین شکسپیر تو آغا حشر کاشمیری مرحوم تھے جو مشہور ڈراما نویس تھے۔ غالب ان سے بہت پہلے عہدِ مغلیہ میں گزرے ہیں۔ آپ کا نام اسد اللہ خاں تھا اور وطن دہلی۔ آپ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن عمر تنگ دستی میں گزری، آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا۔ اس لیے کبھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔"

سردار جی: "بالکل میرے چچا سرنام سنگھ کی طرح، ذیلدار تھا۔ دو سو بیگھہ زمین تھی، ضلع بھر میں عزت تھی۔ لیکن شراب نے بیڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے اُدھار نہیں دیتا۔"

مرزا صاحب: "ہاں ہاں بس غالب کی بھی یہی حالت تھی۔ لیکن تھا بڑا خوددار، مرتا مر گیا لیکن اُمراء کے سامنے نہ جھکا۔ اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ......"

سردار جی سر تو ہلاتے جاتے تھے لیکن دل میں سوچتے تھے کہ بات تو جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی، یہ مرزا صاحب غالب کا قصہ کیوں چھیڑ بیٹھے؟ آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مرزا کاظم نے ان کے دل کی بات کو بھانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموشی سے سنتے جایئے۔

مرزا صاحب: "غالب ایک فلاسفر شاعر تھے اور انھوں نے وہی زمانہ

پایا جو جرمنی کے فلاسفر شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئٹے بھی ...."

مرزا صاحب یہاں تک کہہ پائے تھے کہ سردارجی سے صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

سردار جی: "لیکن مرزا صاحب! جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے۔"

مرزا صاحب: "بالکل درست، اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ سنتے جائیے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مورخ، شاعر اور ادیب ہیں۔"

سردار جی: "میں اور شاعر؟"

مرزا صاحب: "بس آپ چپ رہیے، اور میری بات سنیے، آپ اتوار کے دن "ہومبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غالب اور گوئٹے کی شاعری کا موازنہ فرمائیں گے۔"

سردار جی: "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔ اور نہ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے واقف ہوں۔"

مرزا صاحب: "آپ اُردو زبان میں، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پنجابی زبان میں تقریر فرمائیے۔ بات صرف یہ ہے کہ بولتے جائیے۔ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے آپ واقف نہیں تو ان کا نام تو چنداں مشکل نہیں، ذرا کہیے تو!"

سردار جی: "غالب گوئٹے ——— غالب گوئٹے۔"

مرزا صاحب: "بالکل ٹھیک! آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے کہ "غالب اَنڈ گوئٹے" کہیے۔ انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں، جرمن میں اسے انڈ کہا جاتا ہے!"

سردار جی: "غالب انڈ گوئٹے ــــ غالب انڈ گوئٹے!"

مرزا صاحب: "واہ وا، خوب! اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے اسکالر ہیں۔ کل برلن کے اخبارات میں اعلان شائع ہوگا کہ ہندوستان کے مشہور اسکالر سردار پریتم سنگھ اتوار کے دن بوقتِ شام ہومبرگ ہال میں "غالب اور گوئٹے" کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہوگا وغیرہ۔"

سردار جی: "لیکن میں تقریر میں کہوں گا کیا؟"

مرزا صاحب: "تو جی میں آئے کہتے جائیے۔ بس بولتے جائیے اور ہر تین چار جملوں کے بعد "غالب انڈ گوئٹے" کہتے رہیے!"

اتوار کی شام آ پہنچی۔ ہومبرگ ہال جرمن "اہل ذوق" سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صدارت کی کرسی پر برلن کے ایک مشہور ماہرِ ادبیات جلوہ افروز تھے۔ ان کے ایک طرف سردار پریتم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے۔ تقریر کا وقت آ گیا اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے صاحب صدر نے اُٹھ کر حاضرین سے پروفیسر پریتم سنگھ کا تعارف کرایا۔ جس پر ہال خیر مقدم کی تالیوں سے گونج اٹھا۔

سردار صاحب نے اپنی تقریر شروع کی:-

"صاحبان! مرزا اسد اللہ خاں غالب دلی کے رہنے والے تھے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے اس لیے ان کی عمر تنگدستی میں گذری۔ دلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہے، وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے۔ چاندنی چوک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں ——— غالب اَنڈ گوئٹے!"

مجمع نے پُرزور تالیاں بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی، تو سردار صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"دلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے۔ میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں، اس لیے فصلیں اچھی نہ ہوئیں۔ اس سال گوردوارہ مہاراج کی کرپا ہے۔ نہر میں بھی پانی خوب رہا اور بارشیں بھی اچھی ہو گئیں، اُمید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ مثلاً بادشاہی مسجد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ، چڑیا گھر، عجائب گھر ــــ غالب انڈ گوئٹے!"

پھر تالیوں سے فضا گونج اُٹھی اور صاحب صدر کے لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ آپ نے میز پر ہاتھ مار مار کر مقرر کی "جادو بیانی" کی داد دی۔ سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوتی دیکھی تو ذرا زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنے لگے۔ فرمایا:

"غالب انڈ گوئٹے کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے شری دربار صاحب امرتسر کے درشن نہ کیے تھے کہ وہ ضلع گوردا سپور بھی نہ جا سکے، ورنہ وہاں کا گڑ کھا کر انھیں نانی پیسنے میں یاد آ جاتی۔ ضلع امرتسر میں ایک گاؤں چھیاری ہے۔ وہاں کے خربوزے بہت مشہور رہے۔ قصور کی میتھی بہت خوشبودار ہوتی ہے اور پھر غالب انڈ گوئٹے کے کیا ہی کہنے ہیں گویا انڈیا انڈ جرمنی!"

اس دفعہ سردار نے استاد کے بتائے ہوئے سبق "غالب اینڈ گوئٹے" پر "انڈیا اینڈ جرمنی" کا اضافہ کر کے کمال کر دکھایا۔ اور ان الفاظ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ سردار صاحب نے تقریر جاری رکھی اور دو تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا کہ:۔

"صاحبان اب غالب کے اشعار بھی سنیئے"۔

اس مقام پر مرزا کاظم نے اٹھ کر حاضرین سے جرمن زبان میں کہا کہ پروفیسر پریتم سنگھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔

سردار صاحب نے اپنے مخصوص قومی انداز میں یہ گانا شروع کر دیا:

اساں نت دے
پی اساں نت دے شرابی رہندی ہر شام کو رے نالے
اوہ وی جا کندھ کرے

مرزا کاظم کرسی سے اچھل پڑے۔ جس پر حاضرین نے تالیوں سے فضا میں گونج پیدا کر دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب نے ان اشعار کو بے حد پسند کیا ہے۔ سردار صاحب پھر بولے:

اسیں مر گئے
پی اسیں مر گئے، کمایاں کر دے پی ہر شام کو رے نالے
اجے تیرے بند نہ بنے۔ ہائے نی اسیں مر گئے

اس دفعہ بھی حسب معمول، کافی داد ملی۔ لیکن داد کی حد تو اس وقت ہوئی جب سردار صاحب نے "غالب" کی وہ مثلث سنائی جس کی ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا:۔

"موڑیں بابا ڈانگ دا لیا چھٹی"

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور سردار پریتم سنگھ مورخ، شاعر اور ماہر ادبیات کی تقریر ختم ہوئی۔ اس کے بعد مرزا کاظم اٹھے اور انھوں نے نہایت فصیح جرمن زبان میں بیان کیا کہ پروفیسر نے جس قابلیت کے ساتھ غالب اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے۔ شاید ہی آج تک کسی نے کیا ہو۔ کم از کم برلن میں تو آج تک ایسی تقریر نہ ہوئی ہوگی اور مجھے فخر ہے کہ میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے آدمی پیدا کیے ہیں۔ میں اس پوری تقریر کا ترجمہ کر کے برلن کے اخبارات میں شائع کرا دوں گا اور آپ دیکھیں گے کہ میرے وطن کے مایہ ناز ماہر ادبیات نے علم و فضل کے کیا کیا دریا بہائے ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے خیالات سننے کی تکلیف گوارا فرمائی ۔۔۔ اس کے بعد صاحب صدر اٹھے اور انھوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ حاضرین کی طرف سے ادا کیا اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا، بڑے بڑے ادیب، شاعر، اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو لپکے اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے دروازے تک لے جایا گیا۔ اسی رات کو مرزا کاظم پروفیسر پریتم سنگھ کو ٹرین پر سوار کرانے کے لیے اسٹیشن تک لے گئے۔ اور دونوں کی جیبیں نوٹوں سے پر تھیں۔

بقیہ "غالب سے متعلق دو خط"

نکات غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو اور کسی مضمون سے خبر ہی نہیں۔ اگر کوئی لڑکا بھی خان آرزو کی تصنیفات پر ایک نظر سرسری ڈالے تو اس کو مرزا کے نکات سے دس گنے زیادہ نکتے یاد ہو جائیں......

یہاں مجھے ایک پہیلی کہہ لینے دو۔ میں جغرافیہ طبعی میں اسے لکھ دوں گا کہ آزاد جو اول ہندوستان میں نیچرل پوئٹ ہے اس نے اس کے مضمون کو یوں ادا کیا ہے وہ مضمون یہ ہے کہ خشکی و تری میں ایک رشتہ زن و شوئی کا ہے جب تک پانی مٹی سے نہیں ملتا کوئی نبات پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا رشتہ ان میں دختر و مادر کا ہے یعنی خشکی تری کے پیٹ ہی سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی گود میں پلی۔ پہیلی یعنی چیستان ہوتی جائیں کہ وہ دو چیزیں کیا ہیں کہ جو جورو خصم بھی ہیں اور ماں بیٹیاں بھی ہیں۔

رامپور کا ماحول شعر و سخن

راز یزدانی (مرحوم)

دہلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا سب سے اہم دبستان رامپور رہا ہے۔ اس کی آواز شعر و سخن کی بڑی متوازن آواز ہے۔ رامپور کے ماحول شعر و سخن کا مطالعہ کیے بغیر گویا اردو شاعری کا مطالعہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ راز یزدانی مرحوم نے بڑی کاوش فنی مہارت اور دیانت کے ساتھ اس کی داستان بیان کی ہے جو داستان کی داستان ہے تجزیہ بھی۔

زیر ترتیب ۔۔۔ نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

ڈاکٹر عبادت بریلوی

انگلستان کے کتب خانوں میں راقم کو غالب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط درج ذیل ہے۔ یہ خط مولوی نعمان احمد صاحب تعلقہ دار مہیوا پرگنہ مہولی سیتاپور کے نام لکھا گیا ہے، اور اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور اس میں ان کا مخصوص انداز بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

"مولانا و بالفضل اولانا! فقیر میں جہاں اور عیب ہیں ایک عیب یہ بھی ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔ حکام سے بہ سبب ریاست خاندانی کے علاقے کے اکثر ملاقات رہتی ہے —— کبھی خوشامد کسی کی نہیں کی بھلا حضرت سے جھوٹ کیوں بولتا، اور آپ کی خوشامد کیوں کرتا۔ ایسا عاصی بھی نہیں واللہ باللہ کو تکیہ کلام جانتا ہوں۔ موحدہ کو اور واؤ کو تسمیہ جان کر از روئے قسم لکھا تھا، اور اب بھی از روئے قسم کہتا ہوں کہ نثر کے اس شیوۂ خاص میں اور مدعیوں سے آپ بہتر ہیں۔ آپ کو اپنا ہم فن اور ہم زبان سمجھ کر اپنا درد دل آپ کے سامنے کہا تھا۔ آپ نے غمخواری نہ کی۔ بلکہ اور الٹا آپ مجھ سے ملول ہوئے۔ خیر یہ بھی میرے بخت کی برگشتگی تھی کہ حضرت کے ذہن نے میرے خلافِ مقصود سے جہت انتقال کیا۔ برسوں سے خطوط فارسی میں لکھنے چھوڑ دیے۔ اب شہزادہ بشیر الدین بہادر نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی میں خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے۔ اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع۔ بہتر برس کی عمر، حواس مسلوب، قویٰ مضمحل، بصارت میں ضعف، ہاتھ میں رعشہ، نسیان مستولی۔ آپ کا خط آیا، پڑھا، جواب اور وقت پر حوالہ کرنے خط مع سرنامہ رکھ چھوڑا —— آج جو جواب لکھنے بیٹھا، خط نہیں ملتا۔ نہ بکس میں نہ کتابوں میں نہ طاق میں۔ حیران کہ اب کیا کروں۔ جو کچھ یاد آ گیا اس کا جواب لکھا —— قِران کے بارے میں عرض یہ ہے کہ، زہرہ مشتری کا ایک برج اور درجہ و دقیقہ میں برابر ہونا قران السعدین ہے۔ اور یہ قرانات جزئیہ میں سے ہے۔ اور اکثر واقع ہوتا ہے۔ اور یہ خبر —— ؟ حسب سلطنت موعود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قران پڑا ہو گا۔ بشرطِ آں کہ برج طالع میں یا وتد۔ ثلثہ یا مائل او تاز میں واقع ہو کہ نظر اس کے طالع موعودہ پر ہو۔ تو وہ افادہ صحت و عیش و عشرت کرتا ہے اور بس —— وہ قرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقالِ سلطنت ہوتے ہیں۔ از اں جملہ ایک قران تھا کہ زحل و مریخ میں فراہم ہوئے تھے۔ سراسر ہندوستان کی خاک اڑا دی —— قصہ مختصر جو بادشاہ صاحبِ قران کہلاتا ہے بہ اعتبار افراط جاہ و جلال و قوت حال کہلاتا ہے۔ طالع ولادت میں قران السعدین واقع ہونا ضرور نہیں —— صاحبِ قران مرادف شاہنشاہ ہے۔ سو بھی صرف سلاطین تمریہ میں جو شخص صاحب قران کہلائے ہیں۔ امیر تمر اور شاہجہاں۔ تتبع کلام اساتذہ سے معلوم ہوگا کہ خاقانی نے اپنے آپ کو صاحب قران لکھا ہے۔ اس طرح فقیر نے بھی لکھا ہے۔ ع

سزد گر تو لیسند صاحب قرانم

او میاں موت توقیع نویسی علت نہیں ہے۔ صاحبِ قراں کہلانے کی فقط

اسد اللہ [مہر]

شنبہ ششم اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء

از روئے احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔"

مہیوا پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور ۶ر اکتوبر سنہ ۶۶ء۔ بیرنگ ضروری جواب طلب۔ بخدمت مخدوم و مکرم مولوی نعمان احمد صاحب ادام مجدہٗ مقبول باد از اسد

(افکار کراچی)

غالب کا ایک گمنام شاگرد

نادم سیتاپوری

غالبؔ کے فن اور آرٹ کی پرکھ کے ساتھ "غالبیات" کے جن پہلوؤں سے ارباب ادب کی دلبستگی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں "تلامذۂ غالب" ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ غالب کی اس معنوی نسل میں کہیں کہیں غالب کے فن اور آرٹ کی اچھی جھلکیاں بھی نظر آ جاتی ہیں، جس طرح غالب وسیع الاحباب تھے اسی طرح ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا جو کم و بیش ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے جناب مالک رام نے شیرازہ بندی کر کے "تلامذہ غالب" میں بہت کچھ یکجا کر دیا ہے پھر بھی اس تصویر میں کچھ ایسے رنگ باقی رہ گئے ہیں جو ابھی تک ابھر نہیں سکے۔

حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری بھی غالب کے ایسے ہی گمنام اور غیر معروف شاگردوں میں ایک ہیں۔ جن کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خالی نظر آتے ہیں اور شاید ارباب نظر انھیں جدید تحقیق کی اس کسوٹی پر ابھی تک پرکھ نہ سکے جسمیں روایات و درایات کے اصولوں کی دیکھ ریکھ کچھ ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ فکر و تحقیق کی اس "محصور و مقید" فضا میں ظاہر ہے طالب جیسے گمنام عاشق غالب کے بارے میں مستند تحریری ثبوت کو فراہم کرنا صرف دشوار نہیں بلکہ بہت کچھ محال ہی ہے اور تحقیق کی تنگی داماں کا مداوا سوائے ان مقامی روایات کے دوسرا ممکن ہی نہیں ہے جنھیں میں بہرحال قابل اعتماد و مستند سمجھتا ہوں۔

طالب میرے شعور سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کچھ دور کی قرابت بھی تھی مجھے! ان کا مکان بھی میرے گھر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا مجھے ان تمام بزرگوں کی خدمت میں بھی حاضری کے مواقع حاصل رہے جنھوں نے طالب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں زیادہ تر نگاہوں سے اوجھل ہو چکے پھر بھی سیتاپور ان کے دیکھنے والوں سے خالی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اپنی نجی اور ذاتی یادداشتوں میں بھی طالب کا ذکر کیا ہے اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ! مثلاً قاضی الیاس حسین جعفری سیتاپوری اپنے خود نوشت حالات "اپنی کہانی اپنی زبانی"[1] (غیر مطبوعہ) میں طالب کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں،

> "یوم پنجشنبہ۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو حکیم سید محمد شریف صاحب طالبؔ ساکن سیتاپور محلہ بجگلہ دفعتاً ملک عدم کو روانہ ہو گئے —— یہ طبابت میں اپنے باپ حکیم مفتی سید اولاد علی صاحب (جرجیؔ) کے شاگرد تھے اور شاعری میں غالب دہلوی سے تلمذ تھا ان کی طبیعت نہایت تیز و حاضر تھی اور دواؤں کے افعال و خواص انھیں ازبر تھے اور تشخیص بھی اچھی تھی —— اردو کی نظم اچھی لکھتے تھے اور جلد —— یہ بھی اپنا یہ کمال اپنے ساتھ لے گئے۔"

قاضی الیاس حسین (اکتوبر ۱۸۸۴ء —— مئی ۱۹۵۰ء) نہ محض سیتاپور کی زندہ تاریخ تھے بلکہ طالب کے ہم جدی اور بنی اعمام میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب چند پشتوں کے بعد ہی طالب سے ملتا تھا قاضی صاحب نے اپنے خود نوشت حالات (اپنی کہانی اپنی زبانی) پورے تین سو چھ[۳۰۶] صفحات پر تحریر فرمائے ہیں جس میں اپنے خاندانی اور ذاتی حالات ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ تقریباً پچاس[۵۰] سال کے مقامی، موسمی، ملکی اور ادبی کوائف کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے اور شعر و سخن سے بھی کچھ لگاؤ تھا۔ کاتبؔ تخلص فرماتے تھے۔ لیکن شعری شعور کچھ زیادہ جاندار نہ تھا۔ صحیح معنوں میں مورخ و محقق بھی نہیں تھے لیکن ثقہ اور دیانت دار اتنے تھے کہ ان کی تحریرات پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا! طالب سے جو قرابت قریبہ تھی

---

[1] اصل مخطوطہ قاضی الیاس حسین کے بھائی ماسٹر ایوب حسین جعفری (وقتیارہ، سیتاپور) کے پاس محفوظ ہے۔ (نادم)

اس اعتبار سے ان کی معلومات بہر قیمت قابل اعتماد ہیں۔ قاضی صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں جس حسرت ناک سانحہ سے دوچار ہوئے وہ آج تک معمہ سا بنا ہوا ہے۔ ۴ مئی ۱۹۵۰ء کو ایک عزیز کی تعزیت میں باڑی (ضلع سیتاپور گئے۔ لیکن واپسی کے بعد پھر ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ باڑی سے ریلوے اسٹیشن "سدھولی" کی طرف آتے ہوئے اس طرح غائب ہوئے کہ تلاش و تجسس انگشت بدنداں ہے! جانے زمین کھا گئی یا آسمان! ۔ غالب سے طالب کا سلسلہ تلمذ اور والہانہ وابستگی کی داستانیں ہمیشہ سیتاپور میں زبان زد خاص و عام رہیں ــــــ اور ان مناظر کو دیکھنے والے تو اب بھی موجود ہیں، جب طالب اپنے استاد غالب کا کلام والہانہ طور پر پڑھ کر بے اختیارانہ رویا کرتے تھے۔ میرے محترم اور معمر بزرگ خان بہادر سید محمد زکی صاحب رضوی (ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولس یو۔ پی) اپنے ایک نجی خط (مورخہ ۲۸ر اپریل ۱۹۶۲ء) میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"تم نے جو کچھ سنا ہے وہ ٹھیک ہے! حکیم محمد شریف صاحب مرحوم یقیناً جناب غالب مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا تھا کہ آپ نے اپنا تخلص طالب کس لحاظ سے رکھا ہے؟ تو مرحوم (طالب) نے فرمایا کہ میرے استاد (غالب) کے تخلص کے ہم وزن کوئی اور لفظ اس سے اچھا نہیں ملا۔ وہ ایک بار اپنے استاد مرحوم سے ملنے دہلی گئے تھے اس زمانے میں سیتاپور سے دہلی جانا بہت دشوار تھا۔ دہلی سے واپسی پر جناب قاضی سید محمد صاحب اعلی اللہ مقامہ نے جو اس وقت رجسٹرار تھے ان کو لاہرپور ضلع سیتاپور میں سب رجسٹرار کی جگہ دے دی اور شاید اسی وجہ سے وہ دہلی نہ جا سکے! میں نے مرحوم کی دو غزلیں دیکھی تھیں جن پر غالب مرحوم نے اپنے قلم سے اصلاح دی تھی! اور ان کے ساتھ غالب مرحوم کے خط بھی تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے صاحبزادے احمد شریف کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے غالباً محمد شریف صاحب مرحوم (طالب) کے تمام کاغذات تلف ہو گئے!

ایک بار میں اپنی ملازمت کے کام سے دورہ پر حکیم صاحب مرحوم (طالب) سے اُن کے موضع "کورکی" میں ملا تھا۔ آموں کی فصل تھی اور حکیم صاحب ایک آم کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں اس درخت سے ایک پختہ آم گرا۔ حکیم صاحب نے اسے پانی سے دھو کر مجھے مرحمت فرمایا۔ اور جناب غالب مرحوم کا وہ قطعہ پڑھا۔ "بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے"

. . . .

انگبین کے بحکم رب الناس بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

جب اس شعر پر پہنچے تو فرمایا ــــــ دیکھو "سربمہر" کی تشبیہ کتنی مناسب ہے اور تم کھا کر دیکھو اس کا رس "انگبیں" ہے یا نہیں"۔

سیتاپور کے معمر ترین بزرگوں میں خان بہادر صاحب بڑی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسّی سال سے کچھ زیادہ ہی عمر ہے۔ ہوش و حواس میں اب بھی کسی قسم کی کمی نہیں۔ آپ کے والد ماجد میر کاظم حسین وفا سیتاپوری طالب کے ہمسن معاصرین میں تھے ــــــ اور خود خان بہادر صاحب نے طالب کی زندگی کے کھلے اوراق کا مطالعہ کیا ہے۔

ہندستان بھر میں "اودھ" غالباً وہ منفرد علاقہ تھا جہاں غالب اپنی زندگی میں بہت ہی کم مقبول ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ "اودھ" میں غالب کے شاگردوں کا حلقہ اتنا محدود تھا کہ جناب مالک رام "تلامذۂ غالب" میں صرف مندرجہ ذیل شاگردوں کا ذکر کر سکے۔

۱۔ شاہ ولایت علی خاں عزیز صفی پوری
۲۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی
۳۔ شیخ لطیف احمد عثمانی کیف بلگرامی
۴۔ مولوی مقصود عالم مقصود پھانوی
۵۔ سید ناصر الدین حیدر خاں ناصر لکھنوی (عرف یوسف مرزا)
۶۔ حکیم محب علی نیر کاکوروی۔

اس فہرست میں اگر حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی (نبیرۂ مولانا فضل حق خیرآبادی) اور حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری کے نام کا اضافہ کر لیا جائے تب بھی یہ تعداد ایک درجن تک نہیں پہنچتی۔ ممکن ہے تلاش و جستجو سے ایک آدھ نام اور بھی مل جائے لیکن اس کے باوجود اودھ میں غالب کی عدم مقبولیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اس وقت کا "اودھ" دراصل آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر۔ اور امیر مینائی وغیرہ سے کافی متاثر تھا۔ دلّی کے مقابلے میں "لکھنؤ اسکول" کی بنیاد پڑ چکی تھی چنانچہ لکھنؤ کی قربت سے سیتاپور کا متاثر ہونا بھی قدرتی بات تھی! یہاں آتش۔ انیس اور دبیر کے ماننے والوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ غالب اور سیتاپور کے مابین ہم آہنگی اور اخلاص کا جو رشتہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ذریعہ قائم ہوا تھا وہ (غدر سے پہلے) غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عباس بیگ (ابن مرزا اکبر بیگ بدخشی) کے سیتاپور نقل سکونت کر لینے سے کچھ اور مضبوط ہو گیا۔ اور غدر کے بعد تو غالب کے تمام "باقیات الصالحات" بھی سیتاپور ہی چلے آئے۔ ان کے بھانجے مرزا جواد بیگ عرف مرزا مغل اور بڑے بھانجے مرزا عاشور بیگ کی اولاد خداداد بیگ محمود بیگ اور رفیع الدین بیگ وحشی! اس خاندان کے سیتاپور پہنچتے ہی سر سید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں (سب جج) آغا عبدالغنی وکیل دہلوی نواب عبدالسلام خاں رام پوری (سب جج) مرزا اسد بیگ دہلوی۔ حکیم مومن خاں دہلوی کے داماد مولوی عبدالغنی وکیل اور اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی وغیرہ آگے پیچھے نہ جانے کتنے نامور اور باکمال سیتاپور آگئے ـــــ غالب کے متعلقین میں کچھ تو حیدرآباد چلے گئے! کچھ یو۔ پی کے دوسرے اضلاع میں پھیل گئے ـــــ لیکن اس خاندان کی مرکزی شاخ مستقلاً یہیں کی ہو رہی اور آج بھی موجود ہے! سید محمد احمد خاں تو "نیم سیتاپوری" ہو ہی چکے تھے۔ اپنے آخری ایام زندگی میں (مسٹر) سید محمود بھی یہیں آگئے۔ سیتاپور سے کچھ ایسا عشق ہوا کہ تمام عمر یہیں رہے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کی لاش علی گڑھ لے جائی گئی!

لیکن ان تعلقات کے باوجود نہ تو غالب کبھی مولانا فضل حق خیرآبادی کے ساتھ آم کھانے خیرآباد[1] (ضلع سیتاپور) آئے اور نہ اپنے بھانجوں سے ملنے کے لیے کبھی یہاں پہنچے! یہی نہیں بلکہ مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی "وجیہہ النساء بیگم" کے نکاح میں بھی شریک نہ ہو سکے جو سیتاپور ہی میں غالب کے نواسے مرزا محمود بیگ کے ساتھ ہوئی تھی۔ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"سید صاحب ـــ تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خاں بہادر کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے تم کیوں شکر گذار ہوتے ہو۔ جو کچھ نیکی اور نکوئی اس اقبال نشان نے تمہارے ساتھ کی ہے وہ بعینہٖ میرے ساتھ کی ہے۔ اس کا جوہر طبع از روئے فطرت شریف ہے۔ پروردگار اس کو سلامت رکھے اور مدارج اعلیٰ کو پہنچائے۔ یہ اپنے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی "ناں" کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے پس وہ فخر میری طرف بھی عاید ہوتا ہے!

وہ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ "ماموں" میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور صرف زر سے جی چرایا ہے۔ میں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا ـــ مگر کیا کروں! مجھ میں دم ہی نہ تھا۔ کاش کہ جب ایسا ہوتا جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسر آتا ہے۔" (صفحہ ۳۱۳۔ ادبی خطوط غالب مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ)

یہ رابطہ و تعلق تو اپنی جگہ تھا۔ اس کے برعکس تصویر کے دوسرے رخ میں خیرآباد (ضلع سیتاپور) کی دو مشہور اور ذہین طوائفوں (زہرہ و مشتری) کے خدوخال بھی نظر آتے ہیں جو غالب کے مشہور حریف آغا علی شمس لکھنوی کی شاگرد تھیں۔ ان دونوں نے بھی غالب کے خلاف بڑے بڑے ہنگامہ خیز مضامین لکھے جو "اودھ اخبار" وغیرہ میں چھپا کرتے تھے۔ ریاض خیرآبادی نے بھی اپنی ابتدائے مشق سخن میں غالب کے دیوان کا "جواب" کہنا شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کی ایک غزل میری نظر سے گزری ہے۔ مقطع کا آخری مصرعہ تھا:۔

میں ہوں ریاض کچھ اسد دہلوی نہیں

---

[1] اودھ کا قدیم قصبہ سیتاپور سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے یہاں آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے علماء اور مشائخ آسودہ خواب ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ قصبہ اودھ کا "مدینۃ الاولیا" سمجھا جاتا تھا۔ اب تقریباً ویران ہو چکا ہے۔ (خادم)

پس منظر خواہ کچھ بھی ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی کے پوتے مرزا قاسم علی قزلباش بسلسلہ ملازمت سیتاپور پہنچے تو آغا عبدالغنی وکیل دہلوی کے اشتراک سے انھوں نے غالب ہی کی نسبت اسمی سے "غالب الاخبار" جاری کیا مگر اس کا پہلا شمارہ یکم مارچ ۱۸۶۹ء کو نکلا تو غالب کی وفات کو دس بارہ دن گذر چکے تھے!

طالب اسی سیتاپور (اودھ) کے رہنے والے تھے۔ سن ولادت کا صحیح پتہ تو چل نہیں سکا البتہ قدیم خاندانی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان زمن غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے آخری عہد حکومت (۱۸۱۴ء — ۱۸۲۷ء) میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے اور ۲۷ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کم و بیش سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ "تکیہ مدار شاہ" محلہ قضیارہ (سیتاپور) میں سپرد خاک کیے گئے! ان کے والد مفتی سید اولاد علی جریح اپنے دور کے ایک باکمال شاعر گذرے ہیں۔ تمام عمر مداحی اہلبیت اطہار میں بسر کی۔ ان کے فارسی قصائد کا ایک نامکمل قلمی مجموعہ میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔[1]

نسبی حیثیت سے طالب سیتاپور کے ممتاز جعفری نیشاپوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلہ نسب بتیس ۳۲ واسطوں سے صادق آل عبا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مورث اعلیٰ حضرت سید شاہ اسمٰعیل نیشاپور سے ترک سکونت کرکے ہندستان تشریف لائے تھے۔ اور قصبہ کہرام (مضافات انبالہ) میں سکونت گزین ہوئے تھے۔ ان کے پوتے سید عبدالملک کہرامی کہرام سے جونپور اور پھر مخدوم سید عادل الملک بہ عہد سلطان ابراہیم شرقی جون پور کو خیرباد کہہ کر رائے بریلی چلے آئے۔ ابوالفتح سید فتح اللہ (عرف شیخ فتن) انھیں بزرگ کی نسل سے تھے۔ جو عہد شاہجہانی میں سیتاپور آبسے تھے جن کی یادگار سیتاپور میں ایک محلہ "فتن سرائے" آج بھی موجود ہے۔

نیشاپوری سادات میں بڑے بڑے صاحبان شریعت و طریقت بزرگ گذرے ہیں۔ مخدوم عادل الملک کا مزار آج بھی رائے بریلی میں مرجع خاص و عام ہے۔ مخدوم عادل الملک کی چھٹی پشت میں سید ظہیر الدین کہرامی مصنف "فتاوائے ظہیری" کا شمار ان ارباب علم و فضل میں ہے جن کے اذکار سے اسلامی تاریخ کے صفحات معمور ہیں۔ میر گلزار حسین ارم، مولوی نیاز احمد نامی سیتاپوری اور ہند و پاک کے مشہور ادیب و صحافی سید رئیس احمد جعفری ندوی تو اسی صدی کے اہل کمال ہیں جنھیں شاید بہت دنوں تک دنیا نہ بھلا سکے گی۔

طالب کے والد مفتی سید اولاد علی جریح کا انتقال غدر ۱۸۵۷ء سے آٹھ نو سال قبل (تخمیناً ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء) میں سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے ابتدائی عہد حکومت میں ہوا۔ ان کے قبضہ میں سیتاپور کے قریب ہی کئی مواضعات کے حقوق مستاجری تھے۔ تمول، فراغ البالی اور امارت کے چوچلوں نے جریح کے مرتے ہی اچانک حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کردی کہ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھ کا گھر خاک ہوگیا۔ "بوہرے" مہاجن کا آٹھ دس ہزار قرض ہوا اور طالب حالات سے کچھ ایسے گھبرا گئے کہ بلا کہے سنے سیتاپور کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے۔ طبابت اس خاندان کا موروثی پیشہ تھا۔ طالب نے فن طب کی تکمیل اپنے باپ سے کی تھی اور وہ بھی اس طلب و ذوق کے ساتھ کہ ابتدا ہی سے ان کا شمار حاذق اطبا میں ہونے لگا تھا۔ خدا نے دست شفا ایسا دیا تھا کہ کوئی مریض ان کے مطب سے ناکام و مایوس نہیں جاتا تھا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی انھیں خوش قسمتی سے شاہی خاندان کے ایک بیمار کے علاج کا موقع مل گیا مریض شفایاب ہوا اسی کے ساتھ ہی ان کی شہرت کی دھوم لکھنؤ بھر میں مچ گئی۔ نواب سلیمان قدر بہادر نے قدر افزائی فرمائی اور یہ ان کی سرکار میں بزمرۂ طبیب خاص ملازم ہوگئے۔

نواب سلیمان قدر بہادر آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے مختلف البطن بھائی تھے ان کی سرکار میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ناسخ کی اس غزل کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی جس کا مطلع ہے۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر۔ چاک ہے میرے گریباں کا

لکھنؤ بھر میں اسی طرح پر مشاعرے ہو رہے تھے۔ نواب سلیمان قدر بہادر کے یہاں بھی اسی طرح میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لکھنؤ کے تمام اساتذہ فن موجود تھے۔ لیکن طالب نے جب اپنی غزل پڑھی تو ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ اس غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] صفحہ ۸۵۴ لغایتہ ۸۶۵ "شجرات طیبات" مطبوعہ امیر المطابع سیتاپور ۱۹۱۸ء

فروزاں ہے جو دل میں داغ عشق شعلہ رویاں کا
گماں ہوتا ہے دود آہ پر دود چراغاں کا

یہی ہے زور گر وحشت جنون فتنہ ساماں کا
نگہباں ہے خدا ہی صبح محشر کے گریباں کا

فروغ شعلۂ حسن رخ پر نور کے آگے
تجلی اک چراغ مردہ ہے گور غریباں کا

دہن سے ہر نفس کے ساتھ اک شعلہ نکلتا ہے
فضائے سینہ جولانگاہ ہے کس برق تاباں کا

لگی ہے جس کی لو تجھ سے اسے کیا خوف صرصر ہو
چراغ لالہ کو فانوس ہے دامن بیاباں کا

اس غزل کے دوسرے مطلع نے لکھنؤ بھر میں دھوم مچادی۔ بڑے بڑے اہل کمال اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ طالب کا مطلع ثانی ناسخ کے مشہور مطلع سے بہت آگے بڑھ گیا۔

اسی مشاعرے کا ایک دل چسپ لطیفہ اور بھی مشہور ہے کہ کسی مسخرے نے ناسخ کی پوری غزل کو الٹ پلٹ کر مشاعرے میں پڑھ دیا۔ مثلاً مطلع کے پہلے مصرعہ میں "مشرق" کے بجائے "مغرب" بدل کر اس طرح پڑھا:-

مرا سینہ ہے "مغرب" آفتاب داغ ہجراں کا

لوگوں نے کہا یہ تو استاد ناسخ ہی کے مطلع کو آپ نے الٹ دیا۔ مسخرے شاعر نے جواب دیا۔
"حضور ـــــ گستاخی معاف! آپ کو مشرق و مغرب میں بھی فرق نظر نہیں آتا ـــــ استاد نے مشرق کی بات کہی ہے اور میں "مغرب" کا ذکر کر رہا ہوں"!

طالب نے ابتدائے مشق سخن اپنے والد مفتی اولاد علی جرمحج سے کی۔ اور زیادہ تر فارسی ہی میں کہتے تھے۔ شریفؔ تخلص فرماتے تھے چنانچہ ان کی بہت سی اردو غزلیں بھی ایسی ہیں جن میں انھوں نے "شریفؔ" تخلص نظم کیا تھا۔ لیکن جب غالب کے شاگرد ہوئے اور استاد کا ہم قافیہ تخلص "طالب" اختیار کیا تو اپنے قلم سے شریفؔ تخلص قلمزد کر کے "طالب" بدل دیا!

نواب سلیمان قدر بہادر کی سرکار سے طالب کب تک وابستہ رہے! اس مدت کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۵ء تک وہ "لاہرپور"[1] میں عہدہ سب رجسٹراری پر ضرور فائز ہو چکے تھے۔ اس زمانے تک "محکمہ رجسٹری" میں تمام ملازمین کی تقرری اور برخواستگی "قاضی ایکٹ" مطابق ڈسٹرکٹ رجسٹرار کے ہاتھ میں رہتی تھی اور سیتاپور میں ڈسٹرکٹ رجسٹرار طالب کے سمدھی "قاضی سید محمد" ہی تھے انھیں کے توسل سے یہ لاہرپور کے سب رجسٹرار مقرر ہوئے اور ایک مدت تک اسی عہدے پر فائز رہے!

سب رجسٹراری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے لیے انھوں نے پنشن نہیں لی بلکہ اسی جگہ پر اپنے اکلوتے صاحبزادے مفتی سید احمد شریف گہر کو سب رجسٹرار مقرر کرا دیا جو مدت العمر سب رجسٹرار رہے اور یہیں سے پنشن پائی۔

طالب اپنے آخری ایام زندگی میں زیادہ تر اپنے گاؤں کرگی میں رہا کرتے تھے جو ان کی زمینداری میں سیتاپور سے قریب ہی چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اپنے ایک موروثی گاؤں سے انھیں بے حد محبت تھی جب بھی سیتاپور میں رہتے رہتے گھبرا جاتے پالکی پر سوار ہو کر وہیں چلے جاتے جہاں ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ان کی مختصر سی دیہاتی قیام گاہ بنی ہوئی تھی جسے "اودھ" کی زمیندارانہ اصطلاح میں "کوٹھار" کہتے ہیں۔

غالب سے رشتہ تلمذ قائم ہونے کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں البتہ سیتاپور کے معمر ترین بزرگ حکیم سید احمد[2] احمد سیتاپوری دار ۱۸۵۰ء ـــ

---

[1] "لاہرپور" ضلع سیتاپور کا ایک پرانا قصبہ ہے جسے اکبر اعظم کے مشہور نورتن۔ عین السلطنت راجہ ٹوڈرمل کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے راجہ ٹوڈرمل کے بنوائے ہوئے "راجہ تال" کے کھنڈرات اب بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ قصبہ سیتاپور سے بیس بائیس میل پر واقع ہے۔

[2] حکیم سید احمد۔ احمد سیتاپوری "معیار پارٹی" (لکھنؤ) کے ایک خاص رکن تھے مرحوم ماہنامہ "معیار" لکھنؤ میں ان کا کلام برابر چھپتا تھا۔ میرے والد کے خاص ملنے والوں میں تھے اور میرے ساتھ ہمیشہ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کے والد مولوی نعمان احمد کا شمار عمائدین سیتاپور میں تھا فارسی کے اچھے

(باقی صفحہ آئندہ)

۸ر اکتوبر ۱۹۶۲ء) بیان فرماتے تھے کہ ——

"مفتی صاحب (طالب) میرے والد مرحوم مولوی نعمان احمد (تعلقدار مہیوہ ضلع سیتاپور) کے گہرے دوستوں میں تھے ہر مہینے ایک کا دوسرے سے ملنا اتنا ضروری تھا جیسے مشرق سے آفتاب کا نکلنا! مفتی صاحب چونکہ فارسی کے ایک مشاق اور نکتہ سنج شاعر تھے۔ اس لیے انھیں غالب کے کلام سے والہانہ وابستگی پیدا ہو گئی۔ خود میرے والد (مولوی نعمان احمد) فارسی کے ایک باکمال انشا پرداز تھے اور کسی حد تک غالب کی فارسی نثر نگاری کے قایل بھی تھے لیکن غالب کے شعری فن سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی وہ لکھنؤ کے رنگ کو زیادہ پسند فرماتے تھے چنانچہ اسی بات پر ان دونوں دوستوں (طالب اور نعمان احمد) کے درمیان اکثر چوٹیں چلا کرتی تھیں —— اور والد مرحوم اکثر مفتی صاحب سے طنزاً کہا کرتے تھے کہ جب آپ کو غالب کا رنگ اتنا پسند ہے تو آپ ان کی شاگردی کیوں نہیں کر لیتے —! انھیں باتوں کا نتیجہ نکلا کہ مفتی صاحب بہ نفس نفیس دلّی تشریف لے گئے اور غالب کے دست فن پر بیعت کر لی۔ استاد اور شاگرد کے درمیان سلسلہ مراسلت بھی قایم تھا میں نے بھی دو ایک خطوط دیکھے ہیں"

طالب کو اپنے استاد (غالب) سے جو والہانہ عقیدت و محبت تھی اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ وہ غالب کا فارسی اور اردو کلام پڑھ کر بے اختیارانہ رویا کرتے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سیتاپور کی فضا غالب کے لیے سازگار نہیں تھی چنانچہ اس دور کے بعض شوخ و طرار نوجوان طالب کے اس جذبہ عقیدت کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے اور اس فکر میں رہتے تھے کہ کب وہ نماز شروع کریں —— اور یہ لوگ انھیں ستانے پہنچ جائیں ادھر وہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے پہلی رکعت شروع کی کہ دو چار لڑکے پہنچ گئے —— ایک نے غالب کا شعر پڑھا۔

درد منت کش" دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دوسرے نے شعر کی تعریف شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ اس شعر کی شرح بھی —! "منت کش" ایران میں ایک بہت بڑا دواخانہ تھا ...... اور ...... اور ......؟

طالب پہلے تو لڑکوں کو مخاطب کرنے کے لیے زور زور سے نماز پڑھنے لگتے اور جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوتی تو نماز توڑ کر ان کے پیچھے دوڑتے ——!

مگر یہ کہاں ماننے والے۔ دوبارہ نماز شروع کی! پھر شیطان بن کر موجود! اب غالب کے اس مقطع کی شرح بیان کی جا رہی تھی ——

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ   سنگ اٹھایا تھا کہ "سر یاد آیا"

ایک نے مقطع پڑھا —— دوسرے نے شرح بیان کرنا شروع کر دی:-

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انشا پرداز تھے۔ میر غلام حسین قدر بلگرامی کے اصرار پر انھوں نے غالب کو فارسی میں خط لکھا۔ لیکن غالب نے اس کا جواب اردو میں دیا کیونکہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد وہ عام طور سے اردو ہی میں خط لکھا کرتے تھے۔ مولوی نعمان احمد کو غالب کی یہ ادا پسند نہیں آئی چنانچہ یہ سلسلہ مراسلت زیادہ دنوں تک قایم نہ رہ سکا۔ پروفیسر سید احتشام حسین رضوی نے غالب کے یہ چاروں خطوط ماہنامہ آجکل دہلی میں شایع کر دیے ہیں جو انھوں نے مولوی نعمان احمد کو لکھے تھے۔ غالب کے آخری خط میں جواب نہ دینے کا شکوہ بھی ہے۔

حکیم سید احمد نے دفعتاً ۸ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بارہ برس کی تھی مگر ہوش و حواس اتنے اچھے تھے کہ انتقال سے چند ماہ بیشتر جب میں ملنے گیا تو تقریباً دو تین گھنٹے تک برابر باتیں کرتے رہے۔ قدیم سیتاپور کے ادبی اذکار، اپنے انگلستان کے سفر کی روداد اور خود اپنے خاندانی حالات! شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر کچھ نہ کچھ بات چیت نہ ہوئی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ حالات مجھے لکھوا دیجئے۔ فرمایا جب جی چاہے دو چار دن ٹھہر کر قلم بند کر لو —— لیکن یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی ایک دن معلوم ہوا کہ ان کی لاش لکھنؤ سے سیتاپور آئی ہے اور عیدگاہ کے قبرستان میں قبر کھودی جا رہی ہے۔ (نادم)

صاف سا مقطع ہے غالب نے اپنے لڑکپن میں کہا تھا اور خوب کہا تھا یعنی جب انھوں نے مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تو اچانک مجنوں کا باپ" سر یاد آگیا ...."

غرض کہ اسی طرح طالب مرحوم کو بار بار غازؔ نوٹا پٹی اور یہ ناشعور لڑکے انھیں سنایا کرتے۔

ہوئے کو طالب کے دس بارہ اولادیں ہوئیں مگر سوائے ایک صاحبزادے منشی سید احمد شریف اور ایک صاحبزادی کے تمام اولادیں کم عمری ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ صاحبزادی میرے رشتہ کے چچا سید حیدر حسین حیدری سے منسوب تھیں جن کے بطن سے صرف ایک دختر "معظم النساء بیگم" ہوئیں جو بقید حیات ہیں۔

منشی سید احمد شریف بڑے ہی محرور المزاج مگر متقی بزرگ تھے تخمیناً ۱۹۲۵ء تک یوپی کے مختلف اضلاع میں سب رجسٹرار رہے۔ جون ۱۹۳۱ء میں بمقام سیتاپور وفات پائی۔ شعر و سخن سے بھی کچھ دلچسپی تھی۔ "گہر" تخلص فرماتے تھے۔ کلام میں سلاست اور روانی تھی روزمرہ اچھا کہتے تھے۔ ایک غزل سنائی تھی جس کے صرف دو شعر اس وقت یاد ہیں:۔

اب دلوں میں باہمی الفت نہ یاری رہ گئی — تُو تُو۔ مَیں مَیں۔ آئے دن میری تمہاری رہ گئی

تم شب وعدہ نہ آئے۔ اپنا عالم کیا کہیں — جس طرح گذری گذاری۔ ضد تمہاری رہ گئی

طالب کے نامکمل دیوان میں جو غزلیں ہیں انھیں دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو ابتدائی دور جب وہ شریف تخلص کرتے تھے۔ دوسرا دور غالب سے افتخار تلمذ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ میرے پاس ان کا جو نامکمل قلمی دیوان ہے اس میں فارسی کا ایک قصیدہ اور ایک حمد بھی ہے۔ یہ وجد آفریں حمد اگرچہ نامکمل ہے لیکن اسے پڑھ کر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھیں فارسی کے ادب عالیہ پر اچھا خاصا عبور تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے انھیں غالب کے پرستاروں میں شامل کر دیا تھا۔ حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را — کہ در کنہہ اُو حسرت ادراک را

دو رنگ آفرینندۂ روز و شب — ثریا عطا ساز تاگ عنب

فرازندہ کاخ گرداں سپہر — فروزندہ گوہر ماہ و مہر

دہد نطق و ہم فہم و سمع و بصر — کنی تاکہ ادراک نفع و ضرر

سفید و سیاہ و بہ نقش و کبود — بسے رنگ ہائے گزین و انمود

عطا میکند آنچہ می شایدت — کہ ہر یک بہ ہر لحظہ کار آیدت

معین مددگار ہر مستمند — رہانندہ عاجزاں از گزند

ادا کے شود شکر احسان اُو — خوش آن کہ بوید بہ فرمان اُو

طالب کا جو اردو کلام اب تک میں فراہم کر سکا ہوں اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ان کی شاعری میں جو ہر پیدا ہوا وہ غالب کے فیض تلمذ کا رہین منت ہے البتہ ایک مقطع سے اس حقیقت پر ایک ہلکی سی روشنی ضرور پڑتی ہے۔

بہت جانکاہیوں سے کوششیں کیں طرز غالب میں — ہوا ممکن نہ اے طالب وہ انداز بیاں پھر بھی

طالب اپنے استاد میں کتنا محو و مستغرق تھے اس کا اندازہ ان کی اسی غزل کے ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے؟

تمہاری دوستی ہی میری بربادی کو کافی ہے — ضرورت کیا ہے جو دشمن بنے یہ آسماں پھر بھی

اسے نہ تو غالب کا سرقہ کہا جا سکتا ہے نہ توارد — میں تو اسے "استغراق عقیدت" ہی سمجھتا ہوں۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ غالب کا یہ شعر انھوں نے نہ پڑھا ہو —

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے! — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

نمونۂ کلام کے طور پر میں بلا کسی تبصرے کے طالب کی انھیں غزلوں کا سرسری انتخاب پیش کر رہا ہوں جو کسی حد تک غالب کے رنگ میں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ اشعار بھی شامل ہوں جن پر غالب نے اصلاح دی تھی۔

ثابت قدمی کر دل شیدا ابھی کچھ اور — واں ہیں ستم حوصلہ فرسا ابھی کچھ اور

کردیوں نے بند کیے آسماں کے در — آہنگ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

بسمل بخون طپیدہ کہ رنگ پریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں
موج صبا یہ بوئے گل نو دمیدہ ہوں — اک آہ سرد و نالہ درد آرمیدہ ہوں
بے تابی اپنی طالب دل خستہ کیا کہوں — نالہ سے رعد آہ سے برق طپیدہ ہوں

تیرے دیوانے کو ہے صحرا کا یوں دامن عزیز — جس طرح یعقوب کو یوسف کا پیراہن عزیز
پاکدامانی پہ گو معصوم کی شاہد ہوا — لیکن اپنے دل میں یوسف سے رہا بد ظن عزیز
یوں رقیب روسیہ سے اور ہم سے ربط ہے — خار کو رکھتا ہے جیسے دامن گلشن عزیز

کبھی دل آپ کو رسوا نہ کرتا — مگر امجبور مرتا کیا نہ کرتا؟
جو بھولے سے بھی ہوتی پرسش حال — دل شوریدہ گھبرایا نہ کرتا
وفائے قیس میں ترک ادب تھا — جو تعظیم سگِ لیلا نہ کرتا

پہلے حیات خضر مہیا کرے کوئی — پھر انتظار وعدہ فردا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت شمع تجلی کا دے فروغ — شوقِ دل کلیم تو پیدا کرے کوئی

طالبؔ وہ جسکے عیب کو چاہے صفت کرے — داغ سفید کو ید بیضا بنا دیا

جامہ کیسا نہ رہا رشتۂ جاں بھی تن میں — رہ گیا دست جنوں سر بگریباں ہو کر
نابلد ہوں میں رہ دشت جنوں سے بالکل — لے چل اے وحشت دل خضر بیاباں ہو کر

ظاہر ہے دل کا حال مرے، کچھ چھپا ہے کیا — بسمل تری ادا نے کیا پوچھتا ہے کیا
واعظ سنا رہا ہے جو دوزخ کی گرمیاں — کچھ اس میں خوئے یار سے گرمی سوا ہے کیا؟
بلبل بوقت خندۂ گل نالہ کش نہ ہو — اتنا تو دیکھ لے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

عرض نیاز ہی سبب ناز ہو گیا — میں اپنے حق میں آپ نظر انداز ہو گیا

ہر چند درد دل میں چھپاتا رہا مگر   رنگ پریدہ پردہ درِ راز ہو گیا

درہم داغِ فراق اس بت سیمیں تن کے   نہیں قارون کے خزانے سے بدلنے والے
بار ورگرنہ ہوا نخلِ تمنا نہ سہی   کیا شجر ہوتے ہیں سب پھولنے پھلنے والے
سخت ہو کیسی ہی منزل مگر آگے پیچھے   بیٹھتے اٹھتے پہنچ جاتے ہیں چلنے والے

جس بات کا نہ تھا کبھی وہم وگماں مجھے   قسمت دکھا رہی ہے وہ نیرنگیاں مجھے
سمجھا جو میری موت میاں وقفہ ہے یاں مجھے   کچھ اور جھیلنا ہیں ابھی سختیاں مجھے
کھلتا نہیں کہ قافلے والے کدھر گئے   بھٹکا رہی ہے گردِ رہ کارواں مجھے

نالہ ہے بانگ جرس جب کوئی تاثیر نہیں   خواب مہمل ہے وہ جس خواب کی تعبیر نہیں
تیرا دھر رُخ تو کریں دیدۂ دل حاضر ہے   ان کی دل کاریوں سے ہم کبھی دلگیر نہیں
دیکھنا جوشش سودا۔ یہ ادب کا ہے مقام   حلقہ زلف ہے! دیوانے کی زنجیر نہیں

دل محو جمال دوست مدفون ہے جہاں واعظ   اندھیرے کا بھلا مذکور ہی کیا ان مزاروں میں
توقع ان کے آنے کی عبث رکھتا ہے اے طالب   وہ کیوں آنے لگے ویرانہ بے اعتباروں میں

نازاں ید بیضا پہ نہ ہوتے کبھی موسیٰ   گر دیکھتے جلوہ وہ تری دزدِ حنا کا
کچھ کم نہیں شاہی سے ترے در کی گدائی   سایہ تری دیوار کا سایہ ہے ہما کا

ساقی کی بزم تک جو رسائی ہوئی کبھی   قسمت سے میری جام نگوسار ہی رہا
دیکھا ہمیشہ طالب شوریدہ حال کو   رسوا میاں کوچہ و بازار ہی رہا

دل مراد[1] خورجور حسیناں ہی رہا   عمر بھر مثل جرس سرگرم افغاں ہی رہا
التفات غیر سے ہے مدعا ایذا مری   ورنہ وہ نا آشنا سب سے گریزاں ہی رہا
وہ نظارہ سوز ہے یارب جمال روئے یار   دیدۂ حسرت کش دیدار حیراں ہی رہا
طالب آئے بھی گئے بھی لگ انکی بزم سے   اور تو وقف کشاکشہائے درباں ہی رہا

یہ فیض ہے کسی متلون مزاج کا   ورنہ ہمیشہ رنگ بدلتا زمانہ کیا؟
طالب جو درد دل کا مزا جانتے نہیں   سمجھیں وہ صنعت غزل عاشقانہ کیا؟

(باقی صفحہ ۷ پر)

[1] لفظ پڑھا نہ جا سکا

دیوان کامل و شاداں

رشید حسن خاں

نواب زین العابدین خاں عارف، غالب کی بیوی امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے تھے۔ غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں، بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم۔ بنیادی بیگم بڑی تھیں، ان کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی تھی، جن سے دو صاحبزادے ہوئے، زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں۔ زین العابدین خاں عارف، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے، اُن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اُس وقت ان کی عمر ۳۶ برس کی تھی۔ بقول مالک رام صاحب، عارف کی موت پر غالب نے وہ دردناک نوحہ لکھا تھا، جو اردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کیے، دوسری بیوی دلستی بیگم عرف نواب دلہن، دختر میرزا محمد علی بیگ بخارائی سے دو لڑکے ہوئے، باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ عارف کے انتقال سے چند ماہ پہلے، اُن کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، عارف کے انتقال کے وقت، باقر علی خاں ۵ سال کے تھے اور حسین علی خاں دو سال کے۔ غالب نے ان دونوں بچوں کو متبنّیٰ کر لیا۔ عارف کی رحلت کے بعد حسین علی خاں کو غالب اپنے یہاں لے آئے۔ باقر علیخاں کچھ عرصے تک اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے، پھر وہ بھی غالب کے پاس چلے آئے۔

دونوں بھائی شاعر تھے اور دونوں اردو فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ باقر علی خاں کا اردو میں کامل تخلص تھا فارسی میں باقر۔ یہ مرزا قربان علی بیگ سالک سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ (مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب)

مالک رام صاحب نے بھی ان کو شاگرد سالک لکھا ہے اور تلمذ غالب سے انکار کیا ہے۔ البتہ صاحب سخن شعرا نے ان کو تلمیذ غالب لکھا ہے۔ ۲۵ مئی ۱۸۷۶ء کو یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ) انتیسویں برس میں انتقال کیا (مکاتیب) سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی، اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ چھوٹے بھائی حسین علیخاں شاداں کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات، لوح مزار پر کندہ ہے۔

چو زین غم خانۂ دنیا سفر کرد سوئے باغ جنان باقر علی خاں
بسال رحلتش تحریر گردید بود مینو مکان باقر علی خاں (ذکر غالب)
۱۲۹۳

سالک نے بھی قطعہ تاریخ کہا تھا۔ جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔

"قطعہ تاریخ وفات مرزا باقر علیخاں کامل خلف زین العابدین خاں عارف۔ فرزند نسبتی نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں۔

یادگار عارفِ مرحوم تھا کس کو مارا تو نے دوراں، حیف ہے!
کیوں دکھایا تو نے اس کو روزِ بد جس سے روشن بھی شبستاں، حیف ہے!
اُس کے دلبستوں کے دل میں رہ گئے دیکھو کیسے کیسے ارماں، حیف ہے!
حسن اُس کا، ماہِ کامل سے دو چند چھپ گیا وہ مہر رخشاں، حیف ہے!
یہ ہے نوحہ، ہے یہی تاریخ سن نوجواں باقر علی خاں، حیف ہے!" (کلیات سالک ص ۲۹۳)
۱۲۹۳

ان کا کلام نہیں ملتا ہے۔ ایک غزل اور ایک مسدس شہر آشوب، فغانِ دہلی، میں محفوظ ہے، اور دو شعر، سخن شعرا میں باقی کلام خدا جانے کیا ہوا!
عارف کے چھوٹے بیٹے حسین علی خاں کا تخلص شاداں تھا، فارسی میں خیالی تخلص کرتے تھے۔ فغان دہلی، میں ان کا تخلص راقم لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے راقم تخلص تھا، بعد کو شاداں اختیار کیا۔ دربار رام پور سے متعلق تھے امراؤ بیگم کے ایک مکتوب بنام نواب کلب علی خاں مورخہ ۲ راگست ۱۸۶۹ء (مشمولۂ مکاتیب) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاداں اُس وقت دربار رام پور کے متوسلین میں شامل ہو چکے تھے، پچیس روپیہ ماہانہ مشاہرہ تھا (مکاتیب) صاحب خمخانہ جاوید نے

لکھا ہے کہ "پہلے تیس روپے ماہوار ملتے تھے پھر ساٹھ روپے ملنے لگے" مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن کوئی ثبوت یا حوالہ نہیں دیا ہے۔ آخر میں دہلی چلے آئے تھے۔ اس آخری زمانے میں دماغی توازن بگڑ گیا تھا جسکی وجہ بقول مالک رام صاحب، بڑے بھائی کی موت کا صدمہ تھا۔ صاحب خمخانۂ جاوید نے، اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"آخر زمانے میں ان کو مالیخولیا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے یہ خیال اُن کے ذہن نشین تھا کہ شاعر کے لیے دبلا ہونا نہایت ضروری ہے، مرزا ارشد گورگانی، جو اُن کے جگری دوست تھے، ان سے مرزا شاداں کہا کرتے تھے کہ داغ کو کبھی شعر کہنا نہ آئے گا، کیونکہ شاعری اور فربہی سے بہت بعد ہے۔ ہوتے ہوتے یہ جنون یہاں تک بڑھا کہ پانی پینا بھی بہت کم کر دیا، ایک چھوٹی سی سیب کی ڈبیا میں، احتیاط کی وجہ سے پانی پیا کرتے تھے، حکیم غلام رضا خاں مرحوم نے ان کو ایک خمیرے کا نسخہ لکھ دیا تھا اب غذا بھی بالکل ترک ہو گئی یہ معمول کر لیا کہ دس بارہ آنے کے پیسے جیب میں ڈال کر، بازار میں آ کر کھڑے ہو گئے، اور دو دو چار چار پیسوں کا خمیرہ لے کر کھانا شروع کیا جب سب پیسے ختم ہو گئے مکان پر آ کر لیٹ رہے۔ اب نقاہت اس درجہ بڑھی جس نے جان لے کر ہی چھوڑا۔"

شاداں کا انتقال ۵ محرم شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۸۰ء) کو ہوا۔ انتقال کے وقت ۳۰ سال کی عمر تھی۔ نساخ نے تاریخ کہی:

برفت آہ شاداں ز دنیائے دوں — خدایا مقامش بفردوس باد
برائے سند رحلتش خامہ ام — رقم کرد "شادانِ فرخ نہاد"

خمخانہ جاوید، میں لکھا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۰ برس کی تھی، یہ صحیح نہیں۔ نیز صاحب خمخانہ کا یہ قول بھی درست نہیں کہ "فغان دہلی کی تحریر کے وقت ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی ہوگی۔" بقول مالک رام صاحب اس وقت ان کی عمر "۹-۱۰ برس سے زیادہ نہیں تھی" (تلامذۂ غالب)

کتاب خانہ رام پور میں کلام شاداں کا ایک مختصر سا قلمی نسخہ ہے، جو ۱۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں کل ۲۸۲ شعر ہیں۔ سفید باریک کاغذ ہے، کتابت واضح ہے۔ سرورق پر ناظم کتاب خانہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی یہ تحریر ہے۔

"این نسخہ را کمترین امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ، از ردی خانہ یافتہ است و گمان غالب میدارد کہ اصل نسخۂ شادانِ مرحوم است مرقومہ ۸ مئی ۱۹۳۸ء"

اس کے کاتب نے ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا ہے جس غزل کو جہاں چاہا لکھ دیا ہے۔ خمخانۂ جاوید میں شاداں کا کافی کلام درج کیا گیا ہے۔ صاحب خمخانہ نے لکھا ہے: "مجموعہ کلام ان کے اعزہ و احباب کی غفلت سے تلف ہو گیا۔ اکمل الاخبار، ان ایام میں جاری تھا، اس کے پرانے فائلوں اور بعض دہلی کے مشاعروں کی غزلیں بے حد کاوش و جستجو سے ملیں، وہ درج ذیل ہیں"۔ اس میں ۱۴۲ شعر بطور انتخاب کلام ہیں اور دو شعر حالات میں درج ہیں۔ اس طرح کل ۱۴۴ شعر ہیں۔ ان میں سے ۵۵ شعر دیوان میں موجود ہیں — اور ایک شعر فغان دہلی میں ہے۔ تذکرۂ انتخاب یادگار، میں اردو کے ۵ شعر ہیں، یہ پانچوں مخطوطۂ دیوان میں موجود ہیں۔ سخن شعرا، میں تین شعر ہیں، یہ خمخانہ میں درج ہیں۔ تذکرۂ طور کلیم، میں سات شعر ہیں، ان میں سے تین مخطوطے میں ہیں اور چار خمخانہ میں، تلامذہ غالب، میں جو شعر ہیں وہ خمخانہ سے ماخوذ ہیں۔ غرض شاداں کا جو کچھ کلام ہے، وہ دو جگہ ملتا ہے۔ اس مذکورہ مخطوطے میں یا خمخانہ جاوید میں۔

انتخاب یادگار میں، فارسی کے پانچ شعر درج ہیں۔ دو شعر ایک قصیدے کے، ایک دوسرے قصیدے کا، اور دو شعر دو مختلف غزلوں کے ہیں۔ ان کے سوا فارسی کلام اور کہیں نہیں ملتا ہے۔ تذکروں کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا مثلاً امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں لکھا ہے کہ: "وطن انکا دہلی ہے۔ مگر اب یہیں رہتے ہیں۔ پچیس برس کا سن ہے۔ شاعری کا مشغلہ رات دن ہے۔ فارسی اور اردو زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ شوق کا حال یہ ہے کہ کسی وقت فکر سے خالی نہیں رہتے ہیں۔ طبیعت ذوقت پسند ہے، فکر بلند ہے،" احمد علی خاں شوق نے تذکرہ کاملان رامپور، میں لکھا ہے کہ:

"رامپور میں بوجہ ملازمت قیام رہا۔ بہت سے شاگرد تھے۔ شاعری کا رات دن مشغلہ تھا۔"

جو شعر خمخانہ جاوید سے ماخوذ ہیں اور مخطوطے میں نہیں ہیں، ان کے سامنے (خ) لکھ دیا ہے یا حاشیے پر نوٹ دے دیا ہے۔ یہ اسلیے ہے کہ مخطوطے کے اشعار اور مطبوعہ اشعار میں امتیاز ہو سکے۔ ایک شعر فغان دہلی سے ماخوذ ہے۔ اس کے آگے (ف) لکھ دیا ہے۔ فارسی کے پانچوں شعر، انتخاب یادگار سے ماخوذ ہیں۔

باقر علیخاں کامل کا کلام تو اتنا بھی نہیں ملتا۔ ناچار فغان دہلی کی ایک غزل، اور ایک مسدس شہر آشوب، اور سخن شعرا، میں درج، دو اشعار پر قناعت کرنی پڑی۔ ان کو بھی آخر میں شامل کر دیا ہے — کامل اور شاداں کے مفصل حالات کے لیے مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب، اور ذکر غالب، مرتبہ مالک رام صاحب دیکھیے، اس مختصر سی تحریر میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بیشتر انھیں سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان دونوں کتابوں میں خصوصاً مکاتیب غالب، میں ساری ضروری تفصیلات درج ہیں اس لیے ان کا اعادہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جو لوگ کامل و شاداں کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرنا چاہیں، وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصیدہ در مدحِ جناب نواب محمد کلب علیخاں صاحب بہادر، دام اقبالہٗ

سبز و شاداب چمن میں ہیں امیدوں کے نہال
تجھ سے ہے کلب علی خاں چمنِ دہر نہال

سعدِ اکبر کو ملا تیری قلمرو میں شرف
نظر آتے نہیں شادی کے سوا رنج و ملال

تو وہ ہے جو کہ بس اک دم میں لٹا دے سب کو
تیری نظروں میں ہے قاروں کا خزانہ کیا مال

تیرے ہی لطف سے رہتی ہے رعایا خرسند
ورنہ چلتا ہے فلک تو وہی اک ظلم کی چال

فی المثل وہ ہے اگر ذرہ تو، تو ہے خورشید
عدلِ کسریٰ کو ترے عدل سے کیا دیجے مثال

بس کہ مشہور ہوئی داد پژوہی تیری
اب کوئی ظلم کسی پر کرے، کیا پائے مجال

ظلمت و ظلم کہاں تیرے قلمرو میں رہیں
تجھ سا جب مسندِ اقبال پہ ہو مہر جمال

عندلیبانِ خوش الحاں ہیں چمن میں خوش خوش
ڈر خزاں کا ہے، نہ صیاد کا کچھ دل میں خیال

گرگ کو کہتے ہیں چوپائے کہ جاتا ہے کہاں؟
شیر کو دیکھ کے، پاس اپنے بلاتے ہیں غزال

جلوہ گر شام میں ہے، صورتِ صبحِ امید
اس زمانے میں نہیں مہر کو آسیبِ زوال

تو وہ بزمی ہے کہ ہمسر نہیں پرویز ترا
تو وہ رزمی ہے کہ رستم کو نہیں تابِ جدال

بحرِ زخار، ترے علم کی تشبیہ ہے تام
بارِ احساں ہے، ترے حلم کی گویا تمثال

جو تری رائے ہو، اس میں غلطی کیوں کر ہو
تجھ پہ کھل جاتا ہے آغاز میں ہر شے کا مآل

فخر کیوں کر نہ ارسطو کو ہو یکتائی کا
تجھ کو دانش میں ارسطو سے اگر دیجے مثال

کیا بیاں اسپِ سبک بار کی تیرے رفتار
گرد کے ساتھ پہنچتا نہیں صرصر کا خیال

کیا لکھے فیل کے اوصاف ترے، مدح نگار
کہ بلندی میں ہے کیواں، تو وہ ہیکل میں جبال

عرض کرتا ہوں غزل شوقِ غزل سنجی میں
گو کہ مانع ہے مجھے، میری پریشانی حال

غزل

فتنۂ حشر سے بڑھ کر ہے اگر یار کی چال
اپنے نالے بھی کچھ اچھا نہیں رکھتے ہیں مآل

غم تو کیا، شوق بھی بے تاب کیا کرتا ہے
اپنے نزدیک تو ہے ایک فراق اور وصال

کہتی ہے لذتِ سوزِ غمِ پنہاں مجھ سے
ہاتھ آجائے تو فردوس کو دوزخ ہی میں ڈال

وصلِ دلدار میسر ہو، کہ موت آجائے
اے فلک کوئی تو ارمان ہمارا بھی نکال

نگہِ شرم کہے دیتی ہے سارے اسرار
آپ ہم بزمیِ دشمن کا نہ کیجیے اقبال

چپ اُسے دیکھتے ہی رہ گئے اہلِ محشر
جرمِ الفت کا کسی نے نہ کیا ہم سے سوال

خاک ہونا تھا ہمیں کوئے بتاں میں آکے
قیس و فرہاد کو الفت نے دیئے دشت و جبال

مدح سنجی میں اِن اشعار سے کیا مطلب تھا
لیکن اس پردے میں منظور ہے عرضِ احوال

تو کرے ذرہ نوازی تو شرف حاصل ہو
ورنہ یاں کوکبِ امید کو حاصل ہے وبال

شرم آتی ہے بیاں کرتے ہوئے خستہ دلی   میری صورت سے ہویدا ہے مری صورتِ حال
جب وظیفہ ہو مرا بند، تو پھر اے داور   رمضاں کیوں نہ رہے غرّۂ ماہِ شوال
جز ترے فیضِ کرم کے نہیں چارہ کوئی   کر دیا چرخ نے سب خرمنِ راحت پامال
ابرِ بخشش کو ذرا حکم، کہ برسے مجھ پر   تاکہ سرسبز ہو پھر میرا ریاضِ آمال
غور کر غور، کہ کیوں کر سخن آرا ہو زباں   دل ہی قابو میں نہیں ہو، تو ہو کیا تابِ مقال
جی میں سب کچھ ہے، مگر، ختم دعا پہ ہے سخن   کہ ہے شاداں کی زباں کثرتِ آلام سے لال
تا رہے بے ہنروں کو حسدِ اہلِ ہنر (ق)   نظرِ اہلِ جہاں میں رہے تا قدرِ کمال
تیرے حسّاد ہوں، پامالِ ہجومِ ادبار   تیرے احباب کے سر پر رہے ظلِ اقبال

مجھ سے حیرت میں سوا کیوں نہ ہو قاتل میرا   دیکھتا کوئی تڑپنا دمِ بسمل میرا
آئنہ دیکھ کے کہتے ہیں یہ منہ پھیر کے وہ   کوئی کھینچے لیے جاتا ہے اُدھر دل میرا
بے خودی میں ہے تجسس مجھے اپنا، لیکن   اک قدم بھی نہیں پڑتا سوئے منزل میرا
کثرتِ غم سے نہیں کوئی جگہ سینے میں   پھیر بھی دے وہ ستم گار اگر دل میرا
حد سے ہر چیز کو ہے بڑھ کے زوال بعید   سہل ہے، کام جہاں تک کہ ہو مشکل میرا
جستجو اپنی حقیقت کی ازل سے ہے مجھے   ہوں میں وہ بحر کہ پیدا نہیں ساحل میرا
آئینہ توڑ کے کہتا ہے وہ مغرورِ جمال   اور بھی کوئی جہاں میں ہے مقابل میرا
ناز کرنا تو ذرا اس پہ سمجھ کر کرنا   آپ کی طبع سے نازک ہے سوا دل میرا

پہلے ہی مست مئے عشق سے ہے دل میرا   بے خودی کام نہ کر اور بھی مشکل میرا
خود بخود گم ہوئے جاتے ہیں مرے ہوش و حواس   پھر مجھے دیکھیے جائے کہاں دل میرا
میری آشفتگیِ طبع کہے دیتی ہے   حشر تک زلف کے پھندے میں رہے دل میرا
یہ بھی ہو جائے گا کاکل میں شکن کی صورت   کوئی نقصاں نہیں، رکھ لوگے اگر دل میرا

پردہ اٹھا ہوا ہے رُخِ پُر جمال کا   اُڑتا ہے آج رنگ ہمارے خیال کا
کس کی زباں پہ ذکر نہیں میرے حال کا   باعث ہوئی ہے میری خموشی مقال کا
میری نگاہِ شوق پھر آئی، مگر کہیں   نظّارہ ساز غیر ہے، اُس کے جمال کا!
کیا اِس پہ پڑ گئی کوئی اس کی نگاہِ شوخ؟   بدلا ہوا ہے طور جو قاصد کی چال کا[۱]
ٹھوکر سے اُس کی، خاک پہ ملتا نہیں دماغ   ہے آسماں پہ پاؤں ہر اک پائمال کا
ہم بے خودوں سے دور ہے یہ بزمِ آگہی   دل بجھ گیا ہے سینے میں شمعِ خیال کا
تابش اگرچہ مہر میں ہے، لیکن اے فلک   دیکھا کہاں ہے سینہ کسی خستہ حال کا
اُڑنے سے رنگ کے، یہ شبِ وصل وہم ہے   بگڑے نہ رنگ اور بھی صبحِ وصال کا
ایسا نہ ہو کچھ ضعف، کہ اُس در کی راہ میں   دم ٹوٹ جائے غیر کے گھر پر خیال کا

۱؎ خ، بدلا ہوا جو طور ہے۔

ہیں اہلِ بزم ہاتھ جگر پر دھرے ہوئے
کچھ ذکر آ گیا ہے وہاں میرے حال کا

کس ناتواں کا سایہ پڑا روزِ ہجر پر
سو حشر ہو کے وقت نہ پہنچا زوال کا

خاموشی اک بیاں ہے مرے رازِ عشق کو
رنگِ شکستہ آئنہ ہے میرے حال کا

صد خامشی نہ ایک مرا حرفِ مدعا (کذا)
قایل ہوں آپ اپنی میں طرزِ مقال کا

اب تک تو بے خودی سے نہیں مجھ پہ کچھ کھلا
مشتاق گو ازل سے ہوں میں اپنے حال کا

اٹھا میں سن کے غلغلۂ حشر کو عبث
دھوکا ہوا مجھے اسی کافر کی چال کا

پرتو فگن ہے حسن کسی کا جو سینے میں
کچھ رنگ اور ہی ہے ہمارے خیال کا

اے اہلِ بزم! خاک کو میری نہ پھینکنا
پروانہ ہوں کسی کے فروغِ جمال کا

بیمارِ رنجِ ہجر ہے، بچنا محال ہے
یہ ماجرا ہے آپ کے شاداں کے حال کا

عالم نہ مجھ سے پوچھیے میرے خیال کا
آئینہ بن گیا ہوں کسی کے جمال کا

کیا پوچھتے ہو حالِ دلِ پائمال کا
مشتاق پھر ہے ایک قیامت کی چال کا

ہم تو شبِ فراق ہی میں ہو گئے تمام
دینا پڑا حساب نہ کچھ ماہ و سال کا

سب انقلاب اسی کی نگہ کے (ہیں) دہر میں
پابند ہے فلک تو وہی ایک حال کا

میں کہہ رہا ہوں اپنی سیہ بختیِ فراق
چہرہ سفید کیوں نہیں شامِ وصال کا

نورِ نظر تلاش میں یوسف کی کھو دیا
اللہ رے شوق دیدۂ عاشق جمال کا

واں خامشی نے قفل دہن پر لگا دیا
یاں شوق سے ہجوم ہے لب پر سوال کا

کثرت سے حسرتوں کی ملا اور تازہ غم
دل میں مرے گزر نہیں اس کے خیال کا

میں نالہ کرتے کرتے جہاں سے گزر گیا
واں ذکر بھی ہوا نہ کبھی میرے حال کا

ہاں زلفِ یار! تو نے رکھا دل کو میہماں
احساں ہے میرے سر پہ ترے بال بال کا

سنتے بھی جاؤ، آئے ہو مدت کے بعد تم
قصہ ہے مختصر سا مری عرضِ حال کا

بھڑکے اگر چراغ تو ہستی تمام ہو
ہر چیز کا کمال ہے باعث زوال کا

اس بے کسی سے جان نہ کیوں کر لبوں پہ آئے
رونا پڑا ہے آپ مجھے اپنے حال کا

شاداں کو کچھ گرا ہوا سمجھو نہ اہلِ بزم
یہ شخص بھی جہان میں ہے اب کمال کا

منظور جب سے یار کا وصفِ دہن ہوا
عنقا مثال گم مرے منہ میں سخن ہوا

مجھ کو ہی چارہ گر پہ نہ آئی فقط ہنسی
زخمِ جگر بھی دیکھ کے کچھ خندہ زن ہوا

تم اور شریکِ محفلِ اعدا! غلط غلط
میں اور یہ خیال! یہ کیا تم کو ظن ہوا؟

میرا ہی لاغری سے نہ پایا نشاں مگر
کیا کیا نہ تنگ میرے لیے پیرہن ہوا

ہوں وہ گرفتہ دل کہ کبھی میرے حال پر
زخمِ جگر بھی تو نہ مرا خندہ زن ہوا

جنبش زباں کو سامنے اُن کے نہ ہو سکی
سو داستانِ ہجر مجھے اک سخن ہوا

ہوتے وہ بات بات پہ دشمن سے ہم کلام
حکمت یہ ہو گئی کہ نہ ان کے دہن ہوا

چیں پڑ گئی جو اُس کی جبیں پر عتاب میں
بے چین نازکی سے وہ نازک بدن ہوا

ممکن نہیں اشارے سے اقرار وصل کا
کچھ خامشی سے آپ کا ثابت دہن ہوا

جب خامشی کے واسطے پیدا دہن ہوا
کس منہ سے یہ کہوں کہ وہ پیماں شکن ہوا

مضبوط ہو کے ٹوٹ گیا رشتۂ حیات
وہ شوخ وعدہ کر کے جو پیماں شکن ہوا

سو جائے ٹھہرتا ہے نقاہت سے تا بہ لب
اب تو ہمارا نالہ بھی اُن کا سخن ہوا

منہ دیکھتے ہیں بزم میں حیرت سے سب کے سب
عارض تمہارا آئینۂ انجمن ہوا

سمجھے تھے قتل ہو کے سبکدوش ہو گئے
تن پر ہمارے بوجھ، ہمارا کفن ہوا

اُس کو تو کاٹنا تھا زمانہ فراق کا
فرہاد بے سبب تو نہیں کوہ کن ہوا

میری زبان بھی کھنچنے لگی مجھ سے خود بخود
وہ بے وفا جو مجھ سے ذرا ہم سخن ہوا

میرے جلانے کو وہ سناتے ہیں بعدِ قتل
اغیار کی طرف سے تمہارا کفن ہوا

شاداں بھلا تم ایسے کہاں کے ہو خوش بیاں
لوگوں کو کیوں پسند تمہارا سخن ہوا

نہاں پاتا ہے نظروں سے جو وہ ظالم دہن اپنا
تو بس حکمِ قضا ہی جانتا ہے ہر سخن اپنا

میں کس صورت سے واں جاؤں، وہ کیونکر مجھ کو بلوائیں
مجھے رشکِ عدو مانع، انھیں پاسِ سخن اپنا

یہ شدت ناتوانی کی، یہ عادت ہے خموشی کی
کہ دم لیتا ہوا آتا ہے لب تک ہر سخن اپنا

وہ کہتے ہیں کہ ہاں اقرار کر کے ہم مکرتے ہیں!
کہ جو چاہا کہا ہم نے، زباں اپنی، دہن اپنا

نہاں رہتا ہے مطلب بھی دہن پوشیدہ ہونے سے
کہ کھوئے جاتے ہیں پہروں وہ خود کہہ کر سخن اپنا

یا وہ مجھ پر مہرباں، یا غیر پر برہم ہوا
آج دردِ دل مرے سینے میں کچھ کچھ کم ہوا

اتنے غم لکھے تھے قسمت میں مری روزِ ازل
مجھ پہ وہ گزرا ہوا ہے، جو کسی کو غم ہوا

سو چکے جب ہم تو کی تاثیر آہ و نالے نے
پوچھتا ہے وہ کہ اس کا شور و غل کیوں کم ہوا

حالِ دل کس سے کہوں اب، وائے قسمت کیا کروں!
باتیں سن سن کر مری، مجھ سا مرا ہمدم ہوا

بڑھ گئی میری سیہ بختی سے اُس کی تیرگی
میرے مرنے کا شبِ ہجراں کو بھی ماتم ہوا

درد و غم سارے جہاں کے ایک اس میں جمع ہیں
سینۂ عاشق نہ ٹھہرا، خانۂ ماتم ہوا

سو جگہ رک رک کے آئی تا بہ لب میرے دعا
میرے سینے میں شبِ غم، یہ ہجومِ غم ہوا

جب ہوئی حد سے فزوں تکلیف، راحت ہو گئی
درد اتنا بڑھ گیا میرا کہ گویا کم ہوا

بھیج کر خط اُس کو، شاداں کیا خوشی حاصل ہوئی!
اور الٹا نامہ بر کا ہم کو رنج و غم ہوا

ہے رنگِ عشق رخ سے عیاں، دیکھ لیجیے
یہ دردِ دل نہیں کہ سنایا نہ جائے گا

مطلب یہ بے خودی سے ہے ہم کو، کہ کوئی شخص
پوچھے اُسے، تو ہم سے بتایا نہ جائے گا

قاصد کے آتے آتے، ہم اتنے ہوئے ضعیف
اک حرف اُس کے خط کا اُٹھایا نہ جائے گا

ذوقِ نظارہ سے نہیں باقی ادب کا نام خ
سر مجھ سے زیرِ تیغ جھکایا نہ جائے گا

شاداں نے دل لگا کے بتوں سے بُرا کیا خ
اُس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

جب تک نہ آیا سامنے، کھولی نہ اپنی آنکھ
یعقوب کو یہ شوق تھا یوسف کی دید کا

ہاں اضطرابِ شوق! ذرا تھم، کہ بے طرح
دامن چلا ہے ہاتھ سے صبر و امید کا

جو رُخ نقاب میں نظر سوزِ وہم ہو (کذا)
کیا حوصلہ نگاہ کو ہو اُس کی دید کا

کیا سارے ظلم ہو چکے اے چرخ؟ دیر سے
میں منتظر ہوں آج جفائے جدید کا

اے شیخ! دیر و کعبہ میں کیا امتیاز ہے؟
کچھ فرق ان میں ہے تو قریب و بعید کا

ہے روزِ وعدہ کو بھی، شبِ غم گنا کیا
چھایا یہ دودِ آہِ دلِ نا امید کا

دیکھوں کبھی جو صورتِ شامِ وصالِ یار
پھر دیکھنا نصیب نہ ہو صبحِ عید کا

پوچھے ہزار داورِ روزِ جزا، مگر
میں اور شکوہ اُن کی جفائے شدید کا!

خط پرزے پرزے، اور ہوا قتل نامہ بر
عنوان یہ ہوا مرے خط کی رسید کا

تھا شرمِ سخت جانی سے ایسا عرق عرق
خنجر سے گر رہا ہے پسینہ شہید کا

وہ خفتہ بخت ہوں کہ شبِ ہجر کے سوا
دیکھا کبھی نہ خواب میں منہ صبحِ عید کا

پوچھا نہ بعدِ عشق کے کسی نے کلیم سے
باقی ہے حوصلہ ابھی کچھ اُس کی دید کا

کچھ بھی تو اُن کے قول کو دیکھا نہیں ثبات
اے دل ہو خاک ہم کو بھروسا امید کا

غیر اور ایک تازہ خوشی لحظ لحظ، ہائے!
میں اور ایک رنجِ زمانِ مدید کا!

آیا ہے آج میری طرح وہ بھی بدحواس
قاصد سے خاک لطف ہے گفت و شنید کا

ہے مژدۂ وصل اب مجھے پیغامِ قضا کا[1]
عادی ہوں غم و رنج کا، خوگر ہوں جفا کا

خلوت میں زلیخا سے چھٹا دامنِ یوسف
اوچھا جو ذرا ہاتھ پڑا بختِ رسا کا

چھوٹے نہ غم و رنج سے ہم بعدِ فنا بھی
ہے تعزیتِ عشق، تو ماتم ہے وفا کا

نازک ہے وہ کتنا کہ تصور میں بھی میرے
آنکھوں سے اٹھایا نہ گیا پردہ حیا ن

یاں ضعف سے رنگ اڑ نہ سکا، اور وہ سمجھا
ہے رنگ کچھ اچھا ہدفِ تیرِ قضا کا

ہے فتح ہزیمت بھی بتوں کی، کہ جہاں کو
پھر ناصحِ مژگاں کا ہے پیغام قضا کا

محشر کو سنے گا نہ کوئی صور کی آواز
ہے شور جو برپا ہی مرے نالوں کی صدا کا

پایا نہ فروغ آگے شبِ ہجر کے ہرگز
چمکا نہ ستارہ سحرِ روزِ جزا کا

اُس گل کا تصور تھا جو آنکھوں میں دمِ نزع
گویا دمِ آخر مرا، جھونکا تھا صبا کا

---

[1] یہاں سے آخر ردیفِ الف تک، جملہ اشعار خمخانۂ جاوید سے ماخوذ ہیں۔

وہ معنیِ روشن کی تجلّی ہے کہ شاداںؔ
باطن ہے، ہر اک شعر مرا، اہلِ صفا کا

تری لافِ نازکی کا مجھے اعتبار رہتا
ترا تیر او ستمگر جو نہ دل کے پار ہوتا

تری ہر ادا پہ مرتا، ترے ہر سخن پہ جیتا
مجھے موت زندگی پر اگر اختیار ہوتا

انھیں بے حجابیاں تھیں مری بیخودی کے باعث
کبھی آپ میں نہ آتا، جو میں ہوشیار ہوتا

مری خاک ہو تسلّی ترے وعدۂ غلط پر
تجھے گر ہنسی نہ آتی، مجھے اعتبار ہوتا

مدد اے بخت! کہ سب کام بنے جاتے ہیں
گریہ ہی کچھ اثرِ نالۂ و فریاد رہا

مژدہ اے یاس! کہ پھر آئی مصیبت دل پر
حسرت اے دل! کہ انھیں وعدہ نہ پھر یاد رہا

غیروں پہ ہیں وہ لطف کہ بڑھتے ہیں ہمیشہ
ہم پر یہ ستم ہے، کہ سوا ہو نہیں سکتا

دلِ مضطرب کا ہے اپنے قصور
نشانہ جو اُن کا خطا ہو گیا

نہ جاگا روزِ جزا میں بھی خوابِ شیریں سے
ہنوز طالعِ خفتہ ہے نوجواں میرا

سر مرا جب کہ تہِ زانوئے قاتل آیا
اک مزہ وصل کا مجھ کو دمِ بسمل آیا

اُس کے کوچے سے نہ نکلا کوئی بچ کر ہرگز
کشتہ نکلا کوئی واں سے، کوئی گھائل آیا

ایک سکتے کا سا عالم ہوا سب کو شاداںؔ
آج محفل میں جو وہ حور شمائل آیا

ہے تصور میں ہمارے، روئے دلبر کا جواب
بن گیا ہے دل بھی اپنا آئنہ گر کا جواب

پڑھ کے میری داستانِ حرق، قاصد سے کہا
خامشی سے بڑھ کے کیا دوں اپنے دفتر کا جواب

بختِ خفتہ نے شبِ فرقت میں کروٹ بھی نہ لی
گرچہ نالہ بن گیا ہے صورِ محشر کا جواب

کچھ کہا ایسا کہ قاصد کہہ رہا ہے دیر سے
کیوں نہ نکلے میرے منہ سے اُس ستمگر کا جواب

چھپ گئے ہم آنکھ سے ساقی کی دورِ بزم میں
ہو گئی تقدیر گردش [illegible] ساغر کا جواب

گم نگاہوں سے کیا یہ ناتوانی نے مجھے
سایۂ عنقا نہیں ہے جسمِ لاغر کا جواب

نامہ بر راہِ عدم ہے کوچۂ جاناں کی راہ
حشر میں سن لیجئے تجھ سے اُس ستمگر کا جواب

حشر تک ہوتا نہ دیدارِ رخِ جاناں نصیب
آئنہ ہوتا اگر میرے مقدر کا جواب

جذبِ شوقِ قتل سے لب تک مگر آتا نہیں
دل میں میرے پھر رہا ہے اُس کے خنجر کا جواب

کوہ کن نے عمر کاٹی اپنی اس امید پر
پر نہ نکلا اک دلِ شیریں کے پتھر کا جواب

اضطرابِ شوق سے کرتا ہوں میں پیہم سوال
اب تک بھی پورا نہیں ہے اُس ستمگر کا جواب

عکس سے اُس سنگدل کے تصوّر سے دل ٹوٹ جائے
آئینہ بن جائے گر سدِّ سکندر کا جواب

جس[۱] کے نقشِ پا پہ شاداںؔ ہوتے ہیں فتنے نثار
ہو کہاں سکتا ہے محشر اس کی ٹھوکر کا جواب

بھول جاؤ گے سب خوشی شاداںؔ (رخ)
کسی غمگیں سے جب ملیں گے آپ

کس جائے ہوا میرے تصوّر کا گزر آج!
آتی نہیں جو اپنی حقیقت بھی نظر آج

بے کس کوئی دنیا سے ہے سرگرمِ سفر آج
اے بے خبری! تجھ کو کسی کی ہے خبر آج؟

ہیں شامِ شبِ وصل میں آثار سحر کے
ملتا ہے شبِ غم کی دعاؤں کا اثر آج

آتے ہیں وہ بے پردہ قیامت ہیں یہ جوبن
بن جائے نہ موسیٰ کی نظر میری نظر آج

پیدا ہوا کیا اور کوئی روزِ مصیبت
آتی ہے نظر کیوں شبِ ہجراں کی سحر آج

اس موت پہ قربان کروں زندگیِ خضر
اس کوچے میں پہنچی ہے مرنے کی خبر آج

کل ہو کے دوچار اُس نگہِ شوخ سے یارب
آنکھوں میں ٹھہرتی ہی نہیں میری نظر آج

وہ دیکھنے آتے ہیں مرے حالِ زبوں کو
اچھا ہے جو بڑھ جائے مرا دردِ جگر آج

رخصت ہوئے جاتے ہیں مرے ہوش و خرد کیوں
اے بے خودیِ شوق! ارادہ ہے کدھر آج!

برسوں میں نظر آئی ہے شامِ شبِ عشرت
یارب رہے کچھ دور گماں سے بھی سحر آج

روتا ہے مرے حال پہ کیوں چارہ گر اتنا
اشکوں سے نہ بھر جائے مرا زخمِ جگر آج

دیکھا ہے مری بے خودیِ شوق کو تو نے
قاصد نہ رہے گی تجھے اپنی بھی خبر آج

گو جاتے ہیں آہستہ نزاکت سے وہ لیکن
دوڑی ہوئی جاتی ہے خوشی غیر کے گھر آج

برسوں میں ہوا سامنا محشر میں جو مجھ سے
منہ دامنِ خجلت سے چھپاتی ہے سحر آج

یاں جنبشِ لب کی بھی نہیں ضعف سے طاقت (رخ)
مشتاق ہے گو میری دعاؤں کا اثر آج

پڑ جائے اگر سروِ قدِ یار کا سایہ (〃)
آ جائے مرے نخلِ تمنا میں ثمر آج

وہ خوگرِ غم ہوں کہ بھر آئے وہیں آنسو (〃)
مجھ پر جو تبسم ہوا زخمِ جگر آج

کل تک بھی مجھے تاب تھی کچھ کہنے کی شاداںؔ (〃)
آتے ہیں وہ سننے کو مرا دردِ جگر آج

افعیِ کاکل کی تو تصویر کھینچ
گرد میرے حلقۂ زنجیر کھینچ

آرزو کوئی نکل جائے نہ ساتھ
میرے سینے سے نہ قاتل تیر کھینچ

ہم نشیں دیکھی مری دیوانگی
اور پاؤں سے مرے زنجیر کھینچ

بد دعا عشاق کی اچھی نہیں
دور اپنے کو ذرا تاثیر کھینچ

---

۱ مصرعِ اول مطابق خم خانہ ہے! مخطوطے میں یہ اس طرح ہے ع اس کے نقشِ پا پہ فتنے ہوتے ہیں شاداںؔ نثار۔

نہ پہچانا[1] اُس نے مجھے روزِ وعدہ خوشی نے دیا رنج صورت بدل کر
ٹھکانا نہ ہو جب کسی دل میں اے دل کہاں جائے سینے سے ارماں نکل کر
گرا ہے ابھی نالہ ناطاقتی سے ذرا دل سے اے آہ اٹھنا سنبھل کر
غضب نارسائی کا مضمون ہے خط میں کہ پھر آیا قاصد بھی کچھ راہ چل کر
دلِ مضطرب بھی ہے پہلو میں قاتل ذرا پاؤں سینے پہ رکھنا سنبھل کر
پھر آنا نزاکت سے دشوار ہوگا نہ جاؤ مرے دل سے باہر نکل کر
رگِ جاں گلے مل رہی ہوگی شاید رُکی ہے جو تلوار قاتل کی چل کر
ٹھہرتی ہے سو جائے ناطاقتی سے نگہ بھی مری آنکھ سے اب نکل کر
چھپائے ہوئے دامنِ شب سے منہ کو شبِ غم گئی صبحِ محشر نکل کر

یہ بھری ہوئی تھی شوخی کہ تمہارے گھر سے یاں تک (رخ)، کہیں نامہ بر کے منہ پر نہ رکا جواب ہرگز

ہوئے دوچار اپنے عکس سے وہ نہ پیشِ آئینہ کوئی صورت (رخ)، کہ بن گئی تھی نگاہِ شوخ اُن کے حق میں اُن کی نقابِ عارض

شبِ ہجراں میں یہ تڑپا میں سحر ہونے تک مل گیا خاک میں اُس بُت کو خبر ہونے تک
گر یہی جنبشِ مژگاں کے اشارے ہوں گے دل نکل جائے گا پہلو سے نظر ہونے تک
وہ یہ کہتے ہیں، جو کرتے ہو دعا بھی کر لو ہم مزہ تم کو دکھا دیں گے اثر ہونے تک
تم تو آتے ہی رہے بہرِ عیادت اور ہم مر گئے چارۂ آزارِ جگر ہونے تک
مژدۂ وصل ہی لاتا ہو اگرچہ قاصد کیا بچوں گا ترے آنے کی خبر ہونے تک
رفتہ رفتہ رُخِ تاباں سے اٹھاؤ پردہ چاہیے عرصہ مجھے تابِ نظر ہونے تک
دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے اُن سے[2] اچھی رنگ کھل جائے گا اس کا بھی سحر ہونے تک
شام تک گریہ وزاری میں بسر ہوتی ہے اور بھی جان پہ بنتی ہے سحر ہونے تک
جلد شاداں کی خبر لے کہیں ظالم! ورنہ (رخ)، گزرے گا جان سے وہ تیرا گزر ہونے تک

جس آرزو کا مقدر میں تھا نہ بر آنا (رخ)، وہی ہوئی دلِ ناکامیاب میں داخل

کب میں ہر وقت خیالِ قدِ جاناں میں نہیں کب قیامت مرے سر پر شبِ ہجراں میں نہیں
جیسے دو نفیوں میں اثبات ہے ثابت ابدہد! ہم نے اکثر یونہی دیکھی تری ہاں ہاں میں نہیں
نظر آتا ہی نہیں تجھ سا کوئی اور مجھے ورنہ کیا کچھ مرے اس دیدۂ حیراں میں نہیں

---

[1] خمخانہ میں یہ مصرع یوں ہے ع شبِ وعدہ وہ اس نے نہ پہچانا مجھ کو۔ [2] مصرع مطابق خمخانہ درج کیا گیا ہے، مخطوطے میں "یا شمع ہے بہتر ان سے" ہے۔

کیونکر بچے بے جاؤں گناہوں کو قیامت میں خدا — اتنی وسعت نظر آئی مرے داماں میں نہیں
ہاتھ میرا جو گریباں پہ بڑھا جاتا ہے — غیر کا منہ تو کہیں اپنے گریباں میں نہیں

ہر لحظہ سدِّ راہ جو میری فغاں کے ہیں — سینے میں یہ بھرے ہوئے ارماں کہاں کے ہیں
بدنامی[1] اس کی کھوئی مرے دودِ آہ نے — پردے میں اب تو مجھ پہ ستم آسماں کے ہیں
جاگا ہے پاسبانِ درِ یار رات بھر — الٹے اثر نصیب میں میری فغاں کے ہیں
رنج ایک دل میں میرے زمانے کے بھر گئے — دل ایک زلف میں تری سارے جہاں کے ہیں
میں ناتواں ہوں اور وہ نازک شبِ وصال — پردے کبھی نہ اٹھیں گے جو درمیاں کے ہیں
اے ضعف! دیکھ بھال کے مجھ کو گرائیو — نزدیک دشمنوں کے بھی گھر اس مکاں کے ہیں
کیا اُن سے اُٹھ سکیں گی نہ باتیں رقیب کی؟ — میں بھی تو دیکھوں ایسے وہ نازک کہاں کے ہیں
میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا — وہ پوچھتے ہیں[2] مجھ سے یہ قصے کہاں کے ہیں
گھر سے گئے ہیں یا کہیں باہر سے آئے ہیں — کچھ ہوش آج بگڑے ہوئے پاسباں کے ہیں
کس نازکی سے آتے ہیں میری خبر کو وہ — گویا قدم یہ مجھ سے کسی ناتواں کے ہیں
روتے ہیں آ کے قبر پہ غیروں کے ساتھ وہ — کیا کیا مٹانے والے ہمارے نشاں کے ہیں
کافی ہے نیند بھر نے کو میری شبِ فراق — گو خواب میرے بخت کو سارے جہاں کے ہیں
دیکھا ہے میں نے خوب مریدوں کو شیخ کے (رخ) — اچھے وہی ہیں، یار جو پیرِ مغاں کے ہیں
پہلو میں میرے اور یہ پیدا ہوا رقیب (ر) — آثارِ عشق، رخ پہ مرے رازداں کے ہیں
غم ایک میرے دل میں زمانے کے بھر گئے (ر) — دل ایک زلف میں تری سارے جہاں کے ہیں
اے برق وہ جلائے گی کیا آہِ آتشیں (ر) — تنکے بچے ہوئے جو مرے آشیاں کے ہیں
شاداں چھپائے لاکھ، پہ چھپتے بھی ہیں کہیں (ر) — آثار اُس کے چہرے پہ عشقِ بتاں کے ہیں

آفت کا توڑ ہے ترے تیرِ نگاہ میں — پیدا اثر کہاں سے ہو عاشق کی آہ میں
آمد جفائے تازہ کی آتی ہے چرخ سے — جاتا ہے میرا نالہ، تو رکتا ہے راہ میں
یہ ناتواں ہوا ہوں کہ اب کوئے یار تک — میری نظر بھی جائے، تو رہ جائے راہ میں
شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار — کل کی سی بات ہی نہیں طرزِ نگاہ میں
دیکھی ہوئی ہے تیری درازی شبِ فراق! — کیوں آئے روزِ حشر ہماری نگاہ میں
کیا بھید ہے کہ روز وہ آ کر یہ کہتے ہیں — بتلاؤ، کچھ اثر بھی ہوا تیری آہ میں؟
سایہ ہوا ہے غیر کی محفل کا دودِ آہ — لکھا ہوا تھا یہ مرے بختِ سیاہ میں
تعزیر اپنے ہاتھ سے دیتے ہیں بار بار (رخ) — ملتی ہیں راحتیں مجھے کیسی گناہ میں

---

[1] رخ، بدنامی اس کی کیوں کی مرے دردِ آہ نے۔ [2] رخ، وہ پوچھتے ہیں مجھ سے وہ نازک کہاں کے ہیں۔

بجھتے ہیں دور کر کے مری خاک کا گماں (خ) اُڑتی ہوئی جو دیکھتے ہیں گردِ راہ میں
میں ان بتوں کے عشق میں یاں تک سبک ہوا (٫٫) اب خود نہیں سماتا ہوں اپنی نگاہ میں
یہ ناتواں ہوا ہوں کہ اب کوئے یار تک (٫٫) نالہ بھی میرا جائے تو سو جائے راہ میں
ہے کس بھروسے پر تمہیں شاداں امیدِ وصل (٫٫) ہے نالے میں اثر، نہ ہے تاثیر آہ میں

رشک کی بھی ہمیں تو تاب نہیں — شکر ہے، غیر پر عتاب نہیں
لطفِ دیرینہ، خاک یاد رہے! — ستمِ تازہ کا حساب نہیں
ابھی لب پر ہے حالِ دل میرا — ہم نشینوں کو میرے تاب نہیں
کیا تغافل نما تھا کوئی مضموں — یاد قاصد کو کچھ جواب نہیں
ہے ترقیِ حسن ہی پردہ — کچھ اسے حاجتِ نقاب نہیں
اس کی شوخی سے کم نہیں شبِ وصل — گرچہ پہلا سا اضطراب نہیں
بے خودی کام آگئی آخر — کہ انہیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں
اس نے پوچھا تو کیا بتاؤں گا؟ — حسرتوں کا مری حساب نہیں
چپ ہوں سن کر یہ ایک بات اس کی — کہ مجھے طاقتِ جواب نہیں
پھرتی ہے کوئی چیز آنکھوں میں (خ) یہ مرے بخت کا تو خواب نہیں
خیر ہو آج بزم کی شاداں (٫٫) کہ وہ آتے ہیں اور نقاب نہیں

ستم سہنے کی جب تاب و تواں ہو — یہی کیوں ہو، کوئی اور آسماں ہو
قدم رکھیں نہ ہم تو آسماں پر — جو سر رکھنے کو تیرا آستاں ہو
جو وہ پہلو میں میرے ہو تو کیونکر — نہ میری بے خودی سے بدگماں ہو
نہ دنیا میں نہ عقبیٰ میں ہو یارب — شبِ عشرت سحر ایسی نہاں ہو
انھیں آئینے سے ہے بدگمانی — ہمارا حالِ دل کیوں کر عیاں ہو
شبِ غم کی مصیبت کا بیاں ہے — ہماری ختم کیوں کر داستاں ہو
نزاکت سے زیادہ ہے تجلی — وگرنہ تم تو نظروں سے نہاں ہو؟
ہماری ناتوانی دیکھنے کو — وہ آکر پوچھتے ہیں تم کہاں ہو
الٰہی نازکی بڑھ جائے اتنی — کہ اُن کو ناز کرنا بھی گراں ہو
خیالِ آئینہ رہتا ہے ہر دم — کہیں ہو تم، مگر ہوتے کہاں ہو
نگاہِ شوق تم کو دیکھ لے گی — اگر تم لاکھ پردوں میں نہاں ہو
سہو جورِ سپہرِ پیر شاداں — ابھی فضلِ خدا سے تم جواں ہو

کہتے ہیں "عہد شکن سمجھے ہو کیا تم مجھ کو" — وعدے کے ساتھ جو آتا ہے تبسم مجھ کو
کوئی ہنگامہ ہے، یا گھر سے وہ نکلے ہی نہیں — آج آتی ہے نظر کثرتِ مردم مجھ کو

ایک وہ ہیں کہ جو دل چاہے وہ کہتے ہیں مجھے | ایک میں ہوں کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو
کوئی سنتا نہ ہو، اس کی بھی ذرا فکر رہے | شکوۂ غیر سناتے ہو اگر تم مجھ کو
نالۂ [illegible] ہے رنجشِ جاناں منظور | مار ڈالے گی غلط فہمیِ مردم مجھ کو
بے قراری مری یہ، آپ کی شوخی وہ کچھ | میں تمہیں دیکھ سکوں گا نہ کبھی تم مجھ کو
اس قدر کی دہنِ یار کی میں نے تعریف | کہ بس آخر نہ رہی تابِ تکلّم مجھ کو
کہتے ہیں "دیکھتے ہیں آئینہ یوں ہی ہم بھی | جس طرح دیکھتے ہو آنکھ پھیر تم مجھ کو"
میں جو کہتا ہوں کوئی چارہ گر آئے یارب | زخم بھی دیکھ کے کرتے ہیں تبسم مجھ کو
اب تو حالت مری پہنچی ہے کچھ ایسی شاداں | خود وہ کہتے ہیں کہ آتا ہے ترحم مجھ کو
ساقیا جام کے بدلے، دے کوئی خم مجھ کو (رخ) | تاکہ اس بزم میں ہو تابِ تکلّم مجھ کو
اپنے کوچے میں بٹھا دو جو کہیں تم مجھ کو | بسترِ خاک بھی ہو مسندِ قاقم مجھ کو
وہ ادا ہے، نہ وہ غمزہ، نہ وہ شوخی، نہ وہ ناز | آج کچھ اور ہی آتے ہو نظر تم مجھ کو
پوچھتے ہیں کہ "تمنا تو بتاؤ کیا ہے" | جانتے ہیں کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو
جان و دل ہوش و خرد اس کے عوض میں لیلو | صبر اک چیز ہے بے کار، وہ دو تم مجھ کو
کہتے ہو خوئے ستم چھٹ نہیں سکتی مجھ سے | ورنہ آتا ہے بہت تجھ پہ ترحم مجھ کو"
خندہ کیا ہے، نہیں معلوم، ولیکن گاہے | اپنے ہی حال پہ آتا ہے تبسم مجھ کو
بے قراری تو کہے دیتی ہے رازِ پنہاں | یہ خموشی بھی ہے گویا کہ تکلّم مجھ کو
نیش سے چبھتے ہیں سینے میں مرے چار طرف | دل کے بدلے میں ملا ہے کوئی کژدم مجھ کو
میری منت پہ شبِ وصل میں کچھ شرم کیا تھا | دیکھنا اُن کا وہ ہنگامِ تبسم مجھ کو
ناتوانی نے کیا ہے یہ سبک نظروں میں (رخ) | پُتلیاں پھیرتے ہیں دیکھ کے مردم مجھ کو
تم بھی آ جاؤ یکایک تو خبردار نہ ہوں (〃) | بے خودی نے شبِ عشرت یہ کیا گم مجھ کو
بے قراری مری یہ، اُن کی ہے شوخی وہ کچھ (〃) | میں تمہیں دیکھ سکوں گا، نہ کبھی تم مجھ کو
حسرتِ گریہ لگی ہے، نہ کبھی جائے گی (〃) | بخش دے رونے کو یارب کوئی قلزم مجھ کو
ساقیا اس ترے مے خانہ میں رکھا کیا ہے (〃) | خُمِ گردوں کے برابر دے کوئی خُم مجھ کو

کام کیا ہم کو تری رہ میں، کسی رہبر کے ساتھ (رخ) | جب تصور آگے آگے ہو دلِ مضطر کے ساتھ
لاگ اِس ظالم کو ہے ہر عاشقِ مضطر کے ساتھ (〃) | گردشیں گردونِ دوں کی ہیں ہمارے سر کے ساتھ
اُن سے نازک کو بھکنے دے نہ تابوے مرے (〃) | اے طبیعت! ہاں الجھ اچھی طرح دلبر کے ساتھ
اپنی مرگ و زیست پر ہوتا جو ہم کو اختیار (〃) | ہر ادا پر اُن کی مرتے، جیتے ہر ٹھوکر کے ساتھ
نعش پر منہ ڈھانکنے کا ہے بہانہ، ورنہ ہیں (〃) | رنجشیں در پردہ وہ ہی عاشقِ مضطر کے ساتھ
خدمت اُس بُت نے بلا گردانیوں کی دی مجھے (〃) | گردشِ تقدیر سے نکلا مگر چکر کے ساتھ
ہے وہ نازک، خواب میں پہنچے نہ مجھ تک، گر نہ ہو (〃) | جذبِ دل میرا خیالِ قامتِ دلبر کے ساتھ

ہو چکی شیشے میں مے مجھ تک جو آیا دورِ جام (غ) گردشِ قسمت بھی اپنی گردشِ ساغر کے ساتھ
بے ستوں پر آ گئی صورت پرستوں کو نظر (〃) وہ جو اک نسبت دلِ شیریں کو تھی پتھر کے ساتھ
ظرف سے اپنے کہیں ساقی نکل جائے نہ مے (〃) گردنِ مینا جھکائے رکھ ذرا ساغر کے ساتھ
بے خودی نے ضعف میں مجبور ایسا کر دیا (〃) آپ میں آتا ہوں یادِ شوخیِ دلبر کے ساتھ
اضطرابِ دل نے اس رہ میں بڑھایا وہ قدم (〃) نقشِ پا تک بھی نہیں میرا مرے رہبر کے ساتھ

وہ نازکی سے تصور میں آ نہیں سکتے / جو آ گئے، تو مرے دل سے جا نہیں سکتے
وہ پاسبانِ درِ یار تھا کہ جاگ اٹھا / ہمارے بخت کو نالے جگا نہیں سکتے
کسی کی سن کے کہیں کیا، یہ ناتوانی ہے / کہ بات کا بھی مزہ ہم اٹھا نہیں سکتے
وہ حال پوچھنے اُن کی طرف سے آئے ہیں / کہ ایک بات بھی جن کو سنا نہیں سکتے
ہمیں زمانے میں دل سوز مل نہیں سکتے / کسی کو داغِ جگر ہم دکھا نہیں سکتے
پہنچ نہ جائیں دلِ غیر میں کہیں یا رب / کہ میرے سینے میں ارماں سما نہیں سکتے
یہ دشمنوں کی نظر کا ہجوم ہے شاداں / کہ آنکھ بزم میں اُن کی اٹھا نہیں سکتے

وہ نالے میرے کہ جو لب تک آ نہیں سکتے / تمہارا رنگ وہ کیوں کر اڑا نہیں سکتے
دیا ہوا ہے یہ کس کا، کہ فرطِ رشک سے داغ / کسی کو ہم پئے درماں دکھا نہیں سکتے
پڑی ہیں رخ پہ تمہارے جہان کی نظریں / یہ پردہ وہ ہے کہ جس کو اٹھا نہیں سکتے
ہمارا حال کچھ ایسا بیاں سے باہر ہے / کہ لوگ جس کی کہانی بنا نہیں سکتے
بھرے ہیں سینے میں گویا کہ آرزو بن کر / کہ نالے ضعف سے لب تک بھی آ نہیں سکتے
یہ تیرگی شبِ ہجراں کہاں سے لائی ہے / کہ عقل و ہوش کو ہم کھو کے پا نہیں سکتے
یہ کھاتے کھاتے غمِ ہجر بھر گیا ہے جی / کہ اپنا غم ہے مگر آپ کھا نہیں سکتے
[1] وہ رحم خاک کریں، نازکی سے ہیں مجبور / کہ ہاتھ میرے ستم سے اٹھا نہیں سکتے
یہ اپنے ضعف نے کیسا غضب کیا شاداں! / خیالِ یار میں بھی اب تو جا نہیں سکتے

اٹھ کر درِ جاناں سے کہو، کوئی کدھر جائے، / جی سے نہ گزر جائے، تو دنیا سے گزر جائے
دیدار میں وہ لطف جسے دیکھ کے ہو زیست / رفتار میں وہ قہر، کہ جو دیکھے وہ مر جائے
ساغر کشِ میخانۂ توحید ہوں ناصح! / وہ نشہ نہیں مجھ کو، جو باتوں میں اتر جائے
رنجوریِ الفت کا مری پوچھ نہ انجام / آغاز میں وہ درد ہے جو حد سے گزر جائے
کیونکر نہ بڑھے لطفِ شبِ وصلِ عدو کا / عارض پہ تری زلفِ پریشاں جو بکھر جائے
ڈر ہے کہ وہ تکلیف کو اُس کی نہ چلے جائیں / یا رب نہ عدو، میری شبِ وصل میں مر جائے

---

[1] غ، وہ خاک رحم کریں۔

آرایشِ ہر دم سے نہ ہووے جسے فرصت
شاداں کی پریشانی پہ کیوں اُس کی نظر جائے

بےتابیِ عشاق سے کب تجھ کو خبر ہے
ہاں اپنے ہی کچھ حسن و نزاکت پہ نظر ہے

کیا روشنیِ بخت کا یارب یہ اثر ہے؟
شامِ شبِ فرقت مری، ہم شکلِ سحر ہے

پردے میں عبث بیٹھے ہو تم رخ کو چھپائے
دیکھے کوئی تم کو، یہ کسے تابِ نظر ہے

ہر صبح مجھے شامِ غریبی سے ہے بدتر
ہر شام مجھے ایک قیامت کی سحر ہے

کچھ دیکھے تو وہ ہی کمرِ یار کو دیکھے
جس کو دکی) مرے شعروں کے معنی پہ نظر ہے!

کیوں آئینہ دیکھا کہ جبیں پر عرق آیا
اپنا سا ستمگار مگر مدِّ نظر ہے

شاداں نہ ہو رنج و المِ عشقِ بتاں کے
اُس بات کو چھوڑو کہ تمہیں جس کا ضرر ہے

زلف کی بو ادھر نہیں آتی
کیا صبا میرے گھر نہیں آتی؟

نیند اُس بت کے ہجر میں ہم کو
شام سے تا سحر نہیں آتی

جب کہ وہ ہی نظر نہیں آتا
زندگی بھی نظر نہیں آتی

غیر لپٹا رہے وہاں برسے
اور یاں چشم سے لہو برسے

آئینے میں نظر پڑا ہے کیا
نظر آتے ہو کچھ مکدّر سے.

حشر کا حال پوچھتے کیا ہو
دور کر دو نقاب رخ پر سے

چال اُن کی نہ دیکھیے شاداں
خوف کیجیے ذرا تو محشر سے

اُس کے جلوے کے تحیّر نے، تڑپنے نہ دیا
خاک ارمان ہمارے دمِ بسمل نکلے

آئنہ دیکھتے ہیں وہ تو بگڑ جاتے ہیں
چاہتے ہیں کہ نہ کوئی بھی مقابل نکلے

کیا زیادہ پیے ہر روز نے دو چار سبو
آج مے خانے سے شاداں جو خجل نکلے

چال ہی اُس کی نظر میں ہے، تو آفت کیا ہے
اُس کے قامت ہی کو دیکھا تو قیامت کیا ہے

ہائے بےتابیِ شوق اپنی شبِ وصل میں، اور
اُن کا اک ناز سے کہنا کہ مصیبت کیا ہے

یہ بار بار جو پیکاں کو دیکھتے ہو تم (رخ) نکل گئی کوئی کیا آرزو مرے دل کی

مر جاؤں گا اک روز فغاں کرتے ہی کرتے (رخ) حالِ دلِ بےتاب بیاں کرتے ہی کرتے

پورا نہ کہا جائے گا حالِ تبِ ہجراں (") گزرے گی شبِ وصل بیاں کرتے ہی کرتے

محبت نے مجھے کھینچا کہاں سے (خ) کہ میں آیا زمیں پر آسماں سے
سنو! پُر درد ہے حالِ دلِ زار (د) مزہ پاؤ گے تم اِس داستاں سے
بس اب خاموش، کیا کیا کہہ چکے ہو (د) نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے
تم اپنا رنگ آئینے میں دیکھو (د) تمہیں کیا کام رنگِ عاشقاں سے
نشانہ دل ہے، بسم اللہ کیجے (ش) اگر کچھ شوق ہے تیر و کماں سے
بہت سی خاک چھانی تم نے شاداں (د) قدم باہر نہ رکھو اب مکاں سے

دل کسی شخص پہ آجائے، تو کچھ حال کھلے (خ) آپ کیا جانیں کہ عاشق کی طبیعت کیا ہے

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشاں دہلی (ف) کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

آغوشِ گور تنگ شد از بیقراریم ای دل بازپہلو کہ جدا گشتہ ایم ما؟

شرم می آید خیالی را بجنگِ آسماں کاین جوانی ہست و او یک پیر دیرین سال است

چہ احتیاجِ نگہباں بعہدِ دولتِ او کہ پاسبانِ جہاں است طالعِ بیدار
اگر غلط نہ کنم، ناوکش خطا نہ کند رہا کند سوی عنقا اگر بعزمِ شکار

غم تیز در خوشی است کہ فارغ شدہ نگار برجای خود بہ بسترِ خواب آرمیدہ است

قطعۂ تاریخ باقر علیخاں کامل

چو زین غمخانۂ دنیا سفر کرد سوی باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش تحریر گردید بود مینو مکاں باقر علی خاں
۱۲۹۳ھ

کلامِ باقر علی خاں کامل

اٹھانے پڑیں گے نہ ساقی کے ناز کہ پیرِ مغاں آشنا ہو گیا

یاد آنا کسی کے کاکل کا تیرہ سازِ شبِ جدائی ہے

مٹ گیا، پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی لب پہ دہلی ہے، تو نظروں میں ہے شانِ دہلی
اگلے عشقوں کا کہیں چرخ عوض لیتا ہے اب مصیبت میں پڑے ہیں جو محبانِ دہلی

منہ کو اُبلا ہوا آتا ہے کلیجہ، ہے ہے!! ہم نشیں کیونکے بھلا کیجے بیانِ دہلی
جی بہارِ چمنِ دہر پہ کیوں کر دھریے کہ نظر آتی ہے افسوس خزانِ دہلی
غم دیے، رنج دیے، اپنی گرہ سے ظالم چرخ! کیا تو نے دیا، کرکے زیانِ دہلی
اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی شانِ دہلی
ضبط گریے کو یہ دلّی نے کیا ہے، گویا نہیں پانی گھٹ گئی یہ نہر روانِ دہلی
سیل کے گولے پڑے، چرخ سے فتنے برسے منہدم کیونکے نہ ہو جائیں مکانِ دہلی
خانۂ کعبہ کو اب حضرتِ کامل چلیے رہنے کا اب نہ رہا لطف، میانِ دہلی

مسدس شہر آشوب

تمام گلشنِ عیش و سرور تھی دہلی تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلعِ خورشیدِ نور تھی دہلی تمام غیرتِ صد کوہِ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکانِ عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہانِ عیش

ملک صفات تھا یاں کا ہر ایک فردِ بشر بُرا بھی یاں کا، زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا فوق خاصِ دنیا پر یہاں کے نام سے بکتا تھا مس بھی از بہرِ زر
یہ فوجِ باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا، غضب آیا، اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں جو روز عیش میں گزرا، تو شب مسرت میں
پڑے ہوئے ہیں یہ دہلی اب تو رنج و حسرت میں پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادے کہاں! اور وہ بادشاہ کہاں!
رہا جو کوئی، تو وہ مرتبہ، وہ جاہ کہاں!

یہ قلعہ، رشکِ وہ گلستانِ رضواں تھا یہ قلعہ خلد تھا، اس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ تھا، کہ خدایا! کوئی پرستاں تھا! یہ قلعہ، پیکرِ دنیا کے واسطے جاں تھا
نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی، تو ہاں! دردِ دل عیاں کیجے صدائے طائرِ گم گشتہ آشیاں کیجے
حیات بخش کا، گر ماجرا بیاں کیجے تو چاہیے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے
یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ لعل پردہ، کہ تھا جس سے احتشام عیاں خوشی سے خسروِ پرویز ہے جہاں درباں
عوام کو تو وہاں جانے کی مجال کہاں کہ خاص خاص بھی جاتے تھے کس تو سجدہ کناں

جھکے ہی رہتے تھے جس جاے اک جہان کے سر
قدم بھی اب نہیں دھرتا ہے واں کوئی جا کر

یہ وہی چوک ہے! میلہ تھا جس جگہ ہر روز — یہیں تو رہتے تھے مہ طلعتانِ دل افروز
نظر کو ہوتی تھی کیفیتِ سرور اندوز — جدھر کو دیکھیے تھی اک بہارِ کلفت سوز
نشان بھی نہیں اب تو ہجومِ خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقامِ عبرت کا

یہ وہ ہے مسجدِ جامع، کہ جس میں اک جہاں — نماز کے لیے آتا تھا دور دور سے واں
تبرکات جو اس میں تھے کیا ہو ان کا بیاں — ادب سے کرتے تھے اُن کی زیارت اہلِ ایماں
وہ اس کی رونق بازار چار سو مت پوچھ
کہ مجھ سے ہو نہیں سکتی ہے گفتگو مت پوچھ

نہ دیں دار ہے یہ فوج اور نہ دینداری — سیاہ رووں کو آتی تھی بس سیہ کاری
نہ جانتے تھے وہ کچھ بھی بجز ستم کاری — حرام خوروں کو ہر دم تھا شغلِ مے خواری
تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا
ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

وہ لوگ، سیکڑوں رہتے تھے جن کے ساتھ سوار — کیا پیادہ اُنھیں، اے سپہرِ ناہنجار!
اُٹھائیں سر پہ وہ گٹھری کے کس طرح سے بار — اٹھانا ایک قدم کا بھی جن کو ہو دشوار
تہِ زمین جگہ چاہیے اماں کے لیے
دعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیے

نہ چھیڑے کوئی دم، اور نہ ٹھہرے کوئی آن — فسردہ دل ہیں جو کرتے تھے عیش میں گزران
نہ ہوش ہی ہیں ٹھکانے، نہ باقی ہیں اوسان — ذلیل و خوار ہیں، پھرتے ہیں جا بجا حیران
فلک نے پھینک دیا ہے کہاں کہاں اُن کو
بجاے زمزمہ ہے نالہ و فغاں اُن کو

الٰہی بھاگ کے یاں سے کوئی کہاں جاوے — کوئی نظر میں ٹھکانا نہیں جہاں جاوے
کوئی جگہ نہیں، جس جا پہ اماں جاوے — اگر زمین پھٹے، تو سما وہاں جاوے
دکھائی دیتا ہے ہر اک عدوے جان اپنا
بنا ہے دشمنِ جانی، یہ آسماں اپنا

کہاں تلک کوئی اس غم کی داستاں لکھے — کہاں تلک کوئی کیفیتِ فغاں لکھے
کہاں تلک کوئی یہ دردِ خوں چکاں لکھے — کہاں تلک کوئی بیدادِ آسماں لکھے
دعاے کاملِ غمگیں ہو مستجاب، خدا!
بنی ہوئی نہ ہو کوئی جگہ خراب خدا!

ناظر پریس میں چھپوا کر دفتر نگار گھیر سنجی رام پور، یو پی سے شایع کیا

405/1
59

نگار

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستا
مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھ
ایک دورِ ابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص
صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت
بھی ہے۔ اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں بھی کچھ تراجم ہیں اسکے علاو
ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر، خطبات، پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارہ نگار
یہی کوشش کرے گا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب
طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیر
کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر، اور • خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمائیے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے

نگار

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

ضروری اعلان

پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں
رسالہ جاری کردیا جائے گا
نمائندہ نگار ۱۷/۹ این سمن آباد لاہور

جلد (۴۲) — فہرست مضامین جون ۱۹۶۳ء — شمارہ (۶)

ملاحظات		۲
حل الانتقادفی تواریخ سیرۃ عبد العباد	اسحاق انبی خاں	۵
فن داستان نگاری اور باغ و بہار	سید ابو الخیر کشفی	۱۴
توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ	سید مبارز الدین رفعت	۱۹
نامہ و من	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۶
منظومات	غلام ربانی تاباں، امتیاز علی عرشی، سحر رامپوری۔	۳۲
”	غلام ربانی تاباں، صبا اکبر آبادی۔ انجم قریشی رامپوری	۳۳
غالبیہ — تمیر اباب	اکبر علیخاں	۳۴
مطبوعات موصولہ		۴۷

ملاحظات

ابھی ہم میں تحقیقی کاموں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تحقیق جس لگن محنت اور توجہ کا مطالبہ کرتی ہے وہ خود بڑی حد تک حوصلہ شکن ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی راستے کی سختی اور دشوار گزاری کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے منزل کی تحقیر پر کمربستہ ہوجاتے ہیں۔ اردو تحقیق کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ جو لوگ اس میدان میں اپنے کچھ جوہر دکھا سکتے تھے وہ اس سے خائف ہو گئے اور قدم بڑھانے سے پہلے ہی پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔

اردو کے نقادوں میں کم ایسے ہیں جنھوں نے ادب میں تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور جب کبھی وہ یہ ثابت کرنے کے لیے اس طرف آئے ہیں کہ تحقیق بڑا سہل اور آسان ادبی مشغلہ ہے تو اس کا نتیجہ کلیات میر کے پاکستانی اڈیشن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس میں مرتب نے حوالے بہت کچھ دیے ہیں اور ان سے کام کم لیا ہے۔

تحقیق کا اولین مقصود یہ ہے کہ ادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے۔ ہمارے اہل قلم ابھی تک تفہیم و تنقید سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔ رہبر و علم ان میں سے کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح بے بنیاد عمارت کی تعمیر ہوا کرتی ہے۔

اردو والوں کے یہاں کا کلاسیکل ادب ہنوز بے بحث رہا ہے۔ بے بحث اس لیے کہ اس تک پہنچ ہی کس کی ہوئی ہے۔ دو چار شاعروں کے دیوان نولکشور پریس کے طفیل میں سامنے آگئے ہیں۔ مگر اس پر بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ اب ان میں سے اکثر کو غیر مطبوعہ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نولکشور نے لاتعداد کتابیں اردو فارسی کی چھاپ ڈالیں مگر اس عہد میں ترتیب و اشاعت کا وہ فنی شعور کہاں تھا جو آج صاحب نظر تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اڈیشن نہ اغلاط سے پاک ہیں اور نہ تنقیدی (CRITCAL) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اور تو سب کچھ چھوڑیے صرف یہ سوچیے کہ جب تک یہ ذخیرہ دریافت نہ کر لیا جائے اس وقت تک ہم اردو زبان کی لغت کی تدوین بھی نہیں کر سکتے۔ جس زبان کے پاس اپنی لغت تک نہ ہو اس کی کم مایگی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نولکشوری عہد کے بعد جو نصف صدی ہم نے گزاری اس نے ہمارے ذہن کو فنی پختگی نام کی کوئی چیز نہیں دی، اور ہم بیکار رہے۔ اب تو جو کچھ بھی روشنائی سے لکھا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہونا چاہیے۔ اس یقین کے ساتھ اس کی نسبت کسی

غلط شخص سے نہیں کی جا رہی ہے۔ اور اس قسم کی غلطی کا امکان گویا نہ رہے۔ جیسے ایک مشہور نقاد نے میر کے تجزیے میں نواب یار محمد خاں امیر رامپوری کے شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کو بنیاد بنا کر بہت کچھ بے بنیاد باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ یہ غلطیاں بار بار ہوتی رہیں گی۔ ہمارے نقاد مفروضوں پر گزر اوقات کرتے رہیں گے اس وقت تک جب تک انھیں اپنے ورثے کو برتنے کا سلیقہ نہ آ جائے گا۔

آپ کسی ادارے سے بات کیجئے صاحب! میں نے قائم کا دیوان اڈیٹ کیا ہے اور متعدد اہم نسخے سامنے رکھ کر کوشش کی ہے کہ اس کا صحیح متن پیش کر سکوں۔ آپ کا ادارہ اسے چھاپ سکے گا؟ تو پہلے تو یہی امکان کم ہے کہ جواب اثبات میں ہو اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اہلِ تحقیق کے گروپ کو خوش رکھنے کے لیے آمادہ بھی ہوا تو آپ کی اس محنت کا صلہ کیا دے گا۔ ۸ فیصد۔ دس فیصد یا اگر فی صفحہ کی بات ہو تو دو روپیہ فی صفحہ۔ آپ نے مہینوں پسینہ بہایا تھا۔ آنکھیں گھلا گھلا کر [illegible] پرانے نسخوں کو مصیبت جھیل کر پڑھا تھا اور ادھر ادھر آنے جانے میں اپنا روپیہ صرف کیا تھا مگر آپ کو کیا ملا کل تین سو روپے یہ ہماری قدر شناسی اور کاموں کی اہمیت کا احساس ہے۔ جو بنیادی کام ہیں، در حقیقت جن کے ذریعے آئندہ اغلاط کے دروازے بند ہو جاتے ہیں زبان و بیان کا ارتقا سامنے آتا ہے عہد بعہد زبان کی رفتار کا علم ہوتا ہے ادب کی تاریخ بننے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی قیمت ہم نے کل تین سو روپے لگائی۔ لیکن اگر یہی کتاب ۷۔ ۸ الٹے سیدھے مضامین کا مجموعہ ہوتی محض تحریر [illegible] کے مضامین کا تو ان کا معاوضہ مصنف کو ۸ روپے فی صفحہ تک جو بے ترجیح ادا کیا جاتا۔ ہم نے ایک عرصے تک ترجموں کے معاملوں میں برتی دی اب ہم تحقیق کے ساتھ برت رہے ہیں۔ شاید ادبی دنیا میں اب کام کرنے والوں کا امتحان لینے والی چیز تحقیق ہی ہے۔ جو لوگ اس سے متعلق ہیں ان کی بے جگری اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے ــــ بڑے کام اپنے کرنے والوں کی ذاتی تسکین کا ذریعہ کہاں تک بن سکتے ہیں اور تسکین میں بھی تو ایک حد تک دوسروں کی ستائش شامل ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر اور نقاد اور ان کے علاوہ دوسرے ادبی مشاغل والے اکثر داد اور کم بیداد کا شکار ہوتے ہیں۔ ہاں تحقیق کرنے والا گروپ ستائش اور حوصلے سے بے پروا تو ہوتا ہی ہے مگر عام طور پر اس کا مستحق بھی نہیں جانا جاتا۔ جس محنت اور لگن کی زندگی یہ لوگ گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ ابھی پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے معراج العاشقین کو اڈیٹ کیا ہے۔ یہ کتاب برسوں سے ہماری مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل اور اپنے لاتعداد بے معنی جملوں کے ساتھ رائج ہے۔ استاد ہر جملے کی تشریح و توضیح کرتے وقت گل افشانیٔ گفتار سے کام لیتا ہے حالانکہ وہ خود پریشان ہوتا ہے اس کتاب کی بے ربطی سے۔ لیکن آخر کرے تو کیا کرے کلاس میں اس کتاب پر اعتراض کے معنی اپنی کم سوادی پر منتج ہوتے ہیں اور حلقۂ شاگرداں میں بات خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے متن کو صحیح ترین شکل میں پیش کر کے نہایت اہم تشریحی حاشیے لکھے ہیں اور تقریباً تمام ناقابلِ فہم مقامات کو سہل بنا دیا ہے۔ مگر کون ہے جو ان کے کام کی اہمیت کو سمجھے اور پھر اس دماغ سوزی کی داد دے جو انھیں اس کام کے دوران میں کرنی پڑی ہے۔ کیا صرف قاضی عبدالودود صاحب جیسے دو چار احباب کی تحسین و تقریظ ہی پر گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم ان اربابِ تحقیق کی حوصلہ افزائی کریں جو اپنی جانیں کھپاتے ہیں اور میر و مرزا، غالب اور مومن، میر حسن اور سرور کی تخلیقات کی صحیح شکل پیش کر کے ہمیں اس لائق بناتے ہیں کہ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے شاہدِ معنی کے حسن سے لطف اٹھایا جا سکے۔

جدید ایران اور جدید عرب دونوں نے اپنے خزانوں کو زیادہ سے زیادہ مہذب بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں جدید کی بنیاد قدیم پر رکھی جاتی ہے جو آج جدید ہے وہ بھی کل قدیم کے درجے میں آ جائے گا اپنے ورثے کی طرف سے غفلت برت کر ہم اپنے مستقبل کے خود لٹیرے بن جاتے ہیں۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تحقیق کے میدان میں آنے والوں کی ہمت افزائی ہر رخ پر ہو۔

ناشر کی طرف سے باعزت معاوضے کی شکل میں اور کتاب کو حسنِ صورت دے کر۔

قاری کی طرف سے محنت کو سراہ کر اور خریداری کے ذریعے کتاب کو کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے سے بچا کر۔

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کو زندہ رکھنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ فلمی رسالوں کو نہ اشتہاروں کی کمی ہے نہ خریداروں کی۔ ادبی پرچوں کے لیے دوہری مار ہے۔ نہ خریدار نہ اشتہار۔ خریدار پیدا کرنے کے لیے صبر آزما وقت درکار ہوتا ہے۔ حلقہ بنتے بنتے بنتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں مسلسل اشاعت کے بعد بھی بنیادیں کمزور رہا کرتی ہیں اور خریداروں کا قحط چھایا رہتا ہے۔ تو اب صرف ایک صورت اشتہاروں

کی باقی رہ جاتی ہے، اردو کے ادبی پرچوں کو اشتہار صرف اردو سے تعلق کی وجہ سے مل سکتے ہیں۔ اور ایسے کتنے مشتہرین ہیں جو اردو سے لگاؤ رکھتے ہوں بجز گنتی کے:
ان میں سرفہرست ہمدرد دواخانہ ہے پھر سیپلا بمبئی اور شیروانی الہ آباد آتے ہیں۔ ان تینوں کے مالکان اردو دوست بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی۔

یوں تو ان کے اشتہارات اردو پرچوں میں جاتے ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ اردو کی کس مپرسی میں یہ سنجیدہ ادب کی ترویج و ترقی کیلئے زیادہ سے زیادہ دلچسپی میں۔ اور اردو کے ان چند گنتی کے رسائل پر خصوصی توجہ دیں جو زندگی اور موت کے درمیان جھولتے ہیں لیکن پھر بھی سستے اور گھٹیا ادب کی اشاعت سے دامن بچائے رہتے ہیں۔ ایسے رسالے ۲۰ - ۲۵ سے زیادہ ہرگز نہ ہونگے۔ لاکھوں روپے کے بجٹ میں سے ایک حقیر رقم ان رسالوں میں نئی روح پھونک سکتی ہے جناب عبدالحمید خواجہ، جناب حکیم عبدالحمید دہلوی اور جناب احمد رشید شیروانی سے، یہ ہماری توقع ہے کہ وہ اس معاملے پر غور فرمائیں گے اور اپنے ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو خصوصی ہدایات دیں گے۔ تاکہ اردو کے خادم اطمینان سے مصروف عمل رہیں۔

اس شمارے سے نگار میں ایک اہم کتاب کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کا موضوع بے حد دلچسپ مفید اور ضروری ہے —— ہر شخص جانتا ہے اسلامی تاریخ کا سرورق یعنی سیرۃ رسول اللہ ﷺ اس حیثیت سے ایک معمہ بنی ہوئی ہے کہ اس کے واقعات تاریخ و ایام کی چولیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔ اور کبھی کبھی تو ان میں ایسا شدید تضاد پایا جاتا ہے کہ پوری سیرۃ کے راوی مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ قدیم سیرۃ کی کتابوں میں لگ بھگ سو سوا سو واقعات کی تاریخیں اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ ملتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ اسلامی مورخوں کا حیرت خیز کارنامہ ہے۔ لیکن موجودہ دور کے صاحب قلم اس شجر ممنوعہ تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں اور موجودہ کتابوں میں دو ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی تاریخ سے ایام مطابقت نہیں کرتے کبھی روایات سے موسم غیر مطابق ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک ہی واقعے کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی تاریخی واقعہ کی علم ہیئت تکذیب کرتا ہے۔ غرض یہ وادی پرخار ایسی ہے جس سے دامن بچا کر گزر جانے ہی میں عافیت ہے۔

یہ موضوع خالص انسانی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کی ایک نمائندہ امت کی تاریخ کو صحیح صحیح سمجھنا خود اپنی جگہ ایک ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس زنجیر سے ایک کڑی کم رہ جاتی ہے۔ چنانچہ نیلسن (Nielsen) ونکلر (Winkler) پرسیول (Persival) میور (Muir) جیسے مستشرقین اور حمید اللہ جیسے صاحب نظر نے ایسے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش تو کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

اس موضوع کے لیے جس وسعت مطالعہ محنت اور خلوص کی ضرورت تھی مسرت کا مقام ہے کہ اس کا پورا پورا حق صاحب تصنیف نے ادا کیا ہے اور ایک وسیع کینوس پر اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ موصوف کا یہ کارنامہ علمی دنیا پر ایک احسان ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

یوں تو نگار کی محفل میں اسحاق النبی خاں صاحب پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ مگر ایک طرح ان کا رشتہ اس رسالے سے بہت پرانا ہے۔ ۱۹۴۲ء کی بات ہے مولانا نیاز فتحپوری نے ڈاکٹر ٹسڈل کے ان اعتراضات کا ترجمہ شایع کیا تھا۔ جو قرآن مجید پر کیے گئے تھے، صاحب تصنیف ہی وہ پہلے مرد مومن تھے جنھوں نے عالمانہ انداز میں اس کے کچھ حصوں کا جواب لکھا تھا اور جو برہان دہلی میں "ہارون اور گوسالۂ طلائی" کے عنوان سے شایع بھی ہوا تھا۔ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں نے اس کا خیر مقدم پورے جوش و خروش سے کیا تھا اور اب بھی بہت سے حضرات کو یہ افسوس ہے کہ وہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

موجودہ کتاب میں بظاہر ایک خشک موضوع کو جیسی تر زبانی صاحب تحریر نے عطا کی ہے وہ اس کے بہت سے بوجھل حصوں کو بھی گوارا بنا دیتی ہے۔
نگار کو یہ فخر ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جس کی ضرورت کا احساس تو سب کو تھا مگر لب اظہار اور جرأت گفتار کی کمی نے اسے احاطۂ تحریر میں نہیں آنے دیا۔

حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

اسحاق النبی خاں

مقالۂ اوّل

فصل اوّل

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یادگار رہے گی، کیونکہ اس زمانے میں دنیا ایک عجیب وغریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی جسکے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب و تعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے، عرف عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے؛ اس کی ابتدا اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی، لیکن اس کی عمومی اور آناً فاناً مقبولیت نے ثابت کردیا کہ یہ وقت کی آواز تھی جو کہیں سے بھی اٹھتی ضرور سنی جاتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرق وسطیٰ پر چھا گئی جہاں سے اس کا ہدف پورا عالم تھا!

یہ بات سب کو تسلیم ہے، کہ جزیرہ نما سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب اور لاثانی تمدن کی بنیاد ڈالی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت انگیز کام انجام دیئے اور آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لیے باعث کشش اور جاذب توجہ ہیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدا پیغمبر اسلام کی سیرۃ، یا با الفاظ دیگر آپ کے ان احکام و افعال سے ہوتی ہے، جو اس تحریک کو منظم کرنے پھیلانے اور کامیاب بنانے میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس اعتبار سے تاریخ اسلام کا یہ ابتدائی حصہ صد درجہ اہم ہے، اور اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل تحریک کو سمجھنے کے لیے اس حصے کا بغائر نظر مطالعہ کرے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی تعلیمات اور زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لیے جو جد و جہد کی اور جو جو طریقے اختیار کیے، خود ان کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک بجا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط، اور تلاش و تنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابل داد ہے۔ اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور ان پر جرح و تنقید کے کچھ اور اصول بھی دریافت ہو گئے ہیں۔ لیکن پرانے اصول ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبر اسلام کی سرگزشت کو تین بڑے حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی:

۱۔ عہد ماقبل نبوت

۲۔ مکی عہد

۳۔ مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطے سے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور اسی مقام سے اسلامی تحریک جو اس وقت تک خاموش اور پر امن تھی، شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے! تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپکی نظریاتی تعلیم کا، کیونکہ یہ آپکی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام تدریجی درجہ بدرجہ تنظیمی، اور سیاسی ترقیاں نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام مذہب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ معاشرے اور سیاسی طاقت میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ انتظامی قابلیت، اور پھر رہنمائی کا جوہر کارخانۂ قدرت میں سب سے زیادہ

نادر الوقوع عجوبہ ہے۔ اس نظریے سے دیکھیے تو کسی بھی مصلح، رہنما، ہادی، قائد یا فاتح میں بیک وقت اتنے اوصاف نظر نہیں آتے جتنے تنہا رسول عربی کی ذات میں قدرت نے ودیعت کر رکھے تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت نے اگر ایک طرف بالکل نئے قسم کے دینی، معاشی، سیاسی، اور اخلاقی نظریات و تصورات پیش کر کے دنیا سے منوالیے تو دوسری طرف دس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی عظیم اور مائل بہ ترقی سلطنت کی خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل و تاسیس بھی کی جس نے اگلے آٹھ دس سال کے اندر ہی براعظم ایشیا و افریقہ کی دو مضبوط ترین شہنشاہیتوں کو نیست کر ڈالا۔[1]

یہ سلطنت صحرائے عرب سے اٹھی ہوا عارضی آندھی نہ تھی جو فوراً اتر جاتی بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم نظام تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں وادیٔ سندھ سے لیکر بحر ارل (ARAL) تک اور ارل سے لے کر اٹلانٹک (ATLANTIC) تک ایک ہی پرچم کو سربلند کر دیا، جو بڑی مدت تک اسی شان و شوکت سے لہراتا رہا، اور آج بھی جبکہ ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں، دنیا کے ایک بڑے حصہ پر سایہ فگن ہے۔

اس عظیم سلطنت کی ابتدا ان چھوٹی چھوٹی مہموں، اور معرکہ آرائیوں سے ہوئی تھی جن کو سیرت کی اصطلاح میں غزوات و سرایا کہا جاتا ہے، اور جو اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں کہ اسلام کی تابناک تاریخ سیاست کا پہلا باب انہیں سے شروع ہوتا ہے۔ سیرۃ کی کتابوں میں ان غزوات و سرایا کے جو دلچسپ حالات ملتے ہیں وہ اتنی تفصیل کے ساتھ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنکھوں دیکھا حال نہیں، مثلاً ہر غزوے یا سریے کی اصل وجہ، مقام جنگ، اس کا مدینے یا کسی اور مشہور مقام سے فاصلہ مع سمت، امیر جیش یا علمبردار کا نام، پرچم کا رنگ، مسلم فوج کا شعار، شرکاء کی پوری تعداد، مع اسماء مشاہیر باین صراحت کہ مثلاً ان میں کتنے اوسی تھے، کتنے خزرجی، پھر ان سب کے حلفاء اور دوستوں کی نشاندہی، موافقین و مخالفین کے سواروں کی طاقت، گھوڑوں کے نام تیز یہ کہ کون شخص کس کے ہاتھ سے قتل یا مجروح ہوا؟ اور کس آلے سے؟ پھر وہ تمام خاص خاص گفتگوئیں جو آپس میں یا فریقین کے درمیان ہوئیں، مخالفین کی جنگی طاقت، اسیران جنگ کے نام، غنائم کی تفصیل، حتیٰ کہ معرکہ کا دن، تاریخ اور مہینہ تک متعین کیا گیا ہے، اور کسی وجہ سے تاریخ و یوم کی کوئی صراحت نہ مل سکی تو مہینہ ضرور نظر آئے گا!

ظاہر ہے کہ یہ جملہ تفصیلات، اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کو فوراً ہی قلمبند نہ کر لیا جائے، بالخصوص تاریخ اور دن کی نشاندہی بلا لکھے ممکن نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی یہ روایات درست ہیں، اور ان تفصیلات کی حیثیت افسانوی نہیں بلکہ تاریخی ہے، تو ابتدائی مدونین سیرۃ "یا ان کے" رواۃ" کے سامنے براہ راست کچھ ایسی دستاویزیں تھیں، جن کا تعلق عہد رسالت بلکہ غزوات سے تھا؛

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمیں روایات سیرۃ پر تنقید کا حق پہنچتا ہے، اور اصولی طور پر ہماری نظریں کتب سیرۃ کے ابتدائی ماخذوں کی طرف اٹھتی ہیں؛ کیوں کہ تاریخ صرف مستند ماخذوں کے بیان کردہ واقعات کا نام ہے۔[2]

اس سلسلے میں عام تصور یہ ہے کہ یہ جملہ روایتیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری سے پہلے ضبط تحریر میں نہیں آسکی تھیں۔ چنانچہ اکثر علمائے تاریخ کا خیال یہ

---

[1] ڈاکٹر منگانا جیسے مخالف کا خیال ہے:-

" In any case, whatever view we may take of the claims of Mohammad no one can deny that he was a great man. ... a man who can put an end in less than 10 years to two formidable kingdoms, the kingdom of the old Achemenides represented by the classic Sassanids and that of Roman Ceasers of Eastern countries by means of some camel drivers of Arabia, must be at any rate taken into consideration. A controller of conscience and soul to so many millions and in the plainlight of civilization, is indeed greater than Alexander and Bonapart known only to day in historical books."

(A. Mingana leaves P. XXIV)

[2] خطبات احمدیہ ص ۳۱۸

ہے کہ ابن اسحٰق (المتوفی سنہ ۱۵۱ھ) اسلام کے پہلے مورخ ہیں جنہوں نے آنحضرت کی سیرۃ کو سب سے پہلے لکھا، اور ان منتشر لسانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے میں مروج تھیں، گویا اسلام کی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جب کہ ظہور اسلام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال بیت چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا ابتدائی حصہ بعض مشکوک و مشتبہ لسانی روایات کا مجموعہ ثابت ہوتا ہے، جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت رہتی ہے نہ تاریخی افادیت، یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گذر جانے کے بعد بھی واقعاتی تفصیلات جوں کی توں اور اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں، یا یہ کہ ان کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے، جس کے خلا کو پُر کرنے کے لیے رائج الوقت روایات، عقائد و تصورات ان میں شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی پوری جھلک پائی جاتی ہے حتیٰ کہ واقعاتی تسلسل تک نظر نہیں آتا، اور عباسی عہد کے عقائد، مزعومات اور عصبیت اتنی کم نظر آتی ہیں کہ جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ روایات سیرۃ کا بڑا حصہ اس دور سے پہلے ضبط تحریر میں آ چکا تھا!

اس صورت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ روایتیں، ابتدائی مدونین سیرۃ یا ان کے "رواۃ" کو بعض قدیم تر ماخذوں سے مکتوبی صورت میں پہنچی تھیں، جن کا تعلق عہد رسالت یا عہد صحابہ سے تھا، تو اس مفروضے کی تائید میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ابتدائی عہد میں ایسے امکانات موجود بھی تھے کہ اس طرح کی یادداشتیں یا دستاویزیں ضبط تحریر میں آ سکتیں؟

اس سوال کا جواب ہر طرف سے نفی میں دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف مستشرقین بلکہ علمائے اسلام کی اکثریت اس بات کی مدعی ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربی معاشرہ فی الجملہ جاہل اور ان پڑھ تھا، اور ان میں علمی صلاحیتیں یا تو بالکل مفقود تھیں یا اتنی کم تھیں کہ قرآن مجید میں اس دور کے لوگوں کو "امّی" یعنی ناخواندہ کہا گیا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو کسی قدر لکھ پڑھ سکتے تھے، ورنہ عام طور پر پورے ملک پر جہالت کا دور دورہ تھا، اس بنا پر یہ قیاس ممکن نہیں کہ اس ابتدائی دور میں یہ یادداشتیں ضبط تحریر میں آ سکیں، جو کسی ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جب لکھے پڑھے لوگ ہی نہ تھے تو پھر کوئی لکھتا بھی تو کیوں؟ اور کس کے لیے؟

ڈاکٹر نکلسن نے تاریخ ادبیات عرب (Literary History of the Arabs) میں جاہلی عربوں کو گویا ناخواندہ اور جاہل تصور کیا ہے۔[۲]

مسلمانوں میں سر سید سے زیادہ آزاد قلم کس کا ہوگا مگر ان کی مہر بھی اس فتویٰ پر ثبت ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"آنحضرت کے زمانہ سے پیشتر، اور نیز آنحضرت کے زمانہ میں کوئی معین باقاعدہ "طریقہ تعلیم" کا جاری نہیں تھا، عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی قوت فصاحت و بلاغت اور علم انساب، ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسے میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی، وہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے، اسی وجہ سے اس زمانے میں بے شمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد نہایت محدود تھی، پہلے یعنی وہ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، پچھلوں کے مقابلے میں "امّی" کہلاتے تھے، اگرچہ ان دونوں قسم کے لوگوں میں بہت کم فرق تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا نہ وہ خود لکھ سکتے تھے، اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے اور اسی حیثیت سے آنحضرت کا لقب "امّی" تھا۔"[۳]

حقیقتاً اس تصور جہالت کو مستشرقین نے اتنی ہوا نہیں دی ہے، جتنی خود مسلمانوں نے۔ جس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام ناخواندہ تھے، جیسا کہ سر سید تک کا خیال ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت کے لیے صاف طور پر لفظ "امّی" استعمال ہوا ہے جس کے معنی عام طور پر ناخواندہ لیے جاتے ہیں، اور چونکہ یہی لفظ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر پوری عرب قوم کے لیے بھی آیا ہے اس بنا پر مسلمانوں کا عمومی تصور یا عقیدہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ آنحضرت، اور آنحضرت کے ساتھ اس پوری "[illegible]" کو خواندہ یا پڑھا لکھا تسلیم کر سکیں جن میں آپ پیدا ہوئے یا پرورش پائی اور بالآخر مبعوث ہوئے۔ کیونکہ اصولاً یہ بات ممکن نہیں کہ ایک مقام پر اس لفظ کے معنی ناخواندہ لیے جائیں اور دوسری جگہ کچھ اور مفہوم لیا جائے۔

میں یہاں حضرت نبی امی کے خواندہ یا ناخواندہ ہونے کی بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں، نہ اس عام عقیدے کی صحت اور عدم صحت پر کچھ کہنا ہے،

۱؎ MUIR / PL XXVI ۲؎ Literary History of the Arabs XXII ۳؎ خطبات احمدیہ/۲۱۶

ہاں، اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال شاید منداولہ مفہوم میں نہیں ہوا ہے اور غالباً ہر جگہ "غیر بنی اسرائیل" (GENTILE) یا غیر کتابی لوگوں کے استعمال ہوا ہے، بلکہ بعض تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شاید اس کا مروجہ مفہوم "موجبہ نہ تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس نے ( ) کی تشریح کرتے ہوئے لفظ "امیوں" کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں: "قوم لم یصدقوا رسولاً ارسلہ اللہ ولا کتاباً انزلہ"[۱] (یعنی وہ قوم جس نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول اور کسی نازل کردہ کتاب کی تصدیق نہیں کی) بلکہ اس ذیل میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان لوگوں کے پاس خود نوشتہ صحیفے ہوتے ہیں جن کو یہ اپنے ہاتھوں سے لکھ لیتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔[۲]

عبداللہ بن عباس کے شاگرد خاص عکرمہ کے نزدیک بھی ہر غیر کتابی "امی" تھا؛ چنانچہ انھوں نے رومیوں کے مقابلے میں مجوسیوں کو محض اس بنا پر امی قرار دیا ہے کہ وہ غیر کتابی تھے۔[۳] دوسری صدی کے نصف اول میں ابن اسحٰق نے بھی "امی" کے معنی "ان پڑھ" یا "ناخواندہ" نہیں لیے بلکہ اس کا تقریباً وہی مفہوم سمجھا جو ابن عباس نے بیان کیا تھا، یعنی غیر بنی اسرائیل (Gentile) یا غیر کتابی چنانچہ "قل للذین اوتوا الکتٰب والامیین" کی تشریح کرتے ہوئے "امیین" کے معنی "الذین لا کتاب لھم" بیان کیے ہیں،[۴] یعنی وہ قوم جس میں کوئی آسمانی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ خود قرآن مجید کے سیاق سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ تقریباً ہر جگہ یہ لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔[۵] حتیٰ کہ آنحضرت کے لیے بھی جب اس کا استعمال ہوا تو اس صراحت کے ساتھ کہ آپ کی یہ صفت توریت اور انجیل میں موجود ہے۔[۶] حیرت ہے کہ علمائے اسلام اس آیت کی موجودگی میں لفظ امی کے معنی "ان پڑھ" کس طرح کر لیتے ہیں اس لیے کہ توریت اور انجیل کی تمام پیشگوئیاں ہمارے سامنے ہیں، اور ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس میں کسی "ناخواندہ" نبی کی آمد کی خبر دی گئی ہو؟

علاوہ ازیں مضبوط ترین ناقابل تردید تاریخی شہادتیں بھی اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ کہ ظہور اسلام کے وقت پورا عربی سماج ناخواندہ یا ان پڑھ تھا؛ یہ سچ ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا کے تعلیمی نقشے میں وہ رنگ نظر نہیں آتے، جو آج موجود ہیں، اس لیے کہ اس عہد میں انسانی معاشرہ بڑی حد تک قلم کی وابستگی سے آزاد تھی، لیکن پھر بھی چند در چند دینی، سیاسی اور تجارتی ضرورتوں کے لیے اکثر لوگ تحصیل علم پر مجبور تھے۔ جن کی تعداد اگرچہ ہر ملک میں محدود ہوتی، لیکن ہوتی ضرور تھی۔ اور اسی نسبت سے عربوں میں بھی تعلیم کی افراط خارج از قیاس ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ظہور اسلام کے وقت باشندگان عرب اپنے پڑوسی ملکوں یا قوموں کے مقابلے میں ان پڑھ تھے تاریخی واقعات کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیوں کہ اوراق تاریخ میں اس کے خلاف مبہم شہادتیں ملتی ہیں جن کو میں فصل دوم میں پیش کروں گا۔

فصل دوم

ظہور اسلام کے وقت عربوں کی تعلیمی حالت کا پورے طور پر جائزہ (Survey) لینا نہ تو اس کتاب کا موضوع ہے، اور نہ اس چھوٹی سی فصل میں ممکن ہے، اس لیے میں یہاں صرف چند ایسی تاریخی شہادتیں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ عہد رسالت میں جاہلی معاشرے کو قلم سے کیا لگاؤ تھا، اور اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کی کس قدر صلاحیتیں موجود تھیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی شہادت جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس زمانے کی مروجہ عربی زبان کی ہے جو میری رائے میں سب سے اہم ہے۔

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کسی زبان کی تعمیر اور وسعت میں اس کے بولنے والوں کی ضروریات اور ارتقائے ذہنی کو دخل ہوتا ہے، اور ان ضروریات کی طرف اس زبان کے الفاظ اور ان کی قلت و کثرت رہنمائی کر سکتی ہے، تو خود عربی زبان اس بات کی شاہد ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربوں میں تعلیمی فقدان نہ تھا، اور یہ "امت امیہ" اپنے پڑوسی ملکوں سے میدان تعلیم میں پیچھے نہ تھی۔ صرف "عربی مبین" یعنی حجازی زبان میں (جس میں قرآن نازل ہوا) نوشت و خواند اور اس کے متعلقات کے لیے اس کثرت سے الفاظ ملتے ہیں جن سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی ضروریات میں تعلیم کو کافی دخل حاصل ہو چکا تھا؛ میں یہاں صرف قرآن مجید سے کچھ ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جو مختلف مدارج کی کتابوں اور مکتوبات کے لیے استعمال ہوتے تھے، مثلاً:[۷]

"کتاب[۸]۔ اساطیر (اسطورہ)[۹]۔ زبر (زبور)[۱۰]۔ اسفار (سفر)[۱۱]۔ کتاب مرقوم[۱۲]۔ نسخہ[۱۳]۔ صحف (صحیفہ)[۱۴]۔ سجل[۱۵]۔ قط[۱۶]"

گویا نو الفاظ! ان میں سے تین آخر الذکر لفظ (یعنی صحف، سجل، قط) کے علاوہ جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں، باقی تمام الفاظ عربی ہیں، اور ان سب کے الفاظ و مصادر عربی میں رائج تھے، یعنی:

۱؎ الدر منثور/ ۲؎ در منثور/ ۳؎ نیز دیکھیے طبری تفسیر ۳/۱۴۳ ۴؎ طبری تاریخ ۲/۱۴۲ ۵؎ ابن ہشام ۲/۲۲۷ ۶؎ دیکھیے قرآن ۳/۲۰، ۵:۲
۷؎ قرآن ۷/۱۵۷ ۸؎ قرآن ۲:۷۹، ۲۵:۵، ۳۱:۱۹، ۲۳:۷۶، ۸۵:۲۵، ۲۶:۹، ۳۶:۷۰، ۵۸:۸، ۵۵:۵، ۱۳:۶۳ وغیرہ
۹؎ ۲۶:۱۹۶، ۲۳:۴۵، ۳:۴۵، ۸۴:۱۸، ۴۴:۱۶، ۳۵:۲۵، ۵۴:۴۳، ۵۲:۵۲ ۱۰؎ ۲۴:۱۹ نیز دیکھیے ۸۰:۱۵ ۱۱؎

کتب، سفر، زبر، سفر، رقم، نسخ[1] ان پر دو لفظوں کا اور اضافہ کیجئے یعنی "خط" اور "املا" کا جو قرآن مجید میں جداگانہ استعمال
ہوئے ہیں، گویا ظہورِ اسلام کے وقت صرف "لکھنے" یا "کتابت" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی زبان میں کم سے کم آٹھ لفظ ایسے تھے جن کا حوالہ قرآن میں ملتا ہے،
یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کم تر زبانیں اس کا مقابلہ کر سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ الفاظ اس وقت تک "حصہ زبان" نہیں بن
سکتے، جب تک بولنے والوں کو ان کی شدید ضرورت نہ ہو اور مبہم استعمال نہ ہوتے رہیں! میں نے یہ الفاظ صرف قرآن مجید سے انتخاب کیے ہیں، تاکہ عہدِ رسالت
میں ان کا استعمال اور رواج شکوک و شبہات سے بالا رہے اور نہ اسی عہد کے چند اور الفاظ بھی پیش کیے جا سکتے تھے!

کیا یہ تصور واقعی حیرت خیز نہیں کہ جس زبان میں نوشت و خواند کے لیے اتنے زیادہ الفاظ مروج ہوں، اسی زبان کے بولنے والے فنِ کتابت سے بے بہرہ فرض کر لیے
جائیں، اور یا بایں معنی "امی" سمجھے جائیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیتوں سے محروم تھے؟

قطع نظر اس سے کہ خود قرآن مجید کے اندازِ بیان اور خاص طور پر طرزِ استدلال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ظہورِ اسلام کے وقت عربی سماج "ان پڑھ" تھا، یا قرآن
کے سامعین اولین اور مخاطبِ وقت جاہل تھے، اس لیے کہ اس میں جگہ جگہ متداول کتابوں کے حوالے نظر آتے ہیں، عبارتیں نظر آتی ہیں جن کے خلاصے بطور سند پیش کیے گئے
ہیں، پھر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ پست نہیں، بلکہ بلند ہیں، جن سے سامعین کے طویل ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے، سماجی اور اخلاقی نکات کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ
آج کی دنیا شعوری اور غیر شعوری طور پر انھیں آہستہ آہستہ قبول کرتی جا رہی ہے، مگر بہت سے پسماندہ سماجوں کے لیے ہنوز ناقابلِ فہم و عمل ہیں۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی عبارت جو نازل ہوئی اس کی ابتدا "اقرأ" سے ہوتی ہے اور انتہا "علم بالقلم، علم الانسان ما لم یعلم"[2] پر۔ نزولِ
قرآن کے بعد جب اس کتاب پر اعتراضات کی بوچھاریں ہونے لگیں، جرح و تنقید شروع ہو گئی۔ مطعون کیا جانے لگا، اور طرح طرح کے بہتان لگائے گئے تو ان میں
میں سب سے زیادہ عام اعتراض یہ تھا کہ یہ پچھلی کتابوں یعنی "اساطیر الاولین"[3] سے ماخوذ ہے، گویا سرقہ مضامین کا طعنہ جو اکثر ادیب و نقاد دیا کرتے ہیں جن کی نظریں
پچھلی کتابوں پر ہوتی ہیں، یہ الزام بھی کسی جاہل معاشرے کی طرف سے ممکن نہیں، چنانچہ قرآن نے جب اس کی تردید کی تو ان الفاظ میں: "فاتوا بکتب من عند[4]
هو اهدى"[5] — "فاتوا بسورة من مثله"[6] — "فاتوا بعشر سور مثله"[7] گویا تمام مصنفین عرب کو چیلنج کیا گیا کہ اگر قرآن آسمانی کتاب
نہیں، تو اس کی مثل، کوئی دوسری کتاب پیش کی جائے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ایک ایسا طبقہ موجود تھا جس کو "دعوت تصنیف" دی جا سکتی تھی ورنہ
ظاہر ہے کہ ایک ان پڑھ سماج کے لیے یہ تمام تر مطالبات بے معنی ہیں، کم سے کم میرے لیے یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ قرآن کی یہ "دعوت تصنیف" ایک
ایسے جاہل اور ان پڑھ معاشرے کے لیے تھی، جو اس کے جواب میں چند سطریں لکھنے سے بھی معذور تھا، قرآن میں یہ چیلنج ایک دو جگہ نہیں پورے چھ مقامات پر نظر
آتا ہے،[8] جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ اتفاقی نہ تھا بلکہ مخالفین بار بار کوشش[9] کرتے اور بار بار ناکام ہوتے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے، کہ
رسول اللہ نے ان چیلنجوں میں یا تو قرآن جیسی "کتاب" کا مطالبہ کیا ہے یا "جزو کتاب" یعنی سورۃ کا، ظاہر ہے کہ "سورۃ" کسی کاوشِ لسانی کا نام نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں جبکہ قرآن کوثر و تسنیم سے ریگستانِ عرب کی آبیاری کرنا چاہتا تھا، ایک مکی عالم، نضر بن حارث نے یہاں "اہورا مزدا"
یزداں، کی مقدس آگ سلگانا چاہی تھی، اور مجوسیت قبول کر کے[10] اس کی تبلیغ شروع کر دی تھی، چنانچہ اس کی مشہور کتاب کا تذکرہ جس کو قرآن نے "لهو الحديث"
کا خطاب دیا تھا، اوراقِ تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، اس کتاب میں "نضر" نے رستم و اسفندیار کے دلچسپ قصے بیان کیے تھے، اور اس کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن سے
کسی طرح کم نہیں،[11] نضر صرف فارسی زبان ہی سے واقف نہ تھا، بلکہ شاید یونانی بھی جانتا تھا۔[12]

---

[1] ۲۹ : ۴۷ [2] قرآن ۹۶ : ۴ [3]
[4] ۲۵ : ۶، ۸ : ۳۱، ۲۳ : ۸۴، ۲۷ : ۶۸، ۵ : ۲۵، ۴۹ : ۱۷، ۶۸ : ۱۵
[5] ۲۸ : ۴۹ نیز دیکھیے ۱۰ : ۳۸ [6] ۱۱ : ۱۳ [7]
[8] Arthur Jeffery-Foreign Vocabulry of the Quran p.p. 182
[9] نضر بن حارث نے زندقہ یعنی مجوسی مذہب اختیار کر لیا تھا دیکھیے ابن حبیب محبر/۱۶۱ [10] قرآن ۳۱ : ۶
[11] ابن اسحٰق کا بیان ہے: فحدثهم عن رستم السنديد وعن اسفنديار وملوك فارس، ثم يقول: والله ما محمد بأحسن حديثا
مني وما حديثه الا اساطير الاولين اكتتبها كما اكتتبتها — ابن ہشام [12] 268

قرآن مجید کے کم سے کم ایک مقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کئی اہل قلم تصنیف و تالیف میں مصروف تھے، جن کی کتابیں، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی تھیں[1]، ان میں سے ہر مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے، کتابوں کی خرید و فروخت کا رواج صرف قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بیع مصاحف کے سلسلہ میں جو روایات ملتی ہیں، ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ رواج عام تھا[2]۔
روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد عالم جو بیرونی زبانوں سے واقف ... تھے عمدہ کتابوں کے ترجمے میں مصروف تھے، چنانچہ مشہور مصدق رسول ورقہ بن نوفل کا ترجمہ انجیل جو وہ عبرانی سے کر رہے تھے بہت مشہور واقعہ ہے[3]، اسی زمانے میں بنو قریظہ کے ایک یہودی عرب نے، پوری توریت یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ عربی میں کیا تھا[4]، یہ ترجمہ غالباً حضرت عمرؓ کے سامنے پیش بھی ہوا تھا، "مجلۃ لقمان" کا ترجمہ بھی شاید اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے جو غالباً ایک مدنی عالم سوید بن صامت نے کیا تھا، یہ ترجمہ آنحضرتؐ نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا[5]۔

آنحضرتؐ کی رحلت سے کچھ ہی سال بعد حضرت عمرؓ کے عہد میں جب نہاوند فتح ہوا تو اس کے مال غنیمت میں کسی ایرانی دانشور کی ایک کتاب بھی ہاتھ آئی جو پیشدادی خاندان سے متعلق تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ خلیفہ ثانی کی خدمت میں روانہ کیا گیا، تو آپ نے پوری کتاب کے ترجمے کا حکم دیا[6]۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اس عہد میں تراجم کی کتنی منزلت تھی۔

بیرونی زبانوں سے واقفیت محض علمی اغراض کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ شاید عام کاروبار میں بھی ضروری رہتی تھی، چنانچہ خود حضرت نبی امیؐ نے زید بن ثابت کو جو آپ کے میر منشی تھے خاص طور پر عبرانی، اور سریانی، زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، تاکہ بیرونی یہود و نصاریٰ سے خط و کتابت میں سہولت رہے، چنانچہ انھوں نے بہت جلد ان زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی، کہ پھر اس قسم کی جملہ خط و کتابت انھیں کے قلم سے ہوتی[7]، ایک روایت کے بموجب یہ یونانی بھی جانتے تھے[8]۔
زید کے علاوہ کئی دوسرے صحابی بھی بیرونی زبانوں سے واقف معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ ۷ھ میں ممالک غیر کو جب اسلامی سفارتیں گئیں، تو یہ جملہ سفیران ممالک کی سرکاری زبانوں سے بخوبی واقف تھے[9]۔

بلند پایہ کتابوں کو مُطلّا، اور مُذہّب کرنے کا رواج علمی شوق کی سب سے بڑی دلیل ہے، سبع معلقات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے حروف سے لکھا گیا تھا[10]، یہ روایت صحیح ہو یا مشکوک، لیکن عہد صحابہ میں قرآن مجید کے نسخوں کو مطلا کرنے کی متعدد روایتیں ملتی ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن قدیم سے چلا آ رہا تھا۔ ابن مسعودؓ کے سامنے ایک بار جب مطلا قرآن پیش کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی عمدہ زینت اس کی تلاوت ہے[11]، حضرت علیؓ نے چاندی چڑھے ہوئے قرآن کے نسخے دیکھے، تو سخت برہم ہوئے[12]۔

ظہور اسلام کے وقت عربی دیہات میں بھی تعلیمی فقدان نظر نہیں آتا، اور مکاتب و مدارس نظر آتے ہیں، بنو ہذیل میں جو مکے اور طائف کے درمیان آباد

---

[1] ۲: ۷۹، نیز خاص طور پر الفاظ "یکتبون بایدیہم" اور "لیشتروا بہ ثمنا قلیلا" ملاحظہ ہوں۔

[2] عہد صحابہ میں بہت سے لوگ مدینہ میں یہ کاروبار کرتے تھے حنظلہ کہتے ہیں "مررت مع طاؤس علی قوم یبیعون المصاحف" ابن سعد ۴/ ۲۱۳

[3] بخاری میں ورقہ کے متعلق ہے: وکان یکتب کتاب العبرانی، فیکتب من الانجیل (تجرید باب)

[4] مسند ۳/ ۳۸۷

[5] ابن ہشام ۲/ ۸۹، طبری ۲/ ۲۲۳، سوید نے جب اس کو آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا "ان ھذا الکلام حسن"۔

[6] A History of Historical writings-James Westfall, pp 337

[7] ...... عن زید بن ثابت: قال امرنی رسول اللہ ان اتعلم له کلمات من کتاب یہود ...... فلما تعلمتہ کان اذا کتب الی یہود کتبت الیہم، واذا کتبوا الیہ قرأت له کتابہم ..... (۲) عن زید بن ثابت یقول امرنی رسول اللہ ان اتعلم السریانیۃ (ترمذی باب فی تعلیم السریانی)

[8] حمید اللہ [9] ابن سعد ۲/

[11] ...... جئی ابن مسعود بمصحف قد زین بالذہب فقال ان احسن ما زین به المصحف تلاوتہ (منتخب کنز العمال ۲/ ۴۰)

[12] منتخب کنز العمال ۲/ ۴۰

افیون ملا دیتا ہے خدا جانے یہ بات سچ تھی یا جھوٹ، مگر یہ بات ضرور سچ تھی کہ جو ایک بار وہاں چائے پی لیتا۔ اس کے قدم بار بار اس چائے خانے کی طرف اٹھتے تھے۔ اور اسی چائے خانے میں چند آدمیوں کے درمیان۔ ایک آدمی دو تین موٹی موٹی کتابیں لیے بیٹھا رہتا۔ اور داستان سناتا رہتا۔ میں نے اسے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ کتاب کا مقصد شاید توجہ کو مرکوز رکھنا تھا۔ اور اس محفل کا یہ عالم ہوتا تھا۔ جیسے ہوش وگمان دونوں اس دنیا سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ وہاں حقیقتوں کے پیمانے بدل جاتے۔ جب امیر حمزہ صاحبقراں کسی طلسمی قید میں پھنستے تو تمام حاضرین محفل ہاتھ اٹھا کر ان کی رہائی کے لیے خلوص دل سے دعا مانگتے اور جب اسم اعظم کی تاثیر سے امیر حمزہ طلسم کو درہم برہم کر دیتے تو نگاہوں میں چمک آجاتی۔ سننے والوں میں سے کوئی اٹھتا قریب کی دکان سے مٹھائی لاتا اور سب میں تقسیم کی جاتی۔ یہ جلیبیاں کبھی کبھی ہمارے حصے میں بھی آجاتیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان جلیبیوں کی مٹھاس نے میرے لیے ادب میں نشاط انگیزی پیدا کر دی۔ اسے فیضان کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کروں؟

پتہ نہیں میں اپنے لڑکپن کی باتیں آپ سے کیوں کرنے لگا۔ شاید یہ بھی داستانوں کا اثر ہے جہاں "افسانہ از افسانہ می خیزد"۔۔۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ آج جن داستانوں کے متعلق ہمارے بہت سے نقاد یہ کہتے ہیں کہ ان کا ماحول غیر فطری ہے ان کے کردار عجیب ہیں۔ ان میں مافوق الفطرت عناصر ہیں یہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ آج سے کچھ پہلے انہیں داستانوں میں سننے اور پڑھنے والوں کے لیے حکمت بھی تھی اور بصیرت بھی، ذوق جستجو اور نشاط انگیزی بھی۔ ماہ و سال کی کروٹوں نے ہمیں دوبارہ اسی منزل سے قریب کر دیا ہے اور اب ہم زیادہ گہرے شعور کے ساتھ داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارا فکر ذہن ان پیمانوں سے داستانوں کو ناپنا چاہتا ہے۔ جو داستانوں کے لیے وضع ہی نہیں کیے گئے۔ مغرب کی روشنی میں آپ ناول افسانہ اور جدید نظم کا مطالعہ شوق سے کیجیے لیکن اس مانگے ہوئے اجالے کی مدد سے اگر آپ داستانوں کے خط و خال کو دیکھنا چاہیں گے تو ہر راہ تاریک ہو جائے گی اور کوئی جگنو بھی آپ کی رہنمائی نہ کرے گا۔ پھر اس چشمۂ ظلمات سے شاید آپ لوٹ بھی نہ سکیں۔ اور اگر لوٹ بھی آئے تو آپ کی آنکھیں اپنے تہذیبی ماضی کو کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

ادب کو زندگی کی تعبیر و تفسیر اتنی بار کہا گیا ہے کہ اب اس جملے کو لکھتے یا بولتے وقت ابکائی سی آنے لگتی ہے۔ ادب صرف حقیقت (مروجہ اصطلاح میں) نہیں بلکہ خواب بھی ہے۔ اور خواب بھی تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ داستان اپنا عالم آپ ہے۔ اسی لیے اس کے ماحول کو غیر فطری اور اس کے کرداروں کو عجیب کہنے والے سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

ع سخن شناس نہ دلبرا! خطا اینجا ست

اور داستان سرائی کے بارے میں مرزا غالب یہ فیصلہ پہلے ہی دے چکے ہیں کہ "داستان سرائی منجملۂ فنون سخن ہے"۔ آپ میں اگر ہمت ہو تو غالب کے اس فیصلے کو نہ مانیے۔

مگر ع

یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

تخیل داستان کی بنیاد ہے۔ اسی لیے داستان کی دنیا مثالی دنیا ہوتی ہے۔ جسے مناسب لفظ کی تلاش کے بغیر یاروں نے "عجیب" کا نام دے دیا ہے۔ بعض بڑے فن پاروں کی دنیا بھی تخیلی دنیا ہے۔ مگر تخیل کی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے انداز نظر کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور پھر اس دنیا کی ہر چیز حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر شکسپیر کے ڈرامے "خواب شب نیم گرما" کو پیش کیا جا سکتا ہے ادب کی اس سے بڑی قوت اور کیا ہوگی کہ وہ ہمیں نئی دنیاؤں میں پہنچا دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ دنیا مثالی ہے تو جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مثالی دنیا داستانوں میں نہ ہوگی تو کیا ہمارے اس ذلیل معاشرے میں ہوگی؟ ۔۔۔ داستانوں میں ہمیشہ خیر کی فتح ہوتی ہے۔ حسن ابدی ہوتا ہے۔ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ پھول عورت بن جاتا ہے اور عورت موتی۔ یہ فریب سہی، مگر یہ فریب بھی کتنا سچا ہے۔ یہ فریب ہمیں انسانیت کے تصور سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اور رہا حسن۔۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کبھی یہ لالہ و گل بن جاتا ہے۔ کبھی خندۂ برق و شرر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عورت ہو یا زندگی یا حقیقت۔۔۔۔۔۔۔۔ ان تینوں کو بھیس بدلنے میں ملکہ

حاصل ہے .... اور ع عاشق ہو تو معشوق کو ہر رنگ میں پہچان

اس بات کو جاننے کے بعد کہ داستان اپنی دنیا آپ ہے، یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں۔ یہ احساسِ تناسب ہمارے ذہن میں چند ادبی اصناف کی تنقید نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ اصطلاح اتنی مختصر ہے کہ داستانوں کے جسم پر پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ داستانوں میں اُلّو، طوطے اور گیدڑ کی باتیں تو ہم پڑھ لیتے ہیں۔ مگر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ اُلّو فلسفی بھی ہے اور ہمارے اس وجود کا غماز بھی جو خواب دیکھتا ہے .... جو طرز تپاکِ اہلِ دنیا سے جل کر وہاں جانے کی تمنا کرتا ہے، جہاں کوئی نہ ہو۔ "طوطا" ناصح بھی ہے اور مرشد بھی۔ جو کبھی ہیرو کو شہزادی سے ملا دیتا ہے۔ اور کبھی حقیقت تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے۔ گیدڑ کے بارے میں اس دور میں کیا عرض کروں .... یوں سمجھیے کہ یہ جانور۔ اور یہ علامتیں رموزِ مملکت کو بھی بے نقاب کرتی ہیں اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو بھی۔

عدیم المثال کرداروں اور غیر معمولی چیزوں مثلاً چراغ الٰہ دین وغیرہ کے بارے میں چند اشارے پہلے کیے جا چکے ہیں۔ ایک بات اور کہتا چلوں (کچھ باتیں آگے آئیں گی) وہ یہ ہے کہ ایسے تصورات اس عہد سے مخصوص ہوتے ہیں جب آدمی لڑکپن سے گزر کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس دور میں جاگتے کے خواب دیکھتا ہے۔ کیا کبھی آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا نہیں ہوئی کہ اگر آپ کے پاس کوئی طلسمی انگوٹھی ہوتی تو آپ اس کی قوت سے بہت بڑے "باڈکر" بن جاتے ہیں اور پھر ہندوستان۔ انگلستان کی ٹیم کو عبرت ناک شکست دیتا۔ یا چراغ الٰہ دین کی مدد سے ایفل ٹاور فرانس سے اٹھا کر اپنے دیس لے آیا جاتا۔ یہی حال تہذیبوں کا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کو تہذیبوں کے لیے عنفوانِ شباب کا زمانہ کہہ لیجیے۔ ہماری داستانیں قرونِ وسطیٰ کی یادگاریں ہیں۔ اور دنیا کے ہر ادب کے قرونِ وسطیٰ کے کارناموں میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا "باغ و بہار" سے کیا تعلق ہے؟ میں نے اس کا جواب سوچ لیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ باتیں کہنی ہی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ باغ و بہار بھی ایک داستان ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں داستانوں کی تفہیم کے مرحلے سے گزرنا ہی ہوگا۔ ویسے اس بات پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ہم خلاؤں کو فتح کر رہے ہیں اور دوسری طرف داستانوں کی دنیا کو اپنے لیے اجنبی پاتے ہیں۔ حسرت کی طبیعت ہی "طرفہ تماشا" نہ تھی ہماری طبیعت بھی طرفہ تماشا ہے۔ باغ و بہار میں داستان گوئی و داستان نگاری کے فن کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ مگر درمیان میں "میر امن" کی ذات بھی ہے۔ ہر خصوصیت اسی "فلٹر" سے گزر کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اسی لیے باغ و بہار ہماری داستانوں کی روایت کا حصہ بھی ہے۔ اور ان سے مختلف بھی۔

اردو کی اولین داستانوں میں تمثیلی رنگ غالب ہے۔ انھیں مثالیہ قصّے کہنا مناسب ہوگا۔ ایسے قصّوں کی نمائندگی کے لیے "سب رس" موزوں رہے گی یہ انداز مشرقی داستانوں کا ایک مخصوص انداز ہے۔ مگر باغ و بہار یا بعد کی داستانوں میں اولیت مثالیہ یا تمثیلی کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ قصّے کو حاصل ہے اسی لیے باغ و بہار کے چاروں درویشوں کی سیر محض روحانی تجربے کا اظہار نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک مادہ پرست نقاد نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ ارضی کہانیاں ہیں، روح اس زمین پر بھی ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ اس لیے ان کہانیوں میں روحانی تجربوں کی جھلک بھی ہے۔ مگر اولیت قصّے ہی کو حاصل ہے۔ باغ و بہار میں "باطنی حقیقت" کا اظہار تو ہے۔ مگر یہ باطنی حقیقت "مقصود بالذّات" نہیں ہے۔

تلاش و جستجو "سب رس" میں بھی ہے اور "باغ و بہار" میں بھی۔ سب رس میں تلاش ابدی حقیقتوں کی ہے اور "باغ و بہار" میں "شہزادیاں" اور گمشدہ محبوبائیں گوشت پوست بھی رکھتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی پیش کش پر روحانی تجربے کا گمان بھی گزرتا ہے۔ تلاش و جستجو کے یہ افسانے صرف ہماری زبان تک محدود نہیں بلکہ ان کا عالمگیر سلسلہ ہندوستان اور ایران سے لے کر "آئرستان" تک پھیلا ہوا تھا۔ سب رس کے سلسلے میں افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھا ہے۔

"یہ سلسلہ "تلاش و تجسس" کے افسانوں کا سلسلہ ہے۔ کبھی یہ تلاش کسی پھول کی ہوتی ہے، جو پھول بھی ہے اور دنیا کی حسین ترین عورت بھی .... اس پھول کی تلاش رازِ حیات کی تلاش ہے اور یہ گل و بلبل کے قصوں سے زیادہ پرانی ہے کبھی تلاش کے قصّوں میں ہیرو کا مقصود کوئی ظرفِ مقدس یا نایاب ہیرا ہوتا ہے۔ جو اعلیٰ ترین شوکت و شانِ شاہانہ کا رمز ہے .... تلاش کے قصّوں کا تیسرا گروہ وہ ہے جس میں "چشمۂ آبِ حیات" کی تلاش ہے .... مگر در اصل یہ تینوں گروہ ایک ہی

بنگالی بھی پھول بھی ہے، چشمہ بھی اور عورت بھی"۔ (ترقی پسند ادب صفحہ ۳۳ – ۲۳۲)

ایسی تمام داستانوں میں ہمیں "دورانِ محض" سے واسطہ پڑتا ہے۔ "زماں" (وقت) سے نہیں۔ "مکان" کے سلسلے میں مشکل یہ آ پڑتی ہے کہ تلاش کے عمل کے لیے "مکان" ضروری ہے۔ "باغ و بہار" میں دورانِ محض نہیں بلکہ وقت ہے۔ اسی لیے میں اس داستان کو محض روحانی تجربہ نہیں سمجھتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مثالیہ قصوں میں تلاش کے عمل سے "مکان" اور "اشکال" وابستہ ہیں۔ مگر باغ و بہار میں "وقت" ہے۔ اور اسی لیے اس میں "اشکال" نہیں بلکہ "کردار" ہیں۔ وقت اور اس کے تقاضوں کے مطابق یہ بدلتے ہوئے کردار اس بات کا ثبوت ہیں کہ باغ و بہار محض مثالیہ قصہ نہیں ہے۔

"باغ و بہار" کے کردار متحرک ہیں اور ہماری آپ کی طرح زندہ۔ پہلی کہانی کا درویش بھلا آدمی تھا مگر "آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ بہر وقت کے کہنے سننے سے اس کا "مزاج بہک گیا۔" اور اگر اس کا مزاج نہ بہکتا اور وہ "آدمیت" کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا تو کہانی آگے نہ بڑھتی۔ اسے سفر سے واسطہ نہ پڑتا۔ اور وہ بھی اپنے باپ "خواجہ احمد" کی طرح یمن کا "ملک التجار" بنکر چین کی بانسری بجاتا اور گھوڑے بیچ کر سوتا۔

میر امن کے فسانے میں صرف شہزادے، شہزادیاں، بادشاہ، وزیر اور امراء نہیں ہیں۔ ان کے کرداروں میں سوداگر، عام آدمی اور کلیاں بھی ہیں (آپ کا دل چاہے تو انھیں "سونیا" "شکلیں اور معنی دیدیں) دوسرے، تیسرے اور چوتھے درویش شہزادے ہیں۔ مگر پہلا درویش جس کی سیر میں سب سے زیادہ تکمیل موجود ہے، وہ سوداگر اور خواجہ زادہ ہی ہے۔ خواجہ سگ پرست کی کہانی میں انسانی فطرت کے کئی پہلو موجود ہیں۔ بہزاد خاں کی شجاعت۔ تیسرے درویش کی کہانی میں کٹنی کی مکاری، اور پہلے درویش کی "بہن کی ماتا" اور جذبے کی گہرائی ہمارے ذہن پر گہرے نقش چھوڑ جاتی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ باغ و بہار کے بہترین عناصر پر شہزادوں اور شہزادیوں کی حکمرانی نہیں بلکہ عام آدمی کا پھریرا لہراتا ہے۔

آدمی اور زمین سے میر امن کی بے پایاں محبت نے باغ و بہار کو اردو کی دوسری داستانوں سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ باغ و بہار داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی بھی ہے اور ایسا دریچہ بھی جس سے پہلی بار ہم آدمی کے دل میں جھانکتے ہیں۔ باغ و بہار میں بھی مافوق الفطرت عناصر ہیں۔ مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے قصوں کی "ارتھی" ہے۔ مگر بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے لیے میر امن کو "ملک شہپال" کا سہارا لینا پڑا جن اور پری اس کہانی کی بنیاد نہیں ہیں۔ ان کا سایہ بہت دور سے باغ و بہار پر پڑا ہوا نظر آتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولیے کہ باغ و بہار ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو قرونِ وسطیٰ کا ذہن رکھتا تھا اسی لئے مافوق الفطرت عناصر سے نہ بھاگ سکتا تھا جنوں اور پریوں کا ذکر اور مافوق الفطرت عناصر تو عہدِ وسطیٰ کے ادب کی خصوصیات میں اور میر امن بھی اسی دور کے آدمی ہیں۔ ان کے دور کا عام آدمی ان عناصر پر ذہنی طور پر اعتقاد رکھتا تھا آج بھی آپ کی نانی جان یا دادی جان (اگر وہ زندہ ہوں تو خدا ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے) ان باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ بچہ مضمحل ہوتا ہے تو اسے نظرِ بد سے تعبیر کرتی ہیں۔ محلے کی کسی کنواری لڑکی پر "ہسٹریا" کے دورے پڑتے ہیں تو "عامل" کو بلانے پر اصرار کرتی ہیں۔ میر امن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دور میں بھی دیر تک انسانی زندگی سے دور نہیں رہتے وہ "دیدۂ وا" کے ساتھ اس عہد کی زندگی اور اس کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لیے "باغ و بہار" میں ان کے عہد کا معاشرہ اور زندگی سمٹ کر آ گئی ہے۔ (نہ جانے یہ کس کا کمال ہے۔ میر امن کا۔ یا فارسی "قصہ چہار درویش" کے نامعلوم مصنف کا)

"باغ و بہار" قصہ گوئی کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہے جو قدرت نے میر امن کو ودیعت کی تھی۔ "باغ و بہار" میں "بوستانِ خیال" اور "طلسم ہوشربا" کی سی وسعت اور طلسم بندی تو نہیں ہے لیکن میر امن کہانیوں کا سلسلہ یوں ملاتے ہیں کہ پڑھنے والا کہانیوں کی فضا میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور یہی کہانی کہنے کا فن ہے۔ داستان کا ایک اہم عنصر دلچسپی ہے ان کی کہانیوں کی رفتار میں حرکت بھی ہے اور توازن بھی۔ "باغ و بہار" پر جدید تقاضوں کا یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ "داستانوں میں احساسِ تناسب نہیں ہے" ان کی کہانیوں میں بعض پراسرار واقعات بھی ہیں جو شروع میں ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے۔ گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور واقعات سمجھ میں آنے لگتے ہیں (مثلاً پہلے درویش کی کہانی میں شہزادی کا عجیب و غریب رویہ) — ان کہانیوں میں "ارضیت" صرف کہانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں میر امن کے اسلوب کا بھی دخل ہے۔

میر امن کے یہاں رکاوٹ اور ٹھہراؤ نہیں۔ نہ اسلوب میں، نہ کرداروں میں۔ رجب علی بیگ سرور کے کردار بڑی حد تک بے جان ہیں اس کے برعکس میر امن کے کرداروں میں ہمیں زندگی ملتی ہے اور تند و تیز انسانی جذبات بھی۔ یہاں "اسم اعظم" بھی جنسی جذبہ کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ پہلے درویش کی

سیر میں شہزادی کی نفرت کتنی انسانی اور کتنی شدید ہے۔ یہ نفرت اس "بے وفا" اور اس "بدذات" کے خون سے بھی اپنی پیاس نہیں بجھا سکتی اور درویش نے دوری کی تہ میں ان "دونوں" کی نفرت ہے۔ آخر اس نے اپنے آپ کو ان کا شریکِ محفل اور شریکِ جام کیوں بنایا؟

میر امن کے کردار تخیلی یا ان کے "ہمزاد" نہیں ہیں۔ وہ اپنی شخصیت رکھتے ہیں اور داستان گو کو جہاں چاہتے ہیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ داستان گو مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ کرداروں کے ساتھ سیر کرنے پر مجبور ہے مگر اپنے "بیانیہ" میں وہ اپنی مختاری کا اظہار کرتا ہے مشرق بیطلی کے ایک دیس میں اسے جون پور کا پلیاد آتا ہے۔ بصرے کی شہزادی سے وہ ہندی کے دوہے پڑھوا دیتا ہے۔ کسی بتکدے میں وہ لات و منات کو بٹھا دیتا ہے۔ (اس اعتبار سے میر امن اور انیس کے درمیان مجھے ہمیشہ مشابہت کا احساس ہوا ہے۔)

جوش نمبر

جیسی یادگار، مثالی اور عدیم النظیر پیش کش کے بعد

افکار

ابو الاثر حفیظ جالندھری کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں

حفیظ نمبر

اگست ۱۹۶۳ء میں

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

جوش نمبر کی طرح حفیظ نمبر بھی گزشتہ نصف صدی کی ایک مستند ادبی دستاویز ہوگا سالانہ ممبر۔ ۱۴ اگست تک بارہ روپے رسالانہ بھیج کر یہ عظیم و منفرد پیش کش نصف قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں۔ حفیظ نمبر کے بعد افکار، فیض نمبر، اور کرشن چندر نمبر پیش کر رہا ہے۔ ایجنٹ حضرات حفیظ نمبر کے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔

مکتبہ، افکار۔ رانس روڈ، کراچی

بھارت کے خریدار حضرات زرِ سالانہ ذیل کے پتہ پر بھیجکر رسیدیں آنڈر ہمیں ارسال فرمادیں:
سلمیٰ صدیقی۔ گوروناس۔ بندر جوہن روڈ کھار۔ بمبئی ۵۲

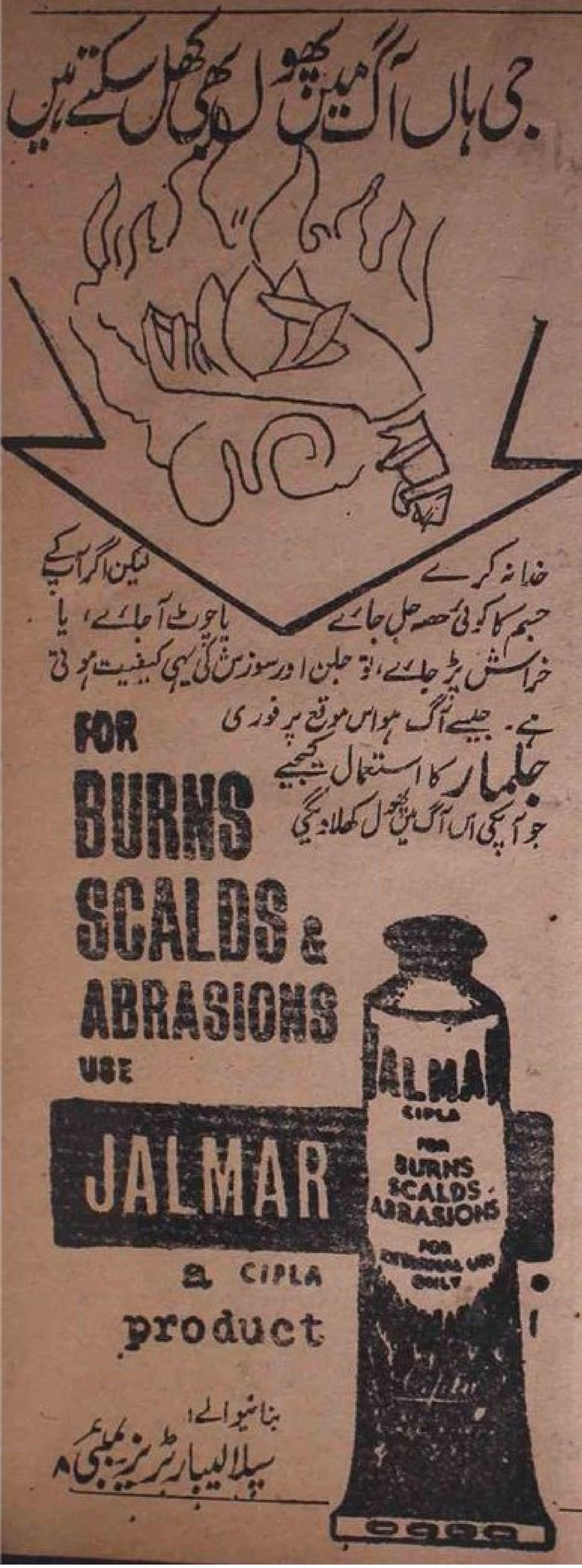

توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ

سید مبارز الدین رفعت

نذیر احمد نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ کس طرح شروع کیا، اس کی داستان بہت دل چسپ ہے محض حسن اتفاق سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور ایسے مبارک وقت اس کا آغاز ہوا کہ اس سے نذیر احمد کو لازوال شہرت نصیب ہوئی اور اردو زبان کو ایک ایسا عظیم المرتبت مصنف ہاتھ آیا جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

یہ حسن اتفاق کیسے پیش آیا، اس کی تفصیل خود مولانا نے اپنے ایک لکچر میں بڑے دل چسپ اور ڈرامائی انداز میں بیان کی ہے اور انھیں کی زبانی سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں:

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈا، تلاش کیا، لیکن پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالات آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس، چھوٹی کے لیے منتخب الحکایات، بشیر کے لیے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں، نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحہ پڑھنے کی طاقت تھی، وہ آدھے کے لیے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی، وہ ورق کے لیے مستعجل تھا جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں کتابوں کا پہلا گمان پورا ہوا۔"

"اتنے میں کیمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع کے ہیڈ کوارٹر اورئی کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ بشیر ٹانگن پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے ادھر سے نکلا۔ صاحب کو دیکھ کر ٹانگن پر سے اتر کر سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو!

بشیر: چند پند

صاحب: یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔

بشیر: یہ کتاب میرے والد نے میرے لئے بنا دی ہے۔

صاحب: کتاب کا مضمون کیا ہے؟

بشیر: بڑی اچھی اچھی نصیحت کی باتیں ہیں۔

صاحب: مجھ کو وہ کتاب دکھا سکتے ہو؟

بشیر: میں ابھی جا کر گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ نالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔

(تھوڑی دیر سے لوٹ کر)

میں آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں؟ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں۔

صاحب: ضرور سب لاؤ۔

"بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لا صاحب کے حوالے کیا۔"

"شام کو میں جو کچہری سے گھر آیا تو بہن بھائی لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ میں نے سن کر کہا کہ گیا

مضائقہ ہے، میں تم سب کو ان سے بہتر کتابیں بنا دوں گا۔"

"اگلے دن میں جو کیمپسن صاحب سے ملا تو انھوں نے شاید ان کتابوں کو دیکھ بھال لیا ہوگا۔ فرمایا ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کاپی پہنچا دو۔ یہاں میرے پاس خرے کی صفائی میں بہت سے اچھے تھے خوش خط۔ اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ میں نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آ گئے، جلتی ہوئی جلدیں بنا کر، صاحب تو پرسوں تک کو کہہ گئے تھے، میں نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کیمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ یہ اپنے طرز مقبول میں پہلی ہی کتاب ہے اور ہزار روپے انعام کی مستحق ہے اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کروں گا۔ وہی سر ولیم میور جن کی فرمائش سے میں نے انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے مراۃ العروس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے سر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی گھڑی ٹائم پیس میرا نام کندہ کر کے جیب خاص سے کیمپسن صاحب اور اپنے ریویو کو گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔"

"وہ جو کہتے ہیں کہ مزدور خوش دل کار بیش کند، میں نے بھی تصنیف کا ڈربہ کھول دیا اور اب بھی کھلا ہی سا ہے، ہاتھ کے رعشے کی وجہ سے پہلے پھیر دیئے ہیں، بند نہیں کیے۔" [1]

یہ ۱۸۶۹ء کا زمانہ ہے، اس سے پہلے مولانا الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر فائز تھے۔ محض ایک حسن اتفاق سے ان کی رسائی سر ولیم میور تک ہو گئی تھی جو اس زمانے میں صوبہ متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر تھے، سر ولیم میور کے حکم پر انھوں نے انکم ٹیکس کے قانون اور اس کے بعد قانون تعزیرات ہند کا اردو میں بہترین ترجمہ کیا تھا، اسی بنا پر وہ محکمہ تعلیم سے محکمہ مال میں عہدہ دار بندوبست کی حیثیت سے لیے گئے تھے۔ محکمہ تعلیم سے ان کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہ محض دوسرا حسن اتفاق تھا اور اردو زبان کی خوش بختی تھی کہ اس صوبے کے انگریز ناظم تعلیمات میتھیو کیمپسن دورے پر اس مقام پر گئے جہاں مولانا نذیر احمد متعین تھے۔ بالکل ہی اتفاقی طور پر ان کی مڈبھیڑ مولانا کے صاحبزادے میاں بشیر الدین احمد سے ہو گئی اور وہ کتابیں جو محض خانگی استعمال کے لیے لکھی گئی تھیں، ان کے ہاتھ آ گئیں۔ یہ کیمپسن کی جوہر شناسی تھی کہ انھوں نے بیک نظر ان کتابوں کی اہمیت اور ان کی خوبی کو پرکھ لیا۔ انھیں گورنمنٹ میں پیش کر کے ان پر انعام دلایا اس ہمت افزائی نے مولانا نذیر احمد کے حوصلے بلند کر دیئے اور انھوں نے انتھک محنت سے ایک سے ایک اچھی کتاب لکھی اور اردو کے ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے ان کا مرتبہ تسلیم کر لیا گیا۔ ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے مولانا نذیر احمد کی دریافت کا سہرا کسی اور کے نہیں مسٹر میتھیو کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے سر بندھتا ہے افسوس ہے کہ ان کے تفصیلی حالات مجھے نہ مل سکے مولانا کے اسی محولہ بالا لکچر کے ایک حاشیہ میں بشیر الدین احمد، مرتب "لکچروں کا مجموعہ" نے لکھا ہے کہ کیمپسن صاحب ایم اے تھے۔[2]

انگلستان کی کس جامعہ کے ایم اے تھے، یہ واضح نہ ہو سکا۔ اس دور میں یعنی انیسویں صدی کے دوران میں جو بھی انگریز عہدہ دار ہندوستان بھیجے جاتے تھے ان میں بیشتر عہدہ دار عربی، فارسی، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں کافی درک رکھتے تھے۔ غالباً کیمپسن عربی اور فارسی سے واقف تھے۔ اور مولانا نذیر احمد سے جو معاملہ پیش آیا اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے انھیں اردو بہت اچھی آتی تھی مولانا کے ادبی قدر دان سر ولیم میور کے داماد بھی تھے۔ چنانچہ بشیر الدین احمد نے اسی حاشیہ میں لکھا ہے:

"سر ولیم میور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ جو عربی کے بڑے ادیب اور فاضل اجل تھے۔ خدمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ کیمپسن صاحب ایم اے ان کے داماد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے انھوں نے ہی مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور توبۃ النصوح کی ایک مبسوط شرح بھی انگریزی میں لکھی۔" [3]

مولانا نذیر احمد نے مراۃ العروس اپنی بچیوں کے لیے لکھی تھی اور اسے دریافت کر کے گورنمنٹ میں پیش کر کے انعام دلانے اور عوام تک

---

[1] نذیر احمد کے "لکچروں کا مجموعہ"، جلد دوم، چالیسواں لکچر ص ۴۳۶ — ۴۳۸ — مرتبہ بشیر الدین احمد مفید عام اسٹیم پریس آگرہ، ۱۹۱۸ء

[2] ایضاً، حاشیہ ص ۴۳۹

[3] لکچروں کا مجموعہ حصہ دوم حاشیہ ص ۴۳۹

پہنچانے کی سعادت کیمپسن صاحب کے حصے میں آئی تھی، لیکن اس کتاب کے لکھنے کے چند سال بعد ۱۸۷۳ء میں مولانا نے حامۃ المسلمین کو پیش نظر رکھ کر توبۃ النصوح لکھی تو اس کتاب کو بھی گورنمنٹ میں پیش کرنے کا افتخار کیمپسن صاحب کو حاصل ہوا۔ اسی لکچر میں مولانا نذیر احمد فرماتے ہیں:

"اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڑھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی جو میری تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور لاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹرالٹی کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے شمول میں لے بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا کہ لاٹ صاحب کو لیتے ہی بن آئی اور کتاب باوجودیکہ اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر برا مانے۔ اب پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اول درجے کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے کورس میں داخل کی گئی۔" ؎۱

مسٹر میتھیو کیمپسن مولانا نذیر احمد کی کتابوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کتابوں کو انھوں نے خود ہی گورنمنٹ میں پیش کیا، اپنے شخصی اثر سے کام لے کر ان پر مولانا کو انعام دلایا، ان کو نصاب میں شامل کرایا، اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک کی شرح بھی لکھی۔ انعام کے لیے توبۃ النصوح کو گورنمنٹ میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے حکومت کو جو مراسلہ لکھا تھا اس میں اس کتاب کو مولانا کی اس وقت تک کی لکھی ہوئی تمام کتابوں سے افضل قرار دیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"میں اس کتاب کو مصنف کی مراۃ العروس اور بنات النعش سے افضل سمجھتا ہوں۔ اس میں طرز عبارت اور قوت بیان کی خوبی ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔" ؎۳

راقم نے مراۃ العروس کا انگریزی ترجمہ اور توبۃ النصوح کی شرح نہیں دیکھی، لیکن توبۃ النصوح کا ترجمہ دیکھا ہے، اس مضمون میں اسی انگریزی ترجمہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مسٹر میتھیو کیمپسن نے توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ مولانا نذیر احمد کی اجازت سے اس وقت کیا ہے جب کہ مولانا ریاست حیدر آباد دکن کے بیدار مغز وزیر اعظم نواب سالار جنگ اول کی طلب پر حیدر آباد چلے گئے تھے اور اس ریاست میں ناظم محکمہ مال کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مسٹر کیمپسن کا یہ ترجمہ "THE REPENTANCE OF NUSOH" کے نام سے انگلستان کے ایک ایسے مشہور ناشر ادارے نے ۱۸۸۴ء میں شایع کیا جو اس زمانے میں مشرق اور مشرقی علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شایع کر رہا تھا اس ادارے کا نام ہے:

" W.H.Allen & Co, 8, Waterloo Place, London, 1884 "

ترجمہ کی ابتدا میں مترجم کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے، اس دیباچہ کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

مترجم کا دیباچہ

یہ ہندوستانی قصہ جس کا آزاد ترجمہ اس چھوٹی سی کتاب میں پیش کیا گیا ہے، ہندوستان میں ملازمت کے دوران میں میرے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس کے مصنف، خان بہادر، مولوی حاجی حافظ نذیر احمد، ناظم محکمہ مال ریاست حضور نظام (حیدر آباد دکن) نے اسے شایع کر دیا۔ اگرچہ کہ اس کتاب کا علم اہل یورپ کو بہت کم ہے، لیکن آگرہ اور لکھنؤ کے مقامی مطبعوں سے اس کے کئی اڈیشن

؎۱ لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۴۴۰

؎۲ توبۃ النصوح کی "تقریظ" کے ایک حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے: "واضح ہو کہ اصل کتاب کے حاشیہ پر عند الملاحظہ جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنے دست خاص سے اکثر جگہ کچھ کچھ عبارت خط پنسل سے لکھ دی تھی۔ چنانچہ مصنف نے چھپنے سے پہلے کتاب پر نظر ثانی کر کے جہاں تک ممکن ہوا ایما و اشارہ کے مطابق کتاب میں ترمیم کر دی۔"

؎۳ "چٹھی جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتہ تعلیم"، تقریظ توبۃ النصوح۔

شایع ہو چکے ہیں۔

میں نے تین وجوہ کی بنا پر اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنی ہم جنس ہندوستانی رعایا کی حالت اور ان کی ترقی سے جتنی دلچسپی ہے، اگر وہ کتاب پڑھیں تو مجھے یقین ہے انھیں اس کے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کتاب میں ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ میں اصل کتاب کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ مستعمل زبان میں اب تک کی چھپی ہوئی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے۔ یہی زبان اس زبان کے وطن دہلی میں بولی جاتی ہے جہاں کا یہ قصہ ہے۔

توبۃ النصوح اور اس کے ساتھ ہی دوسرا قصہ مراۃ العروس دونوں ہی پہلے پہل مصنف کے افراد خاندان کے خانگی استعمال کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس میں زندگی اور عادات و اطوار کی جیسی تصویر پیش کی گئی ہے وہ اس ملک کا باشندہ ہی پیش کر سکتا تھا۔

اس کتاب کے مصنف ایک بڑے عالم ہیں اور مشرقی مکتب فکر کے علم کلام کے ماہر ہیں وہ عرصۂ دراز تک انگریزی حکومت کے تحت ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں۔ ادھر چند سال پہلے سر سالار جنگ مرحوم نے انھیں حیدرآباد کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک اہم عہدے کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس عہدے پر وہ اب تک فائز ہیں۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ ان کی اجازت سے کیا ہے۔

میتھیو کیمپبل ــ اسکوٹ ۱۸۸۴ء

اس کے بعد مترجم کے خسر سر ولیم میور کا مقدمہ درج ہے جو چار صفحوں میں آیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، سر ولیم میور، مولانا نذیر احمد کے اولیں قدر شناسوں میں تھے۔ مولانا کو جو شہرت، جو عزت اور جو مرتبہ حاصل ہوا اس میں سر ولیم میور نے صوبۂ متحدہ کے گورنر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ ادا کیا ہے۔ ولیم میور ۱۸۱۹ء میں بمقام گلاسگو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاسگو کے ایک تاجر تھے۔ اپنے والد کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی جان میور سنسکرت کے بڑے عالم رہے ہیں۔

ولیم میور ۱۸۳۷ء میں پہلی بار ہندوستان آئے۔ مال گزاری کے تعین کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی خدمت پر کانپور، بندھیل کھنڈ اور فتح پور میں دس سال تک مقیم رہے۔ ۱۸۴۷ء میں شمال مغربی صوبے کے گورنر معتمد مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں وہ اسی صوبے کی مجلس مال کے معتمد بنائے گئے۔ ۱۸۶۸ء میں انھیں شمال مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنری کے عہدۂ جلیلہ میں ترقی دی گئی اور ۱۸۷۴ء تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ ۱۸۷۶ء تک وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک کی کونسل کے رکن فینانس رہے اور اسی خدمت سے وظیفۂ حسن خدمت پر حکومت ہند کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

وظیفۂ حسن خدمت حاصل کر کے وہ انگلستان پہنچے تو لارڈ سالسبری نے انھیں کونسل آف انڈیا کا رکن نامزد کیا۔ ۱۸۸۵ء میں کونسل آف انڈیا کی رکنیت سے استعفا دے کر انھوں نے اڈنبرا یونیورسٹی کی چانسلری قبول کر لی اور مرتے دم تک اسی خدمت پر مامور رہے اس یونیورسٹی کی بڑی خدمت کی اسی یونیورسٹی سے انھوں نے مولانا نذیر احمد کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دلائی۔

سر ولیم میور کو عربی اور اردو خوب آتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے انھیں کے مشورے سے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا تھا۔ ملکہ کو اردو زبان سیکھنے میں بھی سر ولیم میور نے مدد دی تھی۔ الٰہ آباد کا میور کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی دونوں انھیں کی گورنری کے عہد میں قائم ہوئے۔ تاریخ اسلام سے انھیں شروع ہی سے دلچسپی رہی۔ ہندوستان میں قیام کے دنوں میں وہ "کلکتہ ریویو" میں مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ ان ہی مضامین کی بنیاد پر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "حیات محمدؐ" (LIFE OF MOHAMMAD) چار جلدوں میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۱ء تک شایع کی۔ اس کتاب کا لب و لہجہ اور اس کے بعض مضامین ہندوستانی مسلمانوں کو سخت ناگوار گزرے۔ اسی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے سر سید نے اپنا اثاثہ بیچ کر انگلستان کا سفر کیا اور "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب کے سوا سر ولیم میور نے مسلمانوں سے متعلق اور بھی کتابیں لکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ابتدائی خلافت اور اسلام کا عروج ۱۸۸۳ء (۲) سلاطین مملوک ــ مصر کا غلام خاندان ۱۸۹۶ء (۳) قرآن، اس کی ترکیب و تعلیم ۱۸۷۸ء (۴) قرآن مجید کے اقتباسات انگریزی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۸۰ء (۵) الکندی کی کتاب الاعتذار کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۷ء ــ ۱۸۸۱ء (۶) مسلمان

کو توراتِ زبور اور انجیل کے دیکھنے اور پڑھنے کی دعوت ۱۸۸۲ء۔

۱۸۸۴ء میں وہ اسلامیات کے ماہر کی حیثیت سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی حیثیت سے انھیں ۱۹۰۳ء میں جوبلی گولڈ میڈل عطا ہوا۔ ۱۸۸۵ء میں جامعہ آکسفورڈ نے ڈی سی ایل کی اور جامعہ گلاسکو اور جامعہ ایڈنبرا نے انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

سر ولیم میور نے ۱۹۰۵ء میں بمقام ایڈنبرا وفات پائی۔

سر ولیم میور نے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمہ پر جو مقدمہ انگریزی میں لکھا ہے، اب اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔ یہ مقدمہ بھی ان کی کتاب "حیات محمد" کی طرح تعصب و تنگ نظری سے خالی نہیں۔

مقدمہ

"ہندوستان کی دیسی زبانوں میں دل چسپ اور کار آمد ادب کی بہت کمی ہے۔ ان زبانوں میں ایسی کتابیں بہت ہیں جن کا بڑا حصہ قابل اعتراض باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان زبانوں میں ایسی دل چسپ اور نصیحت آموز کہانیاں سرے سے موجود نہیں جو بچوں یا صنف نازک کے لیے موزوں ہوں۔ اس طرح تعلیم اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شوہروں اور باپوں کو فطری طور پر قابل اعتراض کتابوں کے پڑھانے میں بڑا تامل ہوتا ہے۔

آج سے کوئی دس سال پہلے دیسی زبانوں میں اچھی کتابوں پر انعامات رکھے۔ ایک اعلان کے سلسلہ میں کتاب توبۃ النصوح مسٹر کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات شمال مشرقی کے پاس پیش کی گئی تھی۔ اس کتاب پر مصنف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کیا گیا تھا۔

مصنف کو توبۃ النصوح پر ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کرتے ہوئے حسب ذیل احکام مسٹر کیمپسن کے نام جاری کیے گئے تھے۔ یہی احکام صوبجات شمال مشرقی کے سرکاری گزٹ بابت ۱۸۷۳ء میں شائع کیے گئے تھے۔

"کتاب کا مقصد اور زبان دونوں نہایت قابل تعریف ہیں۔ واقعہ میں بیان کی قوت اور جودت عبارت کی سادگی اور بے ساختگی اور محاورات کی مناسبت اور عمدگی جو اس کتاب میں ہے شاید اردو کی اور کسی کتاب میں نہ ہو۔ اور بڑی صفت یہ ہے کہ ہندی، فارسی، عربی الفاظ کی آمیزش اس بے تکلفی کے ساتھ ہے جو دلی کی زبان میں پائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ضرب المثل باتیں اور خصوصاً روزمرہ کی گفتگو کے مستعمل فقرے اس کثرت سے ہیں کہ ان کے سبب سے کتاب مذکور بہت ہی فائدہ مند معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک بات نہایت عمدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے خانگی حالات بھی اس میں شرح بیان کیے گئے ہیں جس کے سبب مراۃ العروس کے اہالیان یورپ کے لیے بھی جو اس کا مطالعہ کریں موجب آگاہی اور واقفیت ہے۔

اگرچہ اصل مضمون اس کتاب کا مذہبی باتوں سے علاقہ رکھتا ہے، لیکن مصنف نے شروع کتاب میں صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ مذہب سے علیحدہ امور خانگی میں اخلاق کی تعلیم کرنا میری طاقت سے باہر ہے اور اس بارے میں اس نے اپنی رائے نہایت مستحکم عبارت میں ظاہر کی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ پہلے میرا ارادہ تھا کہ خانہ داری اور بود و باش باہمی کے واسطے نیکی اور خوش خوئی کا ضروری ہونا بغیر تعلق مذہبی ثابت کروں، لیکن جب لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا قصد کرنا گویا روح کو قالب سے، شعاع کو آفتاب سے، خوشبو کو جوہر سے، ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے۔ سو اس بیان کے مطابق اس قصے سے یہ نصیحت نکلتی ہے کہ سرگرمی اور صدق دل سے عقائد مذہبی کی پیروی کرنا ہی خانہ داری میں خوش حالی کی مستحکم بنا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ مصنف کے اس قاعدے پر رایوں کا اختلاف واقع ہوگا۔ مگر مشار الیہ نے جس حسن عقیدت اور خلوص نیت سے اپنے مطلب کو برعایت مذہب اسلام ادا کیا ہے، اس کی نسبت کسی کو اشتباہ نہ ہوگا .... لیکن جب نواب ممدوح نے کل کتاب کو بغور ملاحظہ فرمایا تو اس بات سے تسکین ہوئی کہ مصنف نے اپنے مقصد کو کہ کوئی امر متعلق مذہب یا ایسا کہ غیر مذہب والوں کو ناگوار ہو، اس میں داخل نہ ہونے پائے، بہت خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ اور عموماً ایمان اور عقائد مذہبی کے ضمن میں جو جلائل حقائق مندرج ہیں ان کو اس قدر مستحکم دیا ہے کہ جو نصیحتیں اس میں کی ہیں ان سے استنباط غیر مذہب والے بھی بوجہ احسن مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور اس باب میں جناب لفٹنٹ گورنر بہادر آپ کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف اہل اسلام بلکہ ہندوؤں اور مسیحیوں کو بھی پسند خاطر ہوگی۔ ایسے مناظر جیسے چھوٹی لڑکی کے رکھے

فہمیدہ کے ساتھ در باب ان امور کے جن کا ذکر نا خالق کی جناب میں اس پر فرض تھا وہ بالکل مقتضائے طبعی اور رقت قلبی سے بھرے ہوئے ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی مذہب کا آدمی اس کو پڑھے اور اس کے دل پر اثر نہ ہو۔

اس صورت میں جناب سر ولیم میور صاحب کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا کہ اس کتاب کو داخل منشائے اشتہار مذکور کرنا مناسب ہے۔ اس کو داخل کر کے جناب ممدوح بخوشی تمام پورا انعام ایک ہزار روپیہ کا عطا فرماتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان کے علم و ادب میں ایک عمدہ تصنیف ہے اور اہل اسلام کو بہت پسندیدہ ہوگی اور دیگر اقوام میں بھی بہت رواج پکڑے گی۔ (ل)

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی ادب کی اس وقت جو حالت ہے، اس کے پیش نظر انگریز طالب علموں کو بہترین اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھنے کے لیے ہمارے مصنف کی مذکورہ دو کتابوں توبۃ النصوح اور مراۃ العروس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی ان کا روزمرہ وہ خالص زبان ہے جو دہلی میں بولی جاتی ہے۔ ان کتابوں کی کہانیاں مسلمانوں کی مخصوص حالات اور ان کے عادات و اطوار کی مفید مثالوں سے بھری پڑی ہیں اس لحاظ سے یہ دونوں کتابیں خاص طور پر ان (انگریز) خواتین کے لیے مفید ثابت ہوں گی جنھیں شمالی ہند کے زنان خانوں میں آنے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔

مسٹر کیمپسن نے اس کتاب کا ترجمہ ایمان داری اور لیاقت کے ساتھ کیا ہے انھوں نے اصل طرز ادا اور مقامی محاوروں کو بڑی خوبی کے ساتھ انگریزی کے سانچے میں ڈھالا ہے اور مشرقی تصورات اور خیالات کو یورپی قاری کے لیے آسانی کے ساتھ قابل فہم بنا کر پیش کیا ہے، یہ کام اکثر اوقات بہت مشکل ہوتا ہے۔ بعض ابواب اور مکالمے کی خاطر مختصر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ابواب اور مکالمے اصل میں غیر ضروری طور پر بہت طویل ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اسلام کے بہتر رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے یہ رجحانات ہیں۔ خیر کی ہمت افزائی اور شر کے دبانے کے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے قصے کا مذہبی رنگ اپنی آپ مثال ہے اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بالکل ہی نئی چیز ہے۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی جو کتابیں میں نے پڑھی ہیں، یہ کتاب ان سے اسی لحاظ سے بالکل مختلف ہے مسلمانوں میں جو مذہبی کتابیں مقبول ہیں وہ مکمل طور پر خالصتاً رسمی ہیں اور ان میں صرف فرائض و واجبات اور دینی احکام ہی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ خیال کہ مذہب کو ایک ہمہ گیر اثر ہونا چاہیے اور خاندان کو اسی کی رہنمائی میں اپنی گھریلو زندگی بسر کرنا چاہیے کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب کے لیے ایک نیا موضوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس قسم کی کتاب لکھنے کا خیال صرف ایسے ہی ملک میں آسکتا ہے جو نصرانیت کے مذہبی تصورات سے متاثر ہوا ہو۔ ایسے ملکوں میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے جہاں یہ اثرات مسرت کے ساتھ دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہندوستان میں ہماری مذہبی تبلیغ کا ایک ہمت افزا اثر سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعہ اور بھی قابل لحاظ ہے کہ نذیر احمد صاحب نے جب یہ کتاب لکھی ہے تو وہ انگریزی ادب سے قریب قریب ناواقف ہی تھے اسی طرح انھوں نے انگریزی ادب کا اثر بالکلیہ بالواسطہ قبول کیا ہے۔ بعض لحاظ سے یہ اثر اور بھی قابل قدر ہے کہ یہ بالواسطہ قبول کیا گیا ہے کتاب کا قصہ کسی انگریزی کتاب کا چربہ نہیں۔ لیکن اس کے انگریزی خیالات اور تصورات کے حقیقی پیداوار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نہایت اطمینان کے ساتھ مسٹر کیمپسن کے ترجمہ کو ان تمام حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنھیں ہندوستان سے دلچسپی ہے۔ میں ان کے اس خیال کی بھی حمایت کرتا ہوں کہ ہندوستانی سیکھنے اور ہندوستانی میں مہارت کے امتحانوں کے لیے اصل کتاب بطور نصابی کتاب کے استعمال کی جانی چاہیے۔

(ل) مسٹر میتھیو کیمپسن نے کتاب توبۃ النصوح پر انعام عطا کرنے کے لیے جو مراسلہ حکومت کو لکھا تھا اور حکومت نے اس کا جو جواب دیا تھا مولانا نذیر احمد نے ان دونوں مراسلوں کا ترجمہ کر کے توبۃ النصوح کے بعد کے اڈیشنوں کے ساتھ تقریظ کا عنوان دے کر چھاپا تھا۔ مولانا کا یہی ترجمہ منشی نولکشور لکھنؤ کے چھاپے ہوئے توبۃ النصوح کے بارھویں اڈیشن دسمبر ۱۹۱۲ء سے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔

ولیم میور ۱۸۸۴ء

اب جناب میتھیو کیمپین صاحب کے کیے ہوئے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمے کی طرف آیئے۔ یہ ترجمہ چھوٹی تختی کے کل ایک سو اٹھارہ صفحات میں آیا ہے۔ مترجم نے اس کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ بڑی حد تک یہ آزاد ترجمہ ہے اگر آزاد ترجمہ نہ ہوتا تو یقیناً اتنے کم صفحات میں یہ ضخیم کتاب نہ سماتی۔ مولانا نذیر احمد نے اس کتاب میں وقت بے وقت نصیحتوں کا جو پٹارا کھولا ہے وہ بجائے خود بالکل درست و بجا ہوتے ہوئے بھی اکثر مقامات پر قصہ کی دلچسپی میں بہت حائل و مانع ہوتا ہے۔ یہ مواعظ کافی اکتا دینے والے ہیں۔ کیمپین نے ان مواعظ کو اکثر جگہ حذف کر دیا ہے یا پھر مختصر الفاظ میں ان کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔ اس سے قصہ کی روانی میں اضافہ ہو گیا ہے اور قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس طرح ناول کی حیثیت سے کتاب زیادہ پرلطف ہو گئی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ۱۲ باب قایم کیے تھے اور ان پر بڑے لمبے لمبے عنوان لگائے تھے۔ کیمپین نے اپنے انگریزی ترجمے میں قصہ کے ابواب کی تقسیم میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کی ہے اور بارہ کی جگہ تیرہ باب قایم کیے ہیں۔ ابواب کے طویل عنوانوں کی جگہ بہت مختصر عنوان دیئے ہیں۔ کہیں کہیں ہندوستانی رسوم سے متعلق مختصر حواشی بھی ثبت کیے ہیں۔

آج کل اردو ادب کے شاہکاروں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ توبۃ النصوح کا یہ انگریزی ترجمہ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے اور اس قابل ہے کہ تھوڑی سی نظر ثانی کے بعد سے دوبارہ شایع کیا جائے۔ جب کبھی بھی توبۃ النصوح یا مولانا کی دوسری کتابوں کو انگریزی یا دوسری زبانوں میں پیش کرنے کی نوبت آئے کیمپین صاحب کا آج سے لگ بھگ اسّی سال پہلے کا کیا ہوا یہ انگریزی ترجمہ یقیناً ایک رہنما کا کام دے گا۔

"حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" (بقیہ ص ۱۳)

اسی رجسٹر سے انتخاب کیے جاتے تھے۔

غالباً اس رجسٹر کی ضخامت چند ہی سال میں ہزاروں صفحات پر پہنچ گئی ہوگی، کیونکہ اسلام کی روز افزوں تحریک نے بہت جلد بادو پھیلانا شروع کر دیئے تھے۔ اور قبائل جوق جوق داخل اسلام ہو رہے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس دیوان سے صرف اس قدر افراد کے نام قلمزد کیے جاتے ہوں گے، جو مر جاتے یا مرتد ہوتے! لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعداد نو مسلمین کے مقابلے میں کتنی ہی کیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اس عمومی رجسٹر کے مقابلے میں وہ چھوٹے رجسٹر زیادہ اہم اور مفید تاریخ معلوم ہوتے ہیں۔ جو غزوات و سرایا کے ذیل میں مرتب ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ان سے شرکاء جنگ اور مقتولین و مجروحین کی ٹھیک ٹھیک تعداد کا اندازہ ممکن تھا! اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں قسم کے رجسٹر عہد رسالت کے بعد بھی کچھ عرصہ محفوظ رہے تو ظاہر ہے تاریخ کا یہ بہت بڑا سرمایہ تھے جو ابتدائی مدونین اور رواۃ سیرۃ کی نظر سے گزر سکتا تھا۔

میں آئندہ فصل میں اس کی افادیت کو دوبارہ پیش کروں گا۔

ماہنامہ "کتاب" لکھنو

شوکت تھانوی نمبر

مرتبہ: احمد جمال پاشا

- شوکت تھانوی کے کارٹون، تصاویر، عکس تحریر
- شوکت تھانوی کے مضامین، افسانوں، پیروڈی، خاکے، ڈرامہ، شاعری، لطائف اور سنجیدہ نظم و نثر کا باغ و بہار انتخاب۔
- شوکت تھانوی کے فن اور شخصیت پر عبدالماجد دریابادی، احتشام حسین، ابراہیم جلیس، محمد طفیل، عشرت رحمانی، نسیم انہونوی، فرقت کاکوروی، عابد سہیل اور احمد جمال پاشا کے فکر انگیز مضامین۔
- شوکت تھانوی نمبر حاصل کرنے کے لیے سالانہ چندہ بھیجکر آج ہی خریدار بن جایئے۔

صفحات ۱۱۰ قیمت شوکت تھانوی نمبر ۹۰ نئے پیسے۔ زر سالانہ ساڑھے ۴ روپے

منیجر

ماہنامہ "کتاب"۔ چوک لکھنو ۳۔

نامۂ مومن

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

فارسی ادب میں ایک مدت تک سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور پنج رقعہ کا سکہ چلتا رہا ہے۔ اور اسی انداز کو معیاری مقام حاصل تھا۔ مومن کے فارسی انشا کا بھی یہی انداز رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا وہ مرتبہ نہیں جو ظہوری کا ہے مگر ان کے انداز بیان نے ظہوری سے قربت ضرور حاصل کر لی ہے۔ اس وقت مومن کے فارسی انشا سے بحث مقصود نہیں۔ صرف چند باتیں اس خط کے متعلق عرض کرنا ہیں۔ تاکہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ ادبیات کے حسن و قبح کا فیصلہ ذوق و وجدان ہوتا ہے۔ مگر اس دور میں فارسی کا سمجھنا چہ جائیکہ مومن کی فارسی کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے مجھے مومن کے خطوط کا ترجمہ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ یہ خط اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

خط نذکور انشائے مومن کا ستائیسواں خط ہے۔[1] جو انھوں نے ایک مطربہ کے ناز بے جا کی شکایت میں لکھا ہے۔ اس خط کا جو عنوان حکیم احسن اللہ خاں (مرتب انشائے مومن) نے تحریر کیا ہے وہ یہ ہے: "نامۂ لبریز گلۂ ناز بے جا۔ بنام مطربۂ ماہ جبینے زہرا نوا"۔ یہ خط کئی اعتبار سے دلچسپ اور اہم ہے۔

۱۔ یہ خط مومن کی حیات معاشقہ سے متعلق ہے اور ان کی جوانی کی رنگ رلیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگرچہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس "ماہ جبیں" کا نام کیا تھا۔

۲۔ اس میں ایک حسین ڈومنی کے ناز بے جا کی شکایت کی ہے اور بڑے مزے کی چٹکیاں لی ہیں۔ جس میں مومن کا طنز اپنے پورے نکھار پر نظر آتا ہے۔

۳۔ تحریر میں بے حد رنگینی ہے اور اس رنگینی کے باوجود بے ساختگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ مقفیٰ عبارتوں، برجستہ اشعار اور دلچسپ تشبیہات نے اور بھی زور پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ حسب عادت مومن نے اپنے اس خط میں بھی "انا" اور "خودداری" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

مومن کی حیات معاشقہ کے سلسلے میں صرف "صاحب جی" کا نام ملتا ہے اگرچہ مومن نے اپنے چھ عشقوں کی داستان اپنی مثنویات میں لکھی ہیں۔ اور ان مثنویوں کو پڑھنے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس خط کا مکتوب الیہ ان محبوباؤں میں سے کون ہے۔ محض "صاحب جی" کا نام معلوم ہونے کی صورت میں ہر مثنوی اور ہر عشقیہ خط کو ان سے منسوب کر دینا مضحکہ خیز ہے۔ اس خط میں محبوبہ کے ناز بے جا کی شکایت ہے اور اس کی جفاؤں کا شکوہ جو ان کی تقریباً ہر مثنوی کا بھی موضوع ہے۔ افسوس ہے کہ اس خط کی تاریخ کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کاش حکیم احسن اللہ خاں نے جہاں اس کی ترتیب کا احسان کیا ہے وہاں تاریخ یا سنین کا بھی حوالہ دیتے۔

مومن کی جوانی عشق اور حسینوں کی چھیڑ چھاڑ میں گزری۔ اس لیے ان کے کلام میں بھی یہی انداز موجود ہے اور ان کے خطوط میں بھی یہی رومانی کیفیت ان پر اس قدر حاوی ہے کہ جب وہ اپنی پھوپی (والدہ حکیم احسن اللہ) کو بھی خط لکھتے ہیں تو اس میں رنگین اور رومانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں غرض یہ کہ ان کا موضوع سخن جہاں حسینوں سے ہوگا وہاں شوخی بھی ہوگی اور طنز بھی۔ یہ طنز خواہ مقصد براری کے لیے ہو یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ شوخی اور طنز کا اظہار اعلیٰ ذہانت کے بغیر ممکن نہیں۔ چند فقرے قابل غور ہیں۔

"ایسی جلاد کہ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے"۔

"ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے"۔

"ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو بیٹھے دمعنوے کی محنت قرار دیتی ہے"۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو انشائے مومن مخزونہ ہارڈنگ لائبریری دہلی۔

[2] جلادے کہ دست بخون بے گناہ آلاید و حنا پندارد و صیادے کہ اگر طائر بام حرم بدامش افتد بے کشتن نگزارد، سخت گیرے کہ قصہ فرہاد و بے ستون بجنی گل برگرفتن گیرد۔

مومن کی نثر میں شوخی کے ساتھ وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جو نثر مرصع کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ چوں کہ یہ انداز ان کا اپنا مزاج ہے اس لیے اس میں کسی قسم کا تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس خط میں بیشتر رعایتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آخر میں نہ صرف قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہے بلکہ اس میں صنعت تجنیس اور ایہام تناسب کی مثالیں بھی موجود ہیں[1]۔ نئی نئی تشبیہات سے خط کو اور بھی رنگین بنا دیا ہے۔

آخر میں ایک امر کی طرف خاص طور سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ خط انھوں نے ایک محبوبہ کے نام لکھا ہے اور بارگاہ حسن میں اپنی خودداری کا اظہار تو بڑی چیز ہے اپنے وجود کا تصور بھی محال ہے۔ اس خط میں جذبۂ خود نگہداری بھی موجود ہے۔ حوالہ جات ذیل سے نہ صرف ان کی بے رعنائی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ذہنی تجزیہ کرنے میں بھی سہولت ہوگی۔

"میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج"

"اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ دیتا ہوں"

"عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند"

"میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی"[2]

موجودہ طبایع ممکن ہے کہ اس انداز کو نہ پسند کریں اور اس کے مقابلے میں سادگی اور اختصار کو ترجیح دیں مگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے ماحول میں دیکھیں۔

ایک مطربہ کے نام

(ناز بے جا کی شکایت میں)

اے خانۂ فریاد نوا! بلبل کی طرح نالے کر کہ ایک گل گوش، غنچہ دہن تیری آواز پر کان لگائے ہے۔ اے نامۂ خونیں تحریر لالے کی خوشی سے پھول جا کہ ایک رنگین ادا کے دست نگاریں میں تیری جگہ ہے۔ اے دل بے قرار مدد کر کہ ایک تغافل شعار نے میرا حال پوچھا ہے۔ اے درد جاں فرسا رحم کر کہ ایک عیسیٰ لب میری بے چارگی کے علاج پر متوجہ ہوا ہے۔ اے نازک معانی بہ نوازش کا وقت ہے کہ ایک نازک دماغ نے پرسش حال کی ہے مگر میں اس کے دردِ سر سے ڈرتا ہوں اے مضامین لطیف دل سے زبان تک آنے کا موقع ہے کہ لطیف مزاج میرے ملال کی چارہ جوئی پر آمادہ ہے مگر سخت کلامی کی سزا جانتا ہوں۔ اے میرے شب کی تیرگی میری سیاہی کے کام آ میں ایک ماہ رخسار کو دو حرف لکھنے والا ہوں اور اے میرے نصیب کی ظلمت مجھ سیہ کار کے خط کی تحریر میں مدد دے کہ میں ایک مہر لقا سے شام ہجر کی شکایت کرنے والا ہوں۔ اے دیدۂ خوں بار اشکوں میں جگر کے ٹکڑے گرا اس واسطے کہ میں لوح خط کی سرخی کے لیے حیران ہوں۔ اے زردیٔ رخسار میرے آنسوؤں میں شامل ہو جا اس واسطے کہ مکتوب کی زر افشانی کی اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔ اے دودِ جگر میرے نامہ کی سطروں کا پیچ و خم بن جا، زلف پر خم کی حسرت حوصلہ فرسا ہے۔ اے شعلۂ پر شرر مدد کر، مضامین غم کی گرمی ہنگامہ کا وقت ہے۔

---

[1] اے خانۂ تظلم صریر بلبل آسا بنال، گل گوش غنچہ دہانے بر صدائے تست دل دادہ۔ اے نامۂ خونیں تحریر چوں شقایق بر خود ببال، بہ نگاریں دست رنگیں ادا جائے تو۔ "صریر" اور "تحریر"، "خامہ" اور "نامہ"، "ببال" اور "بنال" یہ الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ اس کے علاوہ "خامہ"، "نامہ"، "بنال اور ببال" میں صنعت تجنیس ہے۔ آگے بڑھ کر مومن نے ایہام تناسب سے کام لیا ہے۔ بلبل کی رعایت سے "صریر" کا لفظ لانا کہیں کہیں چار چار فقرے آئے ہیں + اور ہر فقرہ اپنے متقابل فقرے کے قافیے سے ہم آہنگ ہے۔

[2] عاشق معشوقانہ مزاجم و باصد نیاز مندیہا بے احتیاج۔ مدعایم اگر دل بہ بے حاصلی نہد آں مدعا ہی گزارم .... عاشق وفا شعارم اما غیرت مند .... بلبلم در ہر گلشن نغمہ نسراید و طوطیم بر ہر شکر لبے منقار نکشاید۔

رباعیات:۔

اے لب! افسانۂ تمنا کی کچھ بات سنا
اے نالے! شوق حوصلہ فرسا کا کچھ ذکر کر
اے شخص! اس نے آج وفا کی حکایت پوچھی ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری داستان کا کچھ ذکر سننا چاہتا ہے۔

میں دیوانہ ہوں اور اس کے ساتھ اپنی دور اندیشی پر خوش ہوں۔
ایسے دیوانہ پر سو عقلیں قربان
اپنے خط کو کبھی چومتا ہوں، کبھی دل پر رکھتا ہوں۔
جانتا ہوں کہ یہ محبوب کے ہاتھ میں جائے گا۔
اے زبان ہرزہ درا بے ہودہ نالے نہ کر کیوں کہ ایک شوخ جفا شعار مخاطب ہے۔ اے نطق پریشاں نوا بے باکانہ فریاد نہ کر کیوں کہ ایک سخن ناشنو ظالم سے کام پڑا ہے۔

رباعی:۔

ایسا شوخ جس نے کسی سے وفا نہ کی اور نہ کرے
جس نے کسی کی مشکل گرہ نہ کھولی ہے اور نہ کھولے
بے کار نالے کرنا کس لیے۔ میں جانتا ہوں
کہ ہمارے حال پر اس نے رحم نہ کیا اور نہ کرے

اے اثر! میری دادرسی کر میں ایک ظالم کے ہاتھ سے گرم فریاد ہوں۔ اے آسمان میری مراد کے مطابق گردش کر کہ میں ایک زہرہ جبیں کے سر کے گرد پھرنے سے محروم ہوں۔ اے آہ نارسا! یہ بے سرا پن کیوں ہے۔ اے شور فریاد کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرا روئے سخن کس کی طرف ہے (اس کی طرف ہے) جس کی نا ہید ۔۔۔ دلوں پر اثر کرنے والی اور سرود سرائی محل افتخار۔ باربد کا ترانہ اس کی شیریں ادائی پر قربان اور حضرت داؤد کا نغمہ اس کے انداز کا دعا گو۔ اس کے کلام شیریں کی حسرت میں طوطی شیریں گفتار تلخ کام ہے اور اس کے سخن رنگین کے رشک میں باغ کا افسانہ بلبل کے لب سے ناتمام ہے۔ اس کی گوش آشنا آواز کی نرمی کے مقابل پھولوں کے کھلنے کی آواز خزاں دیدہ پتوں کے شور سے مشابہ ہے اور اس کی طرب فزا گفتار کی نزاکت کے سامنے بانسری کا نغمہ کسی ماتم رسیدہ کے گلے کی فریاد کی مانند ہے۔

مثنوی:

اس کا لعل لب موتی برسانے میں
رخ معانی کے لیے آب و رنگ کا حکم رکھتا ہے
اس کے رنگین ہونٹ یاقوت کی تحریر میں
اس کے انفاس سحر ہاروت کا کام کرتے ہیں۔
اس کے انفاس کا افسانہ اعجاز سے کم نہیں
حضرت مسیح بھی اس کے غم میں جان دیتے ہیں
اس کے مژگاں کی تلوار مشتاقوں کی آہ کی طرح کاری ہے
اس کی چشم سیاہ عاشقوں کے نصیب کی طرح کالی ہے
اس کی نگاہیں دلبری میں سحر کرتی ہیں
اس نے جادوگری کو فقرہ ماضی بنا دیا ہے

اس کی پیشانی آئینہ تمثال ہے
صبح کی پیشانی اس کے رہ پر در سر بسجود ہے
اس کا رخسار اپنے دل افروز جمال سے
آفتاب کے جگر کا داغ (باعث رشک) ہے
قیامت اس کے قامت کے گرد پھرتی ہے
سو طرح کی بلائیں اس کے قد پر قربان ہوتی ہیں
جب وہ جلوہ دکھاتی ہے تو ستم ڈھاتی ہے
جب وہ اٹھتی ہے تو فتنے اٹھاتی ہے
اس کی جلوہ گاہ کا غبار سراپا آشوب ہے
صحرائے قیامت اس کی گرد راہ ہے
اس کے زلف کی حکایت بہت دراز ہے
یہ سمجھو کہ وہ میری شب ہجر کی ترجمان ہے
اس کے گیسوؤں کا ہر بال اپنے پیچ و خم سے
دانا اور ناداں سب کے دلوں کے لئے جال کا کام دیتا ہے
نزاکت کے باوجود اس کی طبیعت
سنگ دلی کا بار اٹھاتی ہے
اس عادت میں سمن زار کی سی لطافت ہے
اس کی گلی میں چمن زار کی سی طراوت ہے
اس کا ہر غمزہ عاشقوں پر نظر رکھتا ہے
اس کا ہر عشوہ مشتاقوں کا آرزومند ہے
اس کا شیوہ دل ستانی
لوگوں کو لطف و مہربانی کے ساتھ زندگی بخشتا ہے

ارے میں نے کیا کہا۔ طریقہ دل ستانی اور شیوہ مہربانی کا کیا ذکر وہ تو ایسی بے مہر ہے کہ دل بھی جبر سے چھینتی ہے۔ جفا اس کی طبیعت سے اتنی قریب ہے کہ فریاد بھی زبان مظلوم سے اس قدر قریب نہ ہوگی اور رحم اس کے دل سے اتنا دور ہے کہ ہنسی بھی غم رسیدہ کے منہ سے اس قدر دور نہ ہوگی۔ وہ ایسی خوں خوار ہے کہ میری چشم خوں فشاں کی طرح عاشقوں کا خون گراتی ہے اور ایسی ظالم جس کی گلی سے فتنۂ عرصۂ محشر کا غبار لے کر اٹھتا ہے۔ ایسی جلاد کہ بیگناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے۔ ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے۔ ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو مٹی ڈھونے کی محنت قرار دیتی ہے اور ایسی بد عہد کہ شیریں اور شیرویہ کے وعدے کو وفا شعاروں کی درستی عہد ٹھہراتی ہے۔ ایسی بے درد کہ مظلوموں کے نالوں پر ہنستی ہے۔ ایسی بے رحم کہ پروانہ کی بالیں پر شمع کا رونا پسند نہیں کرتی۔ ایسی غلط اندیش کہ محتسب کو قتل کرنے کے لیے مستی کا بہانہ بناتی ہے اور ایسی کافر کیش کہ بادہ گلگوں کا مزا لے کر مومن کا خون پیتی ہے۔ ایسی زود خشم کہ کسی کو سزا دیتے وقت (اتمام حجت کی تاخیر اس کو درازی روز جزا نظر آتی ہے۔ ایسی سیاہ چشم کہ شب ہائے فراق کی سیاہی اس کی نگاہ میں نہیں جچتی۔ ایسی بے وفا کہ عہد باندھنے ہی کو ایفائے عہد سمجھتی ہے اور ایسی خنجر آزما کہ عاشق کے دم واپسیں کو آغاز امتحان ٹھہراتی ہے:۔

رباعی:

ایسی شوخ جس کی جفائیں نہیں اٹھائی جا سکتیں
ایک دن بھی اس سے مرادِ دل حاصل نہیں ہو سکتی
اگر اس نے میرا سر تن سے قطع کیا تو مشکل نہیں
مشکل تو یہ ہے کہ اس سے قطع محبت نہیں کر سکتے۔

اے کافر بے وفا، اے غیروں سے محبت کرنے والی، اے ناشکر، اے الفت دشمن، اے حق ناشناس، سخن ناشنو، اے درشتی پسند، سست عہد، اے وفا نہ ہونے والے وعدوں پر بھی پشیمان، اے ستم شعار، آسمان کو ستم سکھانے والی، اے گردشِ روزگار کی استاد، اے سفلہ پرور، رقیب نواز، اے لطفِ خدا سے بے نیاز سے بے نیاز، اے نامرادوں کے خرمن کو جلانے والی برق، اے دلوں کے جگر کو پگھلانے والے شعلے، اے قیامت کی پرسش سے بے پروا رہنے والی، اے قتلِ مومن بے گناہ پر کمر باندھنے والی، اے اہلِ عزت کی ذلت چاہنے والی، اے بے تمیزوں کے دام میں اسیر، اے غرور سے تیوری چڑھائے ہوئے، اے بے پروائی سے میرے حال تباہ سے ہاتھ اٹھائے ہوئے، اے وہ جس نے عمر بھر ظلم سے میرا امتحان لیا، اے وہ جس نے مدتوں میری مہر و وفا کو آزمایا، اے مہربانیوں پر نامہربانی کرنے والی اے وہ کہ سو غم و ملال کے باوجود میرے سر میں تیرا سودا ہے اور میری ناتواں، نیم جاں تجھ پر فدا ہے، آخر کب تک میں آتشِ فراق میں جلوں اور دردِ تنہائی سے نباہ کروں۔

فرد:

تیری جفا اور میری وفا دونوں حد سے گزر گئیں
تجھ کو اپنے سے اور مجھے خود سے شرم آنی چاہیے

وصل کی شب نے جو ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی، مجھے یہ دن دکھایا .... جب سے تو نے میرا ہاتھ تھاما، کبھی میں اس کو آنکھوں پر رکھتا ہوں، اور کبھی سر پر اور جب سے تو نے اپنی انگوٹھی ہاتھ سے میری انگلی میں پہنائی، کبھی انگلی کو بوسہ دیتا ہوں، اور کبھی انگوٹھی کو۔ وہ محبت کی باتیں کیا ہوئیں اور وہ وفا کا ذکر کہاں گیا۔ راستی بزا جھوٹی قسمیں چھوڑ اور وعدہ ہائے تسلی آمیز یاد رکھ۔ آخر روزِ جزا آنے والا ہے۔ خدا نہ بے ہمتا کا سامنا ہونے والا ہے، خدا اس دن سے بچائے کہ میں تیرا دامن پکڑوں اور دل کے ٹکڑے داورِ محشر کے سامنے پیش کروں۔ اپنے نالہ ہائے قیامت گداز سے ایک نئی قیامت برپا کروں اور شعلہ ہائے آہِ سوز سے اہلِ جنت کو دوزخ میں ڈال دوں، میری آہوں کے شعلے فرشتوں کے بال و پر تک جلا دیں اور سدرہ و طوبیٰ کی شاخیں آتش پرستوں کے ہاتھ پاؤں کی طرح بھڑک اٹھیں، میں ایسی فریاد کروں جن کے شعلوں کی گرمی کوثر کو آبِ گرم اور خلدِ بریں کو جہنم بنا دے۔ سچ ہے۔

شعر:

اگر ایک دن جدائی کی آگ دوزخ پر مسلط ہو
تو یقیناً اس کے شعلے پگھل کر رہ جائیں۔

نہیں نہیں کہاں میں اور کہاں یہ بے مروتی۔ لیکن "یوم تبلی السرائر فما لہ من قوۃ ولا ناصر[1]" کے مفہوم سے ڈرتا ہوں اور دل میں "من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ[2]" کی فکر سے دو نیم ہے۔

بیت:

میں نامراد تیرے مظالم سے کیوں کر نبھاؤں
میں نہیں کہتا کہ تو نے کیا کیا تو ہی بتا کہ میں کیا کروں

میرا غبارِ خاطر تیرے قدموں کے آوازکی ہوا سے اڑ جائے گا۔ میرے دل کی کدورت تیرے قدمِ صف لزوم سے پامال ہو جائے گی۔ اگرچہ میں شیشۂ شراب کی طرح صاف طبیعت ہوں لیکن ساقی کی دستگیری کے بغیر سر جھکانے والا نہیں۔ میں صیقل شدہ شمشیر ہوں اور چلے تک کھنچا ہوا تیر، جب تک تو مجھے سر پر نہ رکھے گی، میں اپنے ناخن کو تیری عقدہ کشائی کی زحمت دوں گا، اور اگر تو مجھے چٹکی سے چھوڑے گی تو پھر تیرے ہاتھ نہ آؤں گا۔ میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج۔ اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ بیٹھتا ہوں اور اگر میری تمنا حاصل نہیں ہوتی تو اس تمنا ہی سے دست بردار

---

[1] جس دن لوگوں کے دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہو گی اور نہ مددگار
[2] جو کوئی ذرہ کے برابر بدی کرے گا اس کو دیکھ لے گا

ہوجاتا ہوں۔ میں عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند اور بندہ حق گزار ہوں لیکن خریدار پسند میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی۔ میرا پروانہ ہر شمع رخسار کے گرد نہیں گھومتا اور میرا دیوانہ ہر پری جمال کا مجنوں نہیں ہوتا۔ طور کو جلانے والی آگ سے میں بے خود ہو کر گرتا ہوں تاکہ بال و پر کے جلنے کا عذاب نہ دیکھوں .... میرا یوسف زلیخا کا غلام نہیں ہوتا کہ وہ اس کو زندان بلا میں ڈال دے اور میرا فرہاد عشق شیریں کی تلخی نہیں سہتا کہ وہ (شیریں) اپنے لب شیریں پرویز کے لیے وقف کر دے۔ میں حلقہ زنجیر ہوں جس کے پاؤں پر چڑھ وہ اٹھا یا گرفتار دگر فتار محبت) ہو گیا۔ میں رنگ حنا ہوں جس کے ہاتھ کو میں نے بوسہ دیا اس نے دوسروں کے قتل پر تلوار کھینچی۔ میں پایہ منبر ہوں جس کے پاؤں پر سر رکھوں وہ اپنی جبیں نیاز میرے قدموں سے گھسے اور اور میں خط پرکار ہوں اسی کے گرد پھروں جو میرے آغوش میں آئے۔

رباعیات:

مومن مجھے تو بت پرستی سے روکتا ہے
مگر خود خدا کی بندگی کیوں نہیں چھوڑتا
یوسف نے زلیخا کی خدمت کا حق نہ پہچانا
میں اس کا غلام ہوں جو مجھے اپنا آقا سمجھے

وہ شوخ جو خدائی کے دعوے کرتا ہے
اور کبریائی کی سینکڑوں شیخیاں مارتا ہے
مومن کی محرومی گوارا نہ کرے گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں
کہ خدا عقدہ کشائی کی شان رکھتا ہے

جب تک فتنہ روز قیامت نہ اٹھے تیرا قد محشر خرام جلوہ نمائی کرتا ہے۔ اور جب تک شور محشر ہنگامہ برپا نہ کرے تیری رفتار فتنہ انگیز ہنگامے اٹھاتی رہے۔

قطعہ:

جب تک عاشق کی شب ہجر کی درازی کے افسانے رہیں
تیری عمر تیری زلف مشکیں کی طرح دراز ہو
تو گرم صحبت رہے اور شمع محفل کی طرح
حاسد کی جان آتش غم سے پگھلتی رہے
میں تیرے ساتھ ہم کلام ہوں اور رقیب حسد سے گرم فریاد
میں تیرا ہم نشیں ہوں اور دشمن مارا مارا پھرے
میں کامیاب وصل ہو جاؤں اور غیر ناکامی کے باعث
مرنے کا امیدوار ہو
میں خدائے کارساز کی مہربانی کا شکریہ ادا کروں
اور وہ رقیب چرخ حیلہ ساز کی طرح شکایت کرتا رہے

چھیڑ غالب سے چلی جائے
غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بے حد دلچسپ انداز سے پیش کرنے والی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے۔ قیمت: ۵ روپے
نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

غلام ربانی تاباں

کسے دوام کی فرصت یہاں خضر کی طرح — تپش کی زیست یہی ایک پل شرر کی طرح
طلب کی راہ سے گزرے ہیں یوں بھی دیوانے — زمانہ ساتھ چلا گردِ رہ گزر کی طرح
گلوں کو چاک گریبانیاں مبارک ہوں — نسیم آئی بہاروں کے نامہ بر کی طرح
کبھی گزر بھی گیا شوق حد تمکیں سے — کبھی چھلک بھی گیا جام چشمِ تر کی طرح
ہزار سادگی و صد ہزار پرکاری — نہ کوئی دوست نہ دشمن تری نظر کی طرح
جنوں وہ خام جو بن جائے انجمن کا چراغ — ہوا کی زد پہ رہو شمع رہ گزر کی طرح
وہ گفتگو کا سلیقہ بھی چاہیے تاباںؔ — کہ بات دل میں اتر جائے نیشتر کی طرح

امتیاز علی عرشی

شبابِ عمرِ دو روزہ کا اعتبار ہی کیا — چمک کے ساتھ جو بجھ جائے وہ شرار ہی کیا
نہ کر تو آمدِ فردا کا انتظار نہ کر — جو جا کے آ نہ سکے اس کا انتظار ہی کیا
اٹھ اور نگاہ کی خارا شگافیاں دکھلا — کہ جو علم نہ ہو وہ تیغِ آبدار ہی کیا
تلاش آہوے رم خوردہ، اے خوشا لذت! — جو آپ دام میں آجائے وہ شکار ہی کیا
بہار دامن گلرنگ، اے لباسِ زینت! — جو خونِ دل نہ بہائے وہ دلفگار ہی کیا

سحر رامپوری

یاد آیا جہاں بھولے سے تمہارا دامن — وہیں بیساختہ آنکھوں نے پکارا دامن
ایسے کم ظرف کو مٹی ہی میں مل جانا تھا — اشک حسرت کو نہ دینا تھا سہارا دامن
میری وحشت سے کچھ اچھی نہیں چھیڑ یعنی — ہے اسی چاک گریباں سے تمہارا دامن
لوٹ ہی لی تھیں گلستاں کی بہاریں میں نے — کہاں آ کر دل کج فہم پکارا دامن
فیصلہ ہوش و جنوں کا ہے بہار آنے دو — دیکھنا ہے، کہ کسے ہوتا ہے پیارا دامن
مسکرائی ہیں جو کلیاں تو اسی دامن میں — اور کانٹوں کے لیے ہے تو ہمارا دامن
اپنا افسانۂ غم اب نہ سنائے گا سحرؔ — اپنی آنکھوں سے ہٹائیں وہ خدارا دامن

غلام ربانی تاباں

بھٹکے ہیں لاکھ مسافر، سفر ہے کیا کیجے
ابھی وہی کشش رہگزر ہے کیا کیجے

جنوں پہ قید طلب بھی بہت گراں ہے مگر
جبیں نواز ترا سنگ در ہے کیا کیجے

چمن میں کوئی نشیمن رہے رہے نہ رہے
بہار موسم رقص شرر ہے کیا کیجے

بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے
غبار راہ سہی، ہمسفر ہے کیا کیجے

تمام عمر شکستوں سے دل کا کام رہا
خلوص شوق رقیب اثر ہے کیا کیجے

شکایت ستم روزگار لاحاصل
غم حیات سے کس کو مفر ہے کیا کیجے

ہنسے تھا عقل کی دیوانگی پہ کل تاباں
مگر وہ خود بھی تو آشفتہ سر ہے کیا کیجے

صبا اکبرآبادی

آگ بجھ گئی غم کی ہم ہنوز جلتے ہیں
دن بدل گئے لیکن دل نہیں بدلتے ہیں

وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بھٹک کے چلتے ہیں
گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں

وقت جب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں
زندگی کے سانچوں میں انقلاب ڈھلتے ہیں

وہ عبور کرلیں گے قلزم مصائب کو؟
روز جن سفینوں کے ناخدا بدلتے ہیں

ایک دن یہی شاید اس گلی میں لے جائے
دل جدھر چلے ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وحشیوں کے رستے میں باغ ہو کہ جنگل ہو
پھول بھی کچلتے ہیں، خار بھی کچلتے ہیں

اتنی تیز رفتاری کیوں ہے سوئے میخانہ
اے صبا ذرا ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں

انجم قریشی رامپوری

عالم تمام مطلع انوار ہو تو ہو
جلوہ بقدر وسعت ذوق نظر نہیں

محروم ہوں نشاط محبت سے کیا کہوں
ظالم کو پاس سوزش زخم جگر نہیں

انجم نے پھول اپنے نشیمن میں رکھ لیے
افسوس بجلیوں کو ابھی تک خبر نہیں

غالبیہ ـــــــــــــــــ تیسرا باب

اکبر علیخاں

اس عنوان کے تحت اس بار ایسی خبریں شریک کی جارہی ہیں جو غالب کی زندگی میں معاصر اخبارات کے صفحات پر جگہ پاچکی ہیں۔ سوائے اردوے معلّیٰ اور عود ہندی کے اشتہارات کے جو غالب کی وفات کے صرف دو ماہ بعد شایع ہوئے تھے۔ زیرِ نظر خبروں کی تعداد یقیناً کم ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ بہت سی خبریں ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔

مثال کے طور پر خود غالب نے اخبار لودھیانہ میں ایک خبر کی اشاعت کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے درباری اعزاز کی تخفیف و ترمیم کی اطلاع چھپی تھی۔

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا اہتمام

مگر اخبار لودھیانہ کے مذکورہ نمبر کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر ہمارے پاس اُس عہد کے اخبارات و رسائل کی قابل لحاظ تعداد محفوظ ہوتی تو غالب اور معاصرین غالب کے بارے میں بڑے اچھے ذخیرے سے استفادہ کیا جاسکتا۔

بہرحال غالب کے معاصر اخباروں کے صفحات پر جو کچھ ملا ہے اسے ایک سلسلے میں پرو لیا گیا ہے۔

غالب کا اردو و فارسی کلام بھی اخبارات میں چھپا کرتا تھا مراسلات بھی شایع ہوتے تھے اور غالب کی نثر غالب سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔ خبروں میں قاطع برہان کے ہنگامے، قمار بازی کے ذیل میں سزائے قید، ہند کا ذکر، انگریز حکومت سے تعلق اور مشاعروں میں شرکت کا حال موجود ہے۔ جو غالب کی مقبولیت کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ یہ غالب کے مورخ کے لیے حسب مراد اور اطمینان بخش نہ بھی مفید اور کار آمد مواد کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔

دہلی اردو اخبار ———— (۲۲ اگست ۱۸۴۱ء)

قمار بازاں

سنا گیا کہ ان دونوں گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثل ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب و کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے .... یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن ان تھانیدار کی خدا خیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ بھیٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۷۳)

اخبار مہر منیر کلکتہ ———— (۲ ستمبر ۱۸۴۱ء)

از اخبار دہلی واضح شد کہ از مکان میرزا نوشہ، شاعر نامدار دہلی، یکی از عزیزان نواب شمس الدین خاں مرحوم، تنی چند مقامران نامدار کہ در ذلیل دنہار بجز قمار و دیگر کار نداشتند، در حالت مقامرت بسعی تھانیدار اسیر و گرفتار شدند و بر محکمہ حاکم حاضر گردیدند۔ حاکم نصفت شعار از شاعر یک صد روپیہ واز دیگراں سی سی روپیہ جرمانہ گرفتہ آزاد فرمود۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۵۵)

احسن الاخبار بمبئی ———— (۲۰ دسمبر ۱۸۴۴ء)

بتاریخ ۱۴ ماہ اکتوبر میجر جان جاکوب اکبر آباد (آگرہ) سے دہلی وارد ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے رفاقت قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا۔ اور نواب ضیاء الدین خاں کے مکان میں جہاں پہلے ہی مہمانداری کا انتظام کیا گیا تھا ٹھیرایا دو دن کے بعد میجر صاحب بہادر نے ٹامس مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ (دہلی کا آخری سانس ص ۵)۔

احسن الاخبار بمبئی ———— (۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء)

ماہ گزشتہ کی پندرہ اور سترہ تاریخ کو نواب گورنر جنرل بہادر نے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ عمائدین رؤسا شرفا اور خاص خاص اصحاب شریک تھے، تمام اہل دربار کو ان کے مرتبے کے موافق انعام و اکرام دیا گیا .... ۱۷ تاریخ کے دربار کی رپورٹ اور تقسیم انعام کی تفصیل حسب ذیل ہے:

دربار عام ہوا اور دور دور سے انگریزوں کو بلایا گیا بڑے بڑے صاحبان عالی شان تشریف فرما تھے۔ مجمع بہت بارونق تھا دو گھنٹے تک ملکی معاملات پر تقریریں ہوئیں اس کے بعد دو نئے آدمیوں نے نواب گورنر جنرل بہادر سے تعارف حاصل کیا۔ محفل میں ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ حاضرین میں سے ہر ایک کے بالخصوص حاکموں اور افسروں کے چہروں پر خوشی اور کامیابی کی سرخی جھلک رہی تھی اس کے بعد انعامات تقسیم کیے گئے۔

.... (۱۳) مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر .... (۱۷) مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت پارچہ اور ایک گھنٹہ .... اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کو اپنے دست مبارک سے ایک ایک شال مرحمت فرمایا ...... (۲) سید فیض الحسن صاحب کو قوال شہر ...... ساس موقع پر نذریں بھی پیش کی گئیں جو شکریے کے ساتھ قبول ہوئیں مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرتے وقت نواب گورنر جنرل بہادر نے کہا آپ لوگوں کی دیانتداری انصاف پسندی نیک نامی اور علم و فراست سے صاحب بہت مسرور اور رضامند ہیں۔ ...... ۱۸ تاریخ کو بدر الدین مہر کن نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل کا نام کھدا ہوا تھا نذر کے

طور پر پیش کیا۔ ان کو خلعت پنج پارچہ عطا کیا گیا۔

جس صورت سے موجودہ گورنر کے عہد میں ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق و عنایات کا برتاؤ کیا گیا اس سے پہلے ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رعایا میں بڑے چھوٹے سب کی زبان پر ان کے عدل و داد کے تذکرے ہیں ان کے عہد کی یہ خصوصیت ہے کہ اشاپردازوں، تحصیلداروں تک کو خلعت تقسیم کیا گیا (بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۲۴۰)

اخبار فوائد الناظرین۔ کلکتہ ——— (۳۱ر مئی ۱۸۴۷ء)

۵ رمئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قماربازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب خبر پاکر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو معہ چند قماربازوں کے گرفتار کر کر کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ انکے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔

(قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں امتیاز علی عرشی نوائے ادب بمبئی اپریل ۵۸ء)

احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲۵ر جون ۱۸۴۷ء)

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کی باعث قماربازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی (یہ چٹھی بادشاہ نے لکھی تھی اس لیے کہ انھیں کی مصروفیات ۱۰ ر جمادی الثانی کے تحت یہ خبر آئی ہے) کہ ان کو رہا کر دیا جائے یہ معزز شہری ہیں یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۱)

احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲ر جولائی ۱۸۴۷ء)

میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ تقدمہ مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو حضرت یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۴—۱۷۵)

اسعد الاخبار آگرہ ——— (۱۲ر مارچ ۱۸۴۹ء)

نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب۔ جو اپریل میں قیمت بھیجدے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروان راہ سخن ‏ پایہ سنجان دستگاہ سخن
طے کرو راہ شوق زود زود ‏ آن پہنچی ہے منزل مقصود
پاس ہے اب سواد اعظم نثر ‏ دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی ‏ چشم بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا ‏ جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہراہ دہلی ہے ‏ مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ ‏ گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار　　بار ور جس کا ہر گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں　　نہیں ایسی کتاب عالم میں
اس سے انداز شوکت تحریر　　اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا طرز نغز گفتاری　　حبذا رسم و راہ نثاری
نثر در حسن سرائے ابراہیم　　ہے مقرر جواب پئے تعلیم
اُٹھا کے نفروں میں کون آیا ہے　　کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلا　　ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلا
ورزش قصۂ کہن کب تک　　داستان شہ دکن کب تک
تا کجا درس نثرہائے کہن　　تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب　　اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے　　اسد اللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے درست　　"ہر کرا پنج روز نوبت اوست"
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے　　شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہ قدردان معنی ہے　　بادشاہ جہان معنی ہے
نثر اس کی ہے کارنامۂ راز　　نظم اس کی نگار نامۂ راز
دیکھیو اس دفتر معانی کو　　سیکھیو آئین نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا　　سینۂ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری　　کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست　　تین بھیجے، بھیجے وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب　　زر قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت　　اس سے لیویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے　　احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہار ریاض مہر و وفا　　جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں در پئے حصول شرف　　نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصل تحریر　　کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے　　ابتدائے ورق شماری ہے

مخفی نہ ہے کہ یہ اشتہار بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والاشان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا۔

(مآثر غالب صفحات ۷-۸ و ۴۵)

اسعد الاخبار آگرہ —— (۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء)

ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر

جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہوا مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچے کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تاریخ ایسی دلچسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہوگا۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۸۸)

اسعد الاخبار آگرہ ——— (۲ ستمبر ۱۸۵۰ء)

تاریخ عطائے خطاب و خلعت از حضور بادشاہ دہلی بہ جناب اسد اللہ خاں غالب

از روئے اخبارات کے ہر شہر و دیار میں مثل آفتاب روشن و ظاہر ہو چکا ہے کہ شاہ دہلی نے جناب اسد اللہ خاں غالب کو، جو نظم و نثر میں استاد اکمل اور تمام کشور ہند میں لاثانی و بے بدل ہیں حضرت شاہ والا درگاہ نے بکمال اعزاز و اکرام اپنے حضور بلوا کر بہ عطائے خطاب خلعت معزز فرمایا اور کل سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا جناب تفتہ نے ان کے خطاب و خلعت عطا ہونے کی تاریخ لکھی۔

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب ——— خطا باتی کہ ہر ہر لفظ اس روشن تر از اختر
دبیر الملک نجم الدولہ و یک جزو دیگر ہم ——— نظام اول بود، زاں بعد لفظ جنگ بے سرور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید و بر خلعت ——— فزودہ جیغہ و سر پیچ و مالای دُر و گوہر
بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی ——— سخن فہم و سخن گو پرور دو انا و دانشور
پی تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی ——— بہ دریای تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ ہنگامی کہ شد در غوطہ یابش بر زمین قایم ——— بہ گوش تفتہ ہاتف گفت کای زندہ دلی در

بگو گر سال این پیش آمد اقبال می خواہی
یکی ساماں، دوم حشمت، سوم اعزاز، چارم فر

(شاہکار لاہور ص ۳۸ اپریل ۳۵ء)

سراج الاخبار دہلی ——— (یوم سہ شنبہ چہار دہم محرم (مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۵۰ء)

چون بہ نسبت نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب تخلص، ہیچ کس غماز...... سمت لا مذہبی و مذہب امامی وا نمودہ بود، بیتی چند بطور رباعی بکمال متانت و خوش ادائی پیش بندگان قدسی ادا نموده اند از خیلی پسند افتادگی ایمای طبع فرمودند۔

رباعیات نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ

جن کو ہے مجھ سے عداوت گہری ——— کہتے ہیں وہ مجکو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی ——— شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری

ایضاً

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں ——— سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبی نے ان کو اپنا ہمدم ——— ہے ہے نہ کہو کسے برا کہتے ہیں

ایضاً

یاران رسول یعنی اصحاب کبار ——— ہیں گرچہ بہت خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار ——— غالب وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

ایضاً

یاران نبی میں تھی لڑائی کس میں — الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں
وہ صدق وہ عدل وہ حیا وہ علم — بتلاؤ کہ تھی کہ تھی برائی کس میں

ایضاً

یاران نبی سے رکھ تو لاّ باللہ — ہر یک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم ان کے دشمن — لاحول و لا قوۃ الاّ باللہ

(ہماری زبان ۱۵ اپریل ۶۱ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۳۰ مارچ ۱۸۵۱ء)

قصیدہ جو کہ نواب محمد اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب نے مدح بندگانِ حضور والا میں نوروز کے دن پڑھا تھا اس ہفتے میں ہمارے پاس آ گیا تھا۔ سو واسطے تفریح ناظرین اخبار کے درج ہوتا ہے:

خورشید بہ بیت الشرف خویش در آمد — زانسان کہ شہنشاہ بہ اورنگ بر آمد

(نوائے ادب بمبئی۔ اپریل ۵۸ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۱۱ مئی ۱۸۵۱ء)

اس ہفتہ میں ایک غزل جناب نواب اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب کی ہمارے ہاتھ آئی سو درج اخبار ہوئی:

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے — یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

(نسخۂ عرشی حواشی ص ۳۶۳)

دہلی اردو اخبار ——— (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء)

حسب الحکم حضرت سلطانی خلد اللہ ملکہ، جو جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب اور جناب خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق نے بتقریب شادی مرزا جواں بخت بہادر مرشد زادہ آفاق کے کچھ اشعار بسبیل مبارکبادی سہرا اس ہفتے میں حضور سلطانی میں سر دربار گزرانے تھے، مع چند اشعار علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزرانے، واسطے حظ اور کیفیت اپنے ناظرین اہل بصر و بصیرت و ماہرین و واقفین فصاحت و بلاغت کے بموجب ترتیب و دلچسپی ہونے کے ہم درج اخبار کرتے ہیں۔ (نوائے ادب اپریل ۵۸ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۲۸ اگست ۱۸۵۲ء)

اس ہفتے میں جو مشاعرہ مرزا نور الدین بہادر دام اقبالہ المتخلص بہ شاہی نبیرہ جناب مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم نے کیا جو کہ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں غزلہای شاعران کثیر پڑھی گئیں۔ اور شاہ زادہ والا تبار اکثر رونق افروز محفل مشاعرہ تھے۔ ایک غزل جناب مرزای ممدوح یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں بہادر المتخلص بغالب کی، راقم اخبار کے پاس پہنچی، سو درج اخبار ہوئی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۴۷)

دہلی اردو اخبار ——— (۱۳ فروری ۱۸۵۳ء)

ایک مخمس جناب صاحب عالم مرشد زادہ بہادر مرزا نور الدین المتخلص بہ شاہی، جن کے مدائح اخبارات گزشتہ میں لکھے تھے، بتحقیق سنا گیا کہ بلفظ مودہ بندگان حضور والا جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب بحر بیان نے ایک غزل اس ہفتے میں لکھی تھی، اور اس مقصود سے وہ غزل کہوائی

گئی تھی کہ مصرع لگانا جس میں دشوار بلکہ ناممکن ہو۔ صاحب عالم بہادر ممدوح نے ادنیٰ غور و تامل میں، کمال عجلت سے مخمس طیار کر کے پڑھ دیا۔ حضور والا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے پانچ دفعہ اس مخمس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے، اور سب لوگوں کو کمال تعریف و توصیف سے تر زبان پایا۔ جہاں سبحان اللہ سبحان اللہ کے سوا کوئی لب نہ ہلاتا تھا۔

(نسخۂ عرشی حواشی ص ۳۴۸)

دہلی اردو اخبار تتمہ ——— (۲۲ مئی ۱۸۵۳ء)

منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعۂ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے۔ حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے جناب حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر، اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شاہزادگان والاتبار بعد باریابی بجا آوری حسب الحکم قضا توام بشرف نشست سے حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے بارہ بجے تک حضور اقدس جلوہ فرما رہے۔

(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۶۷ - ۳۶۸)

اودھ اخبار لکھنؤ[1] ——— (یکم جنوری ۱۸۶۲ء)

"اشتہار طبع کلیات نظم" جناب میرزا غالب دہلوی۔

اک بشارت نئی سنو ہم سے گوہر آبدار لو ہم سے

ایسا مژدہ سننے میں کسی نے سنا نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں۔ مرحبا کیسے شاہد شیریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو یوسف سر بازار آتا ہے۔ عزیز ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دوچار ہوں گے نقد تمنا سے خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھائیے۔ اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھائیے۔ آویزۂ گوش جہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب میرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دلآرام، رنگین ادا کا شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے، ہر ایک شعر فرد ہے، عالی مضامین قصائد لاجواب، رنگین غزلیں انتخاب کہ انھیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جائیے، نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں، سحر جلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہیے، آبدار قطعات کو بے تمرد قطعات جواہر کہیے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے، ہر بیت شاہد ماہ سیمائے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں، کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جد و جہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں۔ آفتاب کے صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں۔ جواب انوری و خاقانی ہیں۔ ہر نقطہ ان کے قلم کا اختر اوج کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے۔ کس خوش نصیب کی بر امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جز میں چھپے گی۔ بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھینچی گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے ہر ہے کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے ۵ مقرر ہو جائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے۔ چھپنے تو دو ہاتھوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے۔

اشتہار دینے کا یہ سبب ہے۔ صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کا اطمینان مکرر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مد نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طالب گار ہوں کی قیمت کے عہدہ دار ہوں۔ فقط

(ص ۱-۲)

---

[1] اودھ اخبار کے حوالے سے مندرج تحریر درج کرنے کے لیے میں مخبری دوستی امیر حسن نورانی صاحب لطف دائم کا شکر گزار ہوں یہ موصوف ہی کا عطیہ ہیں (اکبر)

اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء)

نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

سب جانتے ہیں کچھ حاجت دلیل نہیں کہ آج ہندوستان میں اُن کا عدیل نہیں، فصاحت و بلاغت میں سبحان ثانی ہیں۔ فن شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطہ کو اختر اوج معانی بنایا۔ روز فکر اُن کا جہاں میں مشہور ہے۔ نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جناب جہانیاں مآب ملکہ معظمہ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ اب تلک عملداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اُس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظر انور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدر دانی ہے۔ کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے جب فیضیاب سماعت ہوا۔ منظور نگاہ مرحمت ہوا۔ جود و نوال کی طرف بہت آئی۔ صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی، ولایت سے ڈاک پر بھیجکر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے عنقریب حظ اٹھاؤ گے۔ بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ سے اُس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوج حوادث نے کل متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بیگناہ یوں زیر آسیائے گردوں پسے۔ جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہوا کہ ہر مقصد بھی ناکام ہوا۔

نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔ ع "جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا"۔ عجب نہیں کہ پرورش سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ عین حالت یاس میں لطف خسروانی سے امید بر آئے۔

اس تقریب میں ایک ذکر اور سنیے کہ ان دنوں جب تعزیت شاہزادۂ عالی پایہ کا عالمگیر تھی دہلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیشگاہ حکام سے مشاہیر شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھدیا۔ نواب صاحب (غالب) نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں مدح سرائے حضرت ملکۂ زمن ہیں، یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کردی:

شاہ عالی گہر و گوہر پاکش صد حیف ۔۔۔ دیگہ ناچار سپرد ند بخاکش صد حیف (ص ۱۸۵)

اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء)

ہندوستان کی سمجھ

افغانستان کا روزنامچہ مدت دراز سے سنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ صحائف اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض سالہا سال گزر گئے سنتے سنتے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے بانڈسو باندھے۔ تو طے اٹھائیے۔ محض اپنے گمان پر سیکڑوں قیاس لگاتے۔ اے بے فکرو، خدا سے ڈرو، ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے۔ جعفر علی وقائع نگار ان انگریزی کو کون لکھا کرتا ہے۔ کیا کریں جب عموماً صحیفوں کو ایسے اخبارات سے ملو پاتے ہیں تو ہم بھی حسب ضرورت کچھ انتخاب کر کے اپنے صحیفے میں چھپوا لیتے ہیں۔

آج کل دانائے روزگار، سرگروہ اولوالابصار، ارسطو فطرت، افلاطون فطنت، جناب والا شان، عالی مناقب، مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جن کی سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے، استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے۔ نالہوں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے مضمون خیالی سے توارد ہوا ایسی تقریر فرمائی۔ ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی پیش کش ناظرین مشتاق ہوا کریں گی۔

نثر

یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں، سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا کج فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ فتنہ فساد سے خوش اور امن و امان

کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں۔ سینکڑوں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ بنگالہ کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اُس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو اتنا سکہ توجہ طرف رفاہ عام کے ہے۔ اُدھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتقام کے ہے۔ بالفرض بمحال اگر اُس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبان عالیشان معدلت نشان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے، جائے انصاف ہے۔ جب سید ولی اللہ حاکموں نے اپنی فوج باغی لشکر اپنے حسن تدبیر و زور بازوئے شمشیر سے زیر کیا ہے، اب جو یہ فوج جرار و لشکر بے شمار ساتھ ہے مخالفوں کا دفع کرنا مشکل کیا ہے۔ ہندو مسلمان جو اہلِ ہند اگلے فتنہ و فساد سے بگڑ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا اور قحط کے دکھ سہے ہیں۔ وہ اپنی سلامت دعوت پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ نیا پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں، اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں، تار بجلی میں پیام کے پہونچنے کی سرعت کو دیکھیں، مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں، حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں، ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلمرو ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے، بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے، وہ احمق ہے وہ ناقدر دان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخشنود ہے، حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی بہبودگی منظور بہر صورت ہے؛ اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اُس شخص کی خوبیٔ قسمت ہے آدمی زحمت خاص کو نہ دیکھے رحمت عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے، امن و اماں کا طالب بخت و قسمت کا شاکی۔ غالب۔ فقط (ص ۲۸۱)

اودھ اخبار لکھنؤ ــــــــــ (۱۴ر مئی ۱۸۶۲ء)

خیال خیر مآلِ رعنا

مکرم خاکسار صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۲۳ر اپریل سنہ رواں صفحہ ۲۸۱ میں عبارت نثر ریختہ، قلم جواہر رقم حضرت استادی جناب والا مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی: ام الفنا الہم کی دربابِ تہدید و تنبیہہ عوام و کج فہماں خود میری نظر سے گزری، جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیاں با افغانان میں خام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں۔"

بہ تبعیت مضمون خیر اندیشی جناب مرشد نا و استاد نا حضرت غالب دام فضلہم بارادہ تنبیہ ابلہان نسبت شہرت جنگ اہل ایران با افغانان اذا نجا کہ تحریر جناب ممدوح کی حق بجانب از عین خیر اندیشی حاکم و محکوم ہے، اس لیے اس کو بہ تتبع نتائج خیر و عافیت عام خیال کر کے اس مطلب مافی الضمیر کو میں حتی الوسع بسیط کرنا سعادت جان کر دوسطے مزید تنبیہ ہر خاص و عام عرض کر کے عارض ہوں کہ آپ بوسیلۂ اندراج اخبار گوہر بار خود بندگان خدا کو اس سے متنبہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمایئے گا

اودھ اخبار لکھنؤ ــــــــــ (۲۴ر ستمبر ۱۸۶۲ء)

جناب صاحب مہتمم اودھ اخبار زاد مجدہم

آپ کے اخبار ۱۷ر ستمبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر الور میں مندرج ہے کہ مہاراجہ الور کے جنگل سے ایک شیر کو ٹٹی میں قید کر کر کئی روز گرسنہ رکھ کے جب وہ شور و شر سے باز رہا پنجرہ آہنی میں گرفتار کر لائے

اے صاحب مہاراجہ صاحب تو والی ملک اور صاحب اقبال ہیں وہ تو شیروں کو اگر چاہیں تو کو سفند سے گرفتار کرا منگا دیں۔ اُن کے رعب عدل سے جب شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں پھر اُن کو شیر کیا حقیقت ہے۔ میں اس پر ایک ذکر تعجب خیز اور فسانہ حیرت انگیز گرفتاری زندہ شیر کا بے سر و سامانی

ہیں ایک مستند شخص کا سنا ہوا ہوں یعنی سنہ ۵۶ء میں محمد مردان علی خان صاحب نے کہ اُس وقت تحصیلدار کوہ مری دارالقرار گورنمنٹ پنجاب کے تھے اور اب ایک سرکار پنجاب میں اہلکار ہیں خود ایک شیر نر یاں جنگل کوہ مری سے زندہ یوں گرفتار کیا تھا کہ پتھروں کا ایک چھوٹا سا صندوق کے طور کا فقط اسی قدر کو کھا بنا کر شیر اس میں سامنے کے اندر شکار لگا دیا تھا۔ ایک شیر مردم خور اسی میں تھا کارا لگا گئی سو آدمی خان صاحب کے ساتھ اس علاقے کے جو تھے ایک یا پاس جانے تک نہ ہوا اور ان شیر دل جرگے نے رستا ذرا محو اور پر میخ کر رستے سے پھنسایا اور پتھر اس کے منہ سے ہٹا کر خود ایک چوبی صندوق میں گرفتار کر کے قید کر لیا۔ اس وقت شیر کا گرج اور شور و غوغا کوسوں تک دیوں کے زہرہ کو آب کرتا تھا اور لطف یہ کہ جس دن شیر لگا اسی دن اس شجاعت خداداد اور جرات سے اس کو گرفتار کیا۔ اور وہ چار ماہ بالا پھر قضا سے مر گیا۔

یہ بات طشت از بام اظہر من الشمس ہے وہ شیر بڑے قد کا تھا۔ خان ممدوح سے صرف شیر کا پکڑ لانا اس لیے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی شجاعت کئی وقت پر ظہور میں آ چکی ہے۔ یعنی جب وہ اٹک کی حدود پر تحصیلدار وغیرہ ہے تو ملک بائی اور ملک آفریدی سے صرف جریدہ جا جا کر ہیبت سے خونی اشتہاری سلیح بہاد پکڑ پکڑ لائے اور ہزار ہا روپیہ سرکار انگریزی سے انعام پایا۔ غدر حال میں بھی بخیر خواہی سرکار وہ سینہ سپر ہے۔ کہ مری کے لنیا دیتا دفساد میں جب کہ دوسری تحصیل میں تھے کوہستان میں جا کر دافع فساد رہے۔ غرض شجاعت اور جرات و دلیری بھی ایک بڑی نعمت خداداد ہے اور جبلی ہے کچھ اختیاری نہیں اور امیر غریب پر بھی منحصر نہیں ہے۔ الغرض خان ممدوح بھی اسم با مسمیٰ ہیں اور حق بجانب مرد کی صفت ہی مردانگی ہے۔ فقط

راقم بندہ اسد اللہ

مفصلائٹ دہلی — (مارچ ۱۸۶۸ء)

CORRESPONDENCE

Our columns are open to all but we do not hold ourselves responsible for any thing that appears in our correspondence-- Ed. Mof.

TO THE EDITOR OF THE MOFUSSILITE.

Dear Sir,

You have, I observe, in your issue of the 30th instt., taken notice of the liable case now under enquiry before the Assistant Commissioner, Delhi, in which Mirza Asadullah Khan alias Mirza Nausha Ghalib, the most celebrated Persian Scholar and the Poet laureate of India, is plaintiff.

The following are some further particulars relating to the same; they will, I hope, be interesting to your readers and expose at the same time the acts of injustice to which people in the Punjab are subject. The small army of Maulavis and Munshis, alluded to in your issue, consists of Lala Piaare Lall, Headmaster Delhi Normal School and secretary Delhi Literary Society; Hakim Latif Hussain, first Oriental Master Delhi Collegiate School, and Maulavi Nasiruddin, first Oriental and Mathematical Master, Delhi Normal School; Hookum Chand, the famous Essayist and Persian scholar of Delhi. Maulavi Ziyauddin, Assistant Professor of Arabic, Delhi College

and several others of less note. The first four gentlemen approved as witnesses on the part of the plaintiff, the rest on that of Defendant. The evidence for prosecution was taken on Monday the 20th instant; of the witnesses for the defence, only one, Maulavi Ziyauddin was examined on Tuesday when a curious instance of partiality was shown him by the court. Some interested party, said to be an "awarda" of the presiding Magistrate, whispered in his ear that Maulave Ziyauddin was the most respectable and learned of all the witnesses, and requested the Magistrate to give him a chair on the dais next to himself, while taking his evidence. This was done, although a practice followed nowhere but in the court of the Assistant Commissioner, Delhi. As far as my knowledge of law and the practice of Indian courts, is, no witness ever so respectable, can be allowed to remain seated while giving his deposition. "Nek Hairanam vo sakht parishan." What rule does the Assistant Commissioner observe in that respect? The witness, to whom injustice and a gratitous insult has been offered by this concession to Maulavi Ziyauddin, holds a very respectable position in society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieutenant Governer of the Punjab and took precedence of the gentlemen to whom such marked favour has been shown; and although not a very good Persian Scholar, he is in every other respect deserving of greater consideration.

I refrain at present giving you the evidence so far as it has been recorded, since the case will be resumed on Monday next. As soon as the evidence is concluded and judgement delivered, I will furnish you with the whole missul for publication.

In conclusion I would suggest that the opinion of Major Lees or any other European Orientalist be taken as to the proper interpretation of the defamatory passages printed and published in the work entitled the "Qateh-ul-Qateh." (Sic.)

Yours truly,

March, 1868 **IXION**

اکمل الاخبار دہلی —— (۶ مئی ۱۸۶۸ء)

ناظرین والا تمکین نیز شاگردان رشید حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ نیاز ولا حضرت ممدوح کی تصویریں فوٹوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کرائی ہیں۔ پس جس صاحب کو یہ شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپیے کے ٹکٹ بلف عنایت نامہ بنام لالہ پیاری لال کے نام اکمل المطابع دہلی میں بھیجدیں۔ صفحہ بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ہوگی۔

(ماہنامہ آج کل ستمبر ۶۰ء ص ۲۹)

اکمل الاخبار دہلی

(۲ر ستمبر ۱۸۶۸ء)

تہنیت

بفضل الٰہی ۲۶ر ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ روز یکشنبہ گھنٹہ بھر دن رہے۔ جناب معلی القاب نواب میر ابراہیم علی خاں صاحب بہادر رئیس اعظم سورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک روشن ستارہ چمکا حق سبحانہٗ تعالیٰ اس ماہ رخشندہ اور اختر تابندہ کو اوج عزت اقبال پر تا طلوع کنتاب قیامت پر نور ضیا گستر رکھے۔......

جناب مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعہ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بشرط بہ پد فہمید۔ اس کا لطف اٹھائیں گے، ارشاد فرمایا ہے ہم بہ افزائش رونق اخبار وہ رباعی اور قطعہ لکھتے ہیں۔

رباعی

حق داد بہ سید ازپی اغماش　　فرخ پسری کہ داجبست اکرامش

تاریخ ولادتش لود بے کم و بیش　　ارشاد حسین خاں کہ باشد نامش

قطعہ

۱۲　۸۵

غالب حال سنین ہجری　　معلوم کن از خجستہ فرزند

چوں یکصد و بست و چار ماند　　انیست شمار عمر دلبند

غور کی جائے کہ جب خجستہ فرزند سے ۱۲۸۵ عدد لیے جائیں تو ایک سو چوبیس باقی رہتے ہیں۔ اس کو بطریق دعا مولود کی عمر قرار دی ہے۔"

(ماہ نو جولائی سنہ ۱۹۵۲ء)

اکمل الاخبار دہلی

(۲۸ر اکتوبر ۱۸۶۸ء)

اسد اللہ بے گناہ جس کا تخلص غالب اور خود اہل ہند کا مغلوب ہے۔ مہتمان اخبار بلاد ہند سے عموماً عرض کرتا ہے کہ یہ فقیر کا استغاثہ از روئے اکمل الاخبار اپنے صحائف میں درج فرما کر مجھکو اپنا ممنون فرمائیں۔"

استغاثہ غالب

"کئی ہفتے پہلے ایک خط لکھنؤ سے بسبیل ڈاک انگریزی بعینہٖ بیرنگ میرے نام آیا راقم عبد اللہ رئیس و معافیدار — یہ نہیں ہر قوم کہ رئیس و معافیدار کہاں کا — بہر حال محصول دے کر میں نے خط کو لیا اور پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ تو نماز نہیں پڑھا کرتا۔ خبردار نماز پڑھا کر اور اگر نماز نہ پڑھا کرے گا تو بعد مرنے کے بھوت بن جائے گا۔ کل پنجشنبہ کے دن ایک اور خط بیرنگ آیا۔ سرنامہ پر یہ عبارت مرقوم "انشاء اللہ لفافہ ہذا بمقام در شہر دہلی رسیدہ بملاحظہ اقدس جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب مشرف باد مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بیرنگ تاریخ ۲ر رجب ۱۲۸۵ ہجری روانہ شد" مضمون بعینہٖ یہی کہ نماز پڑھا کر ورنہ بعد مرنے کے بھوت ہو جاؤ گے والسلام علیک نام ندارد فقط مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بسرکار خود تمام ہوا۔ اب فقیر مکتوب الیہ کہتا ہے کہ پہلے خط میں میں نے عبد اللہ کو اسم فرضی سمجھ لیا تھا مگر اب جب دوسرے خط میں اس توضیح سے کاتب کا اسم و مقام لکھا ہوا ہے کیونکر شک و شبہ باقی رہے۔ پس اب میں تجرد و یش بجان درویش کے مفہوم پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں مگر یہ حافظ کا شعر جواب میں لکھتا ہوں ۔

من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش　　ہر کسی آں درود عاقبت کار کہ کشت

یہ دوسرے شخص صاحب نام و نشان ہیں۔ اخبار میں دیکھ کر سمجھ لیں گے، شاید وہ پہلے صاحب بھی کسی اخبار میں مشاہدہ فرمائیں۔"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اکمل الاخبار دہلی — (۱۴ اپریل ۱۸۶۹ء)

"اشتہار کتاب اردوئے معلّٰی"

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی + گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

فرزندگان والا منظر و شائقان پاک گہر مژدہ ہو کہ ناظورہ معانی نے جلوہ دکھایا، شاہد سخن نے نقاب چہرے سے اٹھایا، گلستان فصاحت نے خرمی و نضارت پائی، چمنستان بلاغت میں بہار آئی یعنی حصّہ اول نسخۂ دلپذیر و کتاب بے نظیر "اردوئے معلّٰی" منشات زبدۃ الفصحا عمدۃ البلغا نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر مرحوم غالب کہ جس کا ہر ورق حدیقۂ نکتہ پروری و ہر صفحہ ریاض بذلہ گستری ہے اکمل المطابع دہلی میں بہ تصحیح و تنقیح احقر العباد چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ یہ کتاب خصوصاً واسطے طلبا، مدارس کے ایک عمدہ دستور العمل زبان دانی اور عموماً برشائقین و محققین زبان اردو کے سرمایہ فصاحت و طلاقت، لسانی ہے مضامین بلیغ اور روانی عبارت سے خود ایک معلم بے بدل اور استاد کامل ہے۔ غرضکہ بہتر اس سے زبان اردو میں کوئی کتاب ہاتھ نہ آوے گی۔

بنا بر علیہ اس شہر میں ہاتھوں ہاتھ اکثر متاع روئے دست خریداران خرد مند ہو گئی۔ باایں ہمہ ندرت قیمت اس کی زیادہ قرار نہیں دی گئی۔ حجم اس کا ۲۹ جز ہے اور کاغذ ۲۰ ۲۶ پر بہت خوشخط منطبع ہوئی ہے پس جن صاحب کو اس صحیفۂ دانش و آگہی کی خریداری منظور ہو دو روپیہ بابت قیمت کتاب اور سہ محصول ڈاک کے ارسال فرما کر طلب فرمائیں۔

"المشتہر سید فخر الدین مہتمم اکمل الاخبار دہلی"

"محبان کرم گستر یعنی وقائع نگاران ہم عصر سے امید ہے کہ براہ عنایت اشتہار مرقومہ بالا کو اپنے اخبار گوہر بار میں درج فرما دیں۔"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اخبار عالم میرٹھ — (۲۲ اپریل ۱۸۶۹ء)

عود ہندی

یہ کتاب لطافت مآب بزبان اردو نثر جس میں اکثر خطوط اور مضامین مختلف نظم و دیباچہ کتاب لکھے ہیں نواب اسد اللہ خانصاحب غالب مرحوم کے نتائج فکر سے ہے، جس کا مطالعہ واسطے صفائی اور درستی زبان اردو کے مفید اور کار آمد ہے۔ مطبع مجتبائی واقع میرٹھ میں صاف اور خوشخط ...... ۱۸۸ صفحے کی ...... چھپی ہے قیمت اس کی ایک روپیہ اور محصول ڈاک تین آنے ہیں۔ (اردوئے معلی غالب نمبر جلد دوم)

"روح افزا — گرمیوں کا ایک فرحت بخش مزے دار ٹانک، جو ہر عمر کے اشخاص کے لیے مفید اور پسندیدہ ہے۔ اس میں جڑی بوٹیوں، ہری ترکاریوں اور پھلوں کا ایکسٹریکٹ اور دس فی صد سنترہ اور انناس شامل ہے۔

ہمدرد

دہلی، کانپور، پٹنہ

روح افزا

مطبوعات موصولہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کچھ پرانے خط: جواہر لال نہرو کے نام لکھے ہوئے مشاہیر سیاست و ادب کے خطوط کا ایک انتخاب سنہ ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا تھا جس میں سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک کے خطوط شامل تھے۔ یہ مجموعہ انگریزی میں ہے اور اسے خود پنڈت جی نے مرتب کیا ہے۔ ان خطوط میں سے بیشتر خط مرتب ہی کے نام ہیں، مگر کہیں کہیں استثنا بھی برتا گیا ہے یعنی کچھ خطوط موتی لال نہرو کے نام، اور کچھ موتی لال کے دوسروں کے نام بھی شریک ہیں، اسی طرح مرتب نے چند اپنے خطوط بھی شامل کر لیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی شمولیت دوسرے خطوط کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوگی۔

یہ مجموعہ نہ صرف اس لیے اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کے خط شامل ہیں، بلکہ اس اہمیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ خود ان کے مکتوب الیہ کی شخصیت جدوجہد آزادی کے رہنماؤں میں نمایاں ترین حیثیت کی ہے۔ نیز اس مجموعے کی قدر و قیمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ خطوط جس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی پیچ و پیچ سیاست کو اتنی سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کوئی اور مواد پیش نہیں کر سکتا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی نے اپنی روایات کے مطابق یہ تحفہ اردو ترجمے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور ہر حصے کی قیمت ۸ روپے ہے۔ جو کتاب کی باطنی خوبیوں کے علاوہ سفید لفظیں کاغذ صاف ستھری طباعت اور مجلد ہونے کی وجہ سے بہت معقول ہے۔

اس کے مترجم مولانا عبد المجید حریری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بہت رواں اور شستہ اردو میں خطوں کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا کہ آخر میں انڈکس بھی ہوتا تاکہ اسے حوالے کے طور پر استعمال کرنے والوں کو مطالب کی تلاش میں دشواری پیش نہ آتی۔

اردو ڈائجسٹ لاہور: اردو میں یوں تو کئی ادبی ڈائجسٹ شایع ہوتے ہیں اور سب دل چسپ اور کامیاب ہیں مگر خالص معلوماتی نقطۂ نظر سے ایک ڈائجسٹ کی کمی بہر بار محسوس ہوتی رہی ہے۔ اس قسم کا رسالہ مرتب کرنا جس لگن محنت اور سلیقہ مندی کا مطالبہ کرتا ہے وہ بجائے خود حوصلہ شکن ہے لیکن اب لاہور سے چند نوجوانوں نے ریڈرز ڈائجسٹ کو نمونہ بنا کر اردو ڈائجسٹ جاری کیا ہے۔ اس رسالے کی کامیابی کا یہی ایک ثبوت کیا کم ہے کہ دو سال کے مختصر وقفے میں اس کے عام شماروں کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ گزشتہ دسمبر میں اردو ڈائجسٹ نے اپنی دوسری سالگرہ پر ایک خاص نمبر شایع کیا تھا جو خاصا متنوع اور دلچسپ رہا۔ ہماری طرف سے اس ماہنامے کے مطالعے کی پر زور سفارش کی جاتی ہے اس لیے کہ اردو رسائل میں حسن صورت و سیرت دونوں کم نظر آتے ہیں اور یہ اردو ڈائجسٹ ان گنتی کے رسائل میں ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔

بچوں کے لیے نظمیں: ننھے منوں کے لیے جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں جناب شفیع الدین نیر کا نام بہت ممتاز ہے۔ نیر صاحب نے بچوں ہی کی ہلکی پھلکی زبان میں شاعری کی ہے اور موضوعات کے انتخاب میں بھی بچوں کی نرم و نازک طبیعت اور معصومانہ دلچسپیوں کو سامنے رکھا ہے۔ وہ بچوں کو جو کچھ دیتے ہیں اس میں بچپن کی شوخیاں سمٹ آئی ہیں یہی وجہ ہے کہ نیر صاحب بچوں کے مقبول اور محبوب شاعر ہیں اس وقت ہمارے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کے نام یہ ہیں:

ہماری نعت۔ وطنی نظمیں۔ منی کا تحفہ اور بچوں کا کھلونا۔

ہر ایسے گھر میں جہاں بچے ہوں ان کتابوں کو بھی ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کتابوں میں وقتی تفریح ہی نہیں اصلاح اخلاق و عمل کا مقصد بھی کارفرما ہے۔

ملنے کا پتہ: نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی

نذرِ وطن: ہندوستان کی قومی تحریکات میں اردو ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ جنگ آزادی کا سب سے اہم نعرہ "انقلاب زندہ باد" اردو ہی کی دین ہے جس نے مخالف طاقتوں کے قدم اکھاڑ دیئے اور آج بھی جوش و ولولے کا عظیم نشان ہے۔ چین کی حالیہ جارحانہ یورش نے ہر جذبۂ وطنی کو متاثر کیا۔ اس ہنگامی موضوع پر کہی گئی اردو نظموں کا ایک مجموعہ مرتبہ دور آفریدی علوی بک ڈپو بمبئی نے شایع کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرتب نے ہر جا بجا کے ذخیرہ کر ساری اہم نظمیں شریک کر لی ہیں۔ ضرورت تھی کہ انتخاب کچھ اور سختی برتی جاتی تاکہ بعض کمزور نظمیں درج نہ ہو پاتیں۔ پھر بھی اہم اور ایسی کتابوں کو خریدنا چاہیے اس طرح قومی خیالات کی ترویج و ترقی ہوتی ہے جو کسی بھی ملک کی ترقی اور اس کی مضبوطی کی ضمانت ہے۔

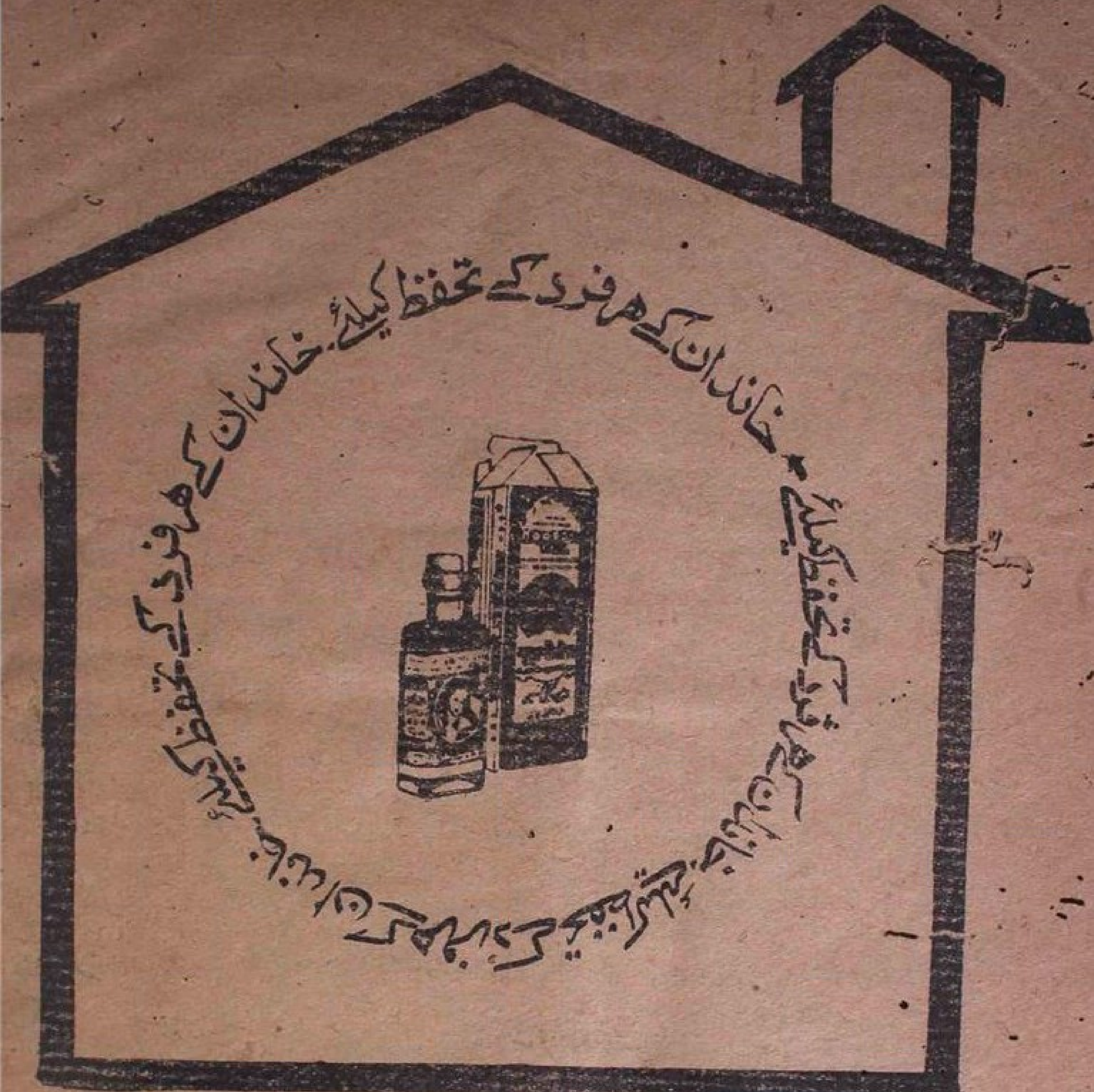

نورانی تیل

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے، اور درد، چوٹ، زخم، ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے۔

ساختہ: انڈینا کیمیکل کمپنی، مئو ناتھ بھنجن یوپی

[illegible] پرنٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار [illegible] رام پور یوپی سے شائع کیا۔